بھٹو سے بھٹو تک

نفیس صدیقی

بھٹو سے بھٹو تک

نفیس صدیقی

جنگ پبلشرز

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ
ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے
خوبصورت اور معیاری مطبوعات

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اوّل	اکتوبر ۱۹۹۰ء
تعداد	۲۰۰۰
اشاعت دوم	مارچ ۱۹۹۱ء
تعداد	۱۰۰۰
قیمت (پیپر بیک)	۱۰۰ روپے
بیرونِ ملک قیمت	۹ امریکی ڈالرز
سرورق	ارشاد زیدی
پروڈکشن انچارج	گوہر سلطانہ عظمیٰ
اہتمام	مظفر محمد علی
ناشر	جنگ پبلشرز۔ لاہور
مطبع	جنگ پبلشرز پریس ۱۳۔ سر آغا خان روڈ۔ لاہور

انتساب

محترمہ بینظیر بھٹو

اور

ملک معراج خالد

کے نام

www.bhutto.org

چند ضروری وضاحتیں

○ جناب نفیس صدیقی کا یہ مسودہ ہمیں اکتوبر کے اوائل میں ملا اور خیال تھا کہ یہ کتاب 24 اکتوبر کے انتخابات سے پہلے شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہوگی مگر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ سو اس کتاب کو انتخابات سے پہلے کے تناظر میں پڑھا جائے۔

○ "بھٹو سے بھٹو تک" بظاہر ایک عام سا عنوان ہے اور لگ بھگ اسی عنوان سے ایک آدھ کتاب پہلے سے چھپ بھی چکی ہے مگر یہ کتاب پڑھنے کے بعد میری طرح آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ صرف اور صرف یہی عنوان اس کتاب کا حق تھا۔ سونے پر سہاگہ ارشاد زیدی کا سرورق ہے جس نے کتاب کو صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے نیا رنگ دے دیا ہے۔

○ "بھٹو سے بھٹو تک" ایک شخص ایک عہد کا گہرا تجزیاتی مطالعہ ہے عہد جو ماضی اور حال سے سفر کرتا ہوا پاکستان کے مستقبل میں بھی زندہ جاوید نظر آرہا ہے۔

○ اس کتاب کا دیباچہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی "توسیع اور تسلسل" محترمہ بینظیر بھٹو نے لکھا ہے۔ تاخیر سے موصول ہونے کے باعث دیباچے کے صفحات الگ سے چھاپ کر کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔

○ مجھے امید ہے کہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک انتہائی نمایاں پہلو پر لکھی گئی اس کتاب کو سیاسیات سے رغبت رکھنے والے ہر طرز فکر کے قارئین پوری سنجیدگی سے پڑھیں گے اور اپنی بے لاگ رائے سے براہ راست جناب نفیس صدیقی یا جنگ پبلشرز کو مستفید کریں گے۔

مظفر محمد علی
(انچارج جنگ پبلشرز)

www.bhutto.org

فہرست

پیش لفظ	محترمہ بے نظیر بھٹو	
دیباچہ	نفیس صدیقی	صفحہ نمبر
1۔ وزارت سے عوام تک		13
2۔ نظریاتی بنیادیں		27
3۔ لیڈر بھی ہیرو بھی		85
4۔ بھٹو کے تصوراتی افق		101
5۔ اقتصادی پالیسیاں		117
6۔ بھٹو اور تیسری دنیا		133
7۔ سوئے دار چلے		137
8۔ بے نظیر بھٹو کو ورثہ میں کیا ملا؟		163
9۔ انحراف یا تسلسل		171
10۔ آخری باب		181

www.bhutto.org

www.bhutto.org

پیش لفظ

○

عوامی رہنماؤں کو اس ملک کے خواص کیوں ناپسند کرتے ہیں۔

اس سوال کا جواب شہید ذوالفقار علی بھٹو نے پھانسی کی کوٹھڑی سے مجھے خط لکھتے ہوئے دیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ "مفاد پرست ٹولہ مجھے اس لئے ناپسند کرتا ہے کیونکہ میں پاکستان کا پہلا اور واحد رہنما ہوں جس نے ان کی اجارہ داری کا آہنی حصار توڑا ہے اور عوام سے براہِ راست رابطہ کیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کی تقلید کروں۔ میں نے انکار کر دیا"۔

شہید نے کہا تھا کہ جس طرح انہوں نے اسلام کا نام لے کر اسلام کو دھوکہ دیا ہے اسی طرح احتساب کے نام پر وہ احتساب سے بچے ہیں۔ وہ پاکستان پر اپنا ذاتی غلبہ چاہتے ہیں۔ شہید بھٹو کا پیغام یہ تھا کہ عوام کی خدمت کا مخلصانہ راستہ اپنے ذاتی مفادات اور استحصال کا خاتمہ ہے۔ یہی ہماری اس جدوجہد کا نصب العین بھی ہے جو اس قوم کے مجبور اور مقہور عوام کی نجات کیلئے ہم نے مسلسل جاری رکھی ہے۔

جبر کو خاموشی سے برداشت کرنے والے عوام سے بار بار غداری کی گئی ہے۔ شہید بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی نے مظلوم عوام کو انقلاب کی نوید دی۔ تبدیلی کی بشارت دی اور عملی طور پر پاکستان کے سماجی' اقتصادی اور سیاسی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں متعارف کیں۔ ان عظیم تبدیلیوں نے استحصال زدہ عوام کو حوصلہ دیا لیکن رجعت پسندوں' مفاد پرستوں نے' استحصالی طبقوں نے ابتداء سے ہی اس انقلاب کا راستہ روکا اور آج بھی ساری استحصالی قوتیں اسی مزاحمت میں مصروف ہیں۔ ہم اپنی تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو یہ شہادت قدم قدم ملتی ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی پیش قدمی جمہوریت کی طرف رہی ہے۔ اس کی عوامی سیاست انقلابی رہی ہے اور اس کی جدوجہد مشکلات سے بھرپور رہی ہے۔ عوام کی خواہشات کی راہیں مسدود کی گئیں۔ عوام کی امنگوں کو پژمردہ کرنے کیلئے ان طبقوں نے سازشیں کیں۔ منصوبے تراشے' گٹھ جوڑ کئے' چالیں چلیں' حکمتِ عملیاں وضع کیں۔ 1970ء میں قوم نے یہ تماشا دیکھا' 1977ء میں جمہوریت کی پیش قدمی انہی سازشوں اور غداریوں سے رک گئی۔ 1988ء میں یہی سازشیں بے نقاب ہوئیں' پھر ہم نے دیکھا کہ اگست 1990ء میں عوام کے فیصلے پر دن دہاڑے ڈاکہ مارا گیا۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو نے چار پائیدار اور مضبوط ستونوں پر پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔

1 - اسلام ہمارا دین ہے۔

2 - جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

3 - سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

4 - طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

www.bhutto.org

انہوں نے اس کے ساتھ ہی ایک واضح اور کھلا پیغام بھی دیا تھا۔ اسلام کو پارٹی پروگرام کی روح اور خاصے پر سبقت دیتے ہوئے ہم نے یہ واضح کیا تھا کہ چونکہ تمام تجاویز کا منبع ایمان کے اصول اور روح ہیں۔ اس لئے پارٹی اسلام اور قرآن کے منافی کوئی قانون جاری نہیں رہنے دے گی۔ ہم نے یہ نشاندہی کی تھی کہ عوام میں ایک محرومی کا احساس پایا جاتا ہے کیونکہ عوام کی بہبود اور فلاح کو فراموش کیا گیا ہے۔ ہم نے محسوس کیا تھا کہ عوام ایک ایسے غیر متنازعہ معاشی نظام میں سانس لینے پر مجبور ہیں' جس نے مفاد پرست سیاسی گروپ اور اقتصادی اجارہ داریاں پیدا کر دی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قوم کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ اساسی طور پر سیاسی اور اقتصادی ہیں۔ مذہبی نہیں ہیں' کیونکہ استحصال کرنے والے اور جن کا استحصال ہو رہا ہے دونوں ایک ہی عقیدہ رکھتے ہیں' دونوں مسلمان ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے ابتداء سے ہی یہ عزم کیا کہ وہ ایسی سیاسی اور اقتصادی حالات پیدا کرے گی جس سے عوام کی تقسیم اور طبقہ بندی ختم ہو۔

ماضی کے بھیانک غلط اقدامات سے' کھلی لوٹ کھسوٹ پر مبنی اقتصادی نظام کے باعث' چند ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز سے' بڑے تاجروں' بڑے زمینداروں' سول اور ملٹری کے اعلیٰ حلقوں کے درمیان اقتدار طاقتوں اور دولت کے وسائل کے اشتراک سے ملک کو منظم انداز میں تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے شہریوں میں حقیقی برابری' اسلام کے سماجی' اخلاقی اور اقتصادی اصولوں پر مبنی جمہوری نظام میں مساوات پر ایمان رکھتے ہوئے عوام کو بیدار کیا اور انہوں نے ایک ایسا مساوات پر مبنی نظام تعمیر کرنا شروع کیا جس سے ان لوگوں کے مفادات خطرے میں پڑ گئے جو عوام کو ہمیشہ اپنی غلامی میں رکھنا چاہتے تھے۔ شہید بھٹو نے مارچ 1977ء میں کتنی سچی بات کی تھی۔ "اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی سب سے اہم اور بڑی کامیابی کیا رہی ہے تو میرے خیال میں یہ عوام کی سوچ میں ایک انقلاب اور ان کے نقطہ نظر میں ایک ٹھوس تبدیلی ہے" شہید نے کہا تھا کہ یہ وہ انقلاب ہے جسے بہت سے لوگ محسوس کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ جیسے مختلف لوگ ہیں ان کی ذہنیت مختلف ہے۔ انہوں نے اپنی زنجیریں موڑ دی ہیں۔ انہوں نے اپنے گلوں سے وہ طوق اتار دیئے ہیں جو انہوں نے صدیوں سے پہن رکھے تھے۔"

یقیناً یہ وہ عظیم میراث ہے جس پر پاکستان پیپلز پارٹی فخر کر سکتی ہے۔ جس سے پاکستان کے ان مظلوم اور مجبور عوام کی فتح کی بشارت ملتی ہے۔ وہی مظلوم اور مجبور عوام جو پاکستان پیپلز پارٹی کی قوت ہیں۔ یہی وہ احساس ہے جو "جئے بھٹو" کے نعرے کی بازگشت میں گونجتا ہے۔ جو "ہر اس گھر اور ہر اس چھت میں گونجتا ہے جو بارش میں ٹپکتی ہے" یہی وہ صدا ہے جو اس دھرتی کا پسینہ اور اندوہ ہے' جس کا عوام سے ایک دائمی بندھن ہے جو فوجیں بھی نہیں توڑ سکیں۔

شہید بھٹو نے ہمیشہ یہ زور دیا تھا کہ سیاسی قوت عوام کے ہاتھوں میں رہنی چاہئے۔ انہوں نے متنبہ کیا تھا کہ عوامی سیاست کے بغیر ملک عمودی اور افقی طور پر تقسیم ہو جائے گا۔ انہوں نے خطرے کا احساس

www.bhutto.org

دلایا تھا کہ اگر مجھے پھانسی کے تختے پر قتل کر دیا گیا' بہت سے اہم سوال اپنے سر اٹھائیں گے اور جب تک ان کا جواب نہیں ملے گا' ملک میں بحران' کشیدگی' تباہی اور تصادم جاری رہے گا۔ انہوں نے خبردار کیا تھا کہ عوام کی آواز دبا کر قوم کو محبت اور یکجہتی کے نصب العین سے ہٹایا جا رہا ہے۔ جس سے دہشت گردی جنم لے گی۔ جس سے پاکستان کا استحکام خطرے میں پڑے گا اور ہمیں کانٹوں کی فصل کاٹنا پڑے گی۔ افسوس ہے کہ مفاد پرست عناصر نے اپنی بقاء کے جنون میں مجبور عوام کے خلاف اپنا ہر ہتھیار استعمال کیا ہے گذشتہ 20 ماہ میں عوام کی منتخب حکومت کے خلاف جبر و استبداد کی قوتوں نے جس طرح سازش در سازش کا سلسلہ جاری رکھا اور غریب اور مقہور عوام کے خلاف جس طرح مکاری اور عیاری سے منصوبوں کے جال پھیلائے وہ ہماری تاریخ کا ایک الم ناک باب ہے۔ انسانی حقوق کی بحالی' آزادیء صحافت' آزادیٔ اجتماع' آزادیء نقل و حرکت کیلئے ہماری کوششوں کی مسلسل مزاحمت کی گئی۔ ملک کی از سر نو تعمیر اور درمیانی خلیجیں پاٹنے کی تمام کوششیں مسدود کی گئیں۔ ہمارے اقتصادی پروگرام کو سبوتاژ کیا گیا۔ پاکستان کو ایک ایشیائی ٹائیگر بنانے کیلئے ہم جو صنعتی اور زرعی انقلاب لانا چاہتے تھے اس کی مخالفت کی گئی۔ امن بحال کرنے کی ہماری کوششیں پاکستان پر عوام کا اعتماد بحال کرنے کی ہماری مساعی کے خلاف سازشیں کی گئیں۔ 6 اگست 1990ء کو یہ سازشیں اپنے کمال پر پہنچ گئیں۔ جب پورے وفاقی نظام کو زمین بوس کر دیا گیا ملک کو ذلت سے اور عوام کو شکست سے دو چار کر دیا گیا۔ انہی نفرتوں کے زور پر ان بدی کی قوتوں نے ملک میں جمہوریت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کیلئے پھر بحران پیدا کر دیا ہے۔

لیکن عوام کو فتح یاب ہونا چاہئے۔ جمہوریت کو مستحکم ہونا چاہئے اور اگر یہ اصول عوام کی نظر میں محترم قرار پاتے ہیں تو پھر ان لوگوں کو اس دائرے سے باہر رکھا جائے جنھوں نے جمہوریت کو تباہ کیا اگر عوام کو بالادست رہنا ہے تو ان لوگوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے جنھوں نے ان کے حقوق سبوتاژ کئے اور جمہوریت کی بیخ کنی کی۔ ہاں یہ آزمائش کڑی ہے چیلنج بہت بڑا ہے لیکن روشنی واضح ہے' راہ سیدھی ہے کیونکہ ہم عوام پر یقین رکھتے ہیں اور عوام کو پاکستان پیپلز پارٹی پر یقین ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی جمہوریت کی طرف گامزن ہے' عوام کی نجات کیلئے اس کی جدوجہد عوام کی جدوجہد رہی ہے جس سے عوام حرکت میں آ گئے جس سے ان کی سوچ میں واضح تبدیلی آئی۔ یہ ایک طویل جدوجہد تھی اور ہے۔ کبھی بہت پُرخار کبھی بہت دشوار۔ ہم میں سے کتنے اس جدوجہد میں جاں سے گذر گئے۔ کتنے ہی تھے جنھیں قید تنہائی میں رکھا گیا' کتنے زندانوں کی نذر ہوئے' کتنے نفرت کا شکار ہوئے۔

نفیس صدیقی ان پاکستانیوں میں سے ہیں جو جمہوریت کیلئے اس جدوجہد میں شامل رہنے پر فخر کر سکتے ہیں' انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کے مؤقف پر نفیس صدیقی کو شہر بدر ہونا پڑا۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ نفیس صدیقی نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی' تاکہ جمہوریت کی بحالی کیلئے جدوجہد کر سکیں۔ اپنے کالموں سے' تحریروں سے اپنی عملی جدوجہد سے انہوں نے اس مؤقف کو آگے بڑھایا۔ پارٹی کے صوبائی سیکرٹری اطلاعات کے عہدے پر ہوتے ہوئے ان کی یہ تصنیف پارٹی کے

www.bhutto.org

فلسفے اور جدوجہد کی ایک مضبوط کہانی ہے۔ یہ پی پی پی کے 20 سالہ دور کی اہم کارناموں کی تفصیل ہے اور اس روشنی کی کہانی ہے جو شہید ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کی تعمیرِ نو کے معمار کی حیثیت سے استحصال کے اندھیروں میں پھیلائی۔ یہ مشعل جو محترمہ بے نظیر بھٹو کو منتقل ہو گئی ہے اب بھی روشن ہے' جدوجہد جاری ہے' پیغام واضح ہے' فتح عوام کی ہونی چاہئے۔

بے نظیر بھٹو
چیئرپرسن پاکستان پیپلز پارٹی

www.bhutto.org

دیباچہ

میں پاکستان پیپلز پارٹی میں نووارد ہوں مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا ہر کارکن خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا میرے لئے قابلِ احترام ہے کہ اس نے ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی بیٹی کے پرچم کے سائے تلے انسانی حقوق اور تحریکِ بحالیٔ جمہوریت کی عظیم جدوجہد میں حصہ لیا۔ میرے نزدیک پاکستان پیپلز پارٹی ہمارے رسم و رواج کے مطابق بننے والی کوئی روایتی سیاسی پارٹی نہیں ہے۔ یہ ایک تحریک ہے۔ پاکستان کو سماجی' معاشی' سیاسی' روحانی اور انتظامی جبر کی حالت سے نکال کر انسانی آزادیوں اور مسرتوں کے نئے دور میں داخل کرنے کی تحریک ہے۔ یہ ایک فکر ہے' ایک فلسفہ ہے' ایک کلچر ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ میں اس جماعت میں نیا ہوں' میں نے اپنی مختصر سی زندگی (جو آپ کیلئے مختصر ہوگی مگر میرے شب و روز کے ستائیس (27) برس صرف ہو گئے) میں نے عوامی حقوق کی جدوجہد میں اس وقت شرکت کر لی تھی جب میں کالج کا طالبعلم تھا۔ میں ہمیشہ قافلۂ جمہور کے ساتھ تھا میں نے ہمیشہ انسانی حقوق اور آزادیوں کی جدوجہد میں مقدور بھر حصہ لیا اور اس جدوجہد کے دوران مجھے شہر بدری سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ مجھے اپنے بچوں اور عزیزوں سے جدائی کے کٹھن اور عذاب ناک لمحوں سے بھی گذرنا پڑا لیکن مجھے اپنے اس ماضی پر فخر ہے۔ میں نے ان واقعات کا حوالہ اس لئے نہیں دیا کہ میں آپ سے کسی ہمدردی کا طلب گار ہوں۔ میں تو اپنے اس ماضی پر فخر کرتا ہوں اور اگر میں کسی چیز کا طلبگار ہوں تو وہ عزت ہے جس کیلئے کوئی سیاسی کارکن اپنی جان تک پر کھیل سکتا ہے۔

www.bhutto.org

میری جدوجُہد کا یہ طویل سفر میری ذاتی کہانی بھی ہے اور پاکستان کے مظلوم' بے بس اور دکھی عوام کی کہانی بھی' جو اس خطے کے عظیم ترین لوگ ہیں' جو اس خطے کے انتہائی باصلاحیت لوگ ہیں جن کا ماضی انتہائی شاندار ہے اور جن کا مستقبل بھی روشن اور تابناک ہے اور وہ اس تابناک اور روشن مستقبل کیلئے گذشتہ چالیس (40) برسوں سے مسلسل جِدوجُہد کر رہے ہیں۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اپنے سیاسی ماضی میں' میں نے کبھی اپنے دامن پر اربابِ اقتدار کی کاسہ لیسی کا داغ لگنے نہیں دیا۔ میں نے کبھی کوئی جماعت اس لئے نہیں بدلی کہ وہ اقتدار میں نہیں تھی اور مجھے برسرِاقتدار جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ میں نے ہمیشہ جدوجہد اور عوامی قافلے میں شرکت کو اہمیت دی ہے میں اگر کسی پارٹی کو چھوڑ کر دوسری طرف گیا ہوں تو میرا مقصد صرف ایک تھا کہ جدوجہد اور قربانیوں کے راستے پر چل کر اور بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ سکوں۔ میں نے ہمیشہ کم جدوجہد کا راستہ چھوڑ کر زیادہ جدوجہد کا راستہ اپنایا' چھوٹی جدوجہد کا راستہ چھوڑ کر بڑی جدوجہد کا راستہ اپنایا اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی میں کسی ایک پارٹی سے نکل کر کسی دوسری پارٹی میں گیا ہوں تو آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ میں اور زیادہ مشکلوں اور زیادہ مسائل کا شکار ہونے گیا ہوں اور یہ شوق مجھے ہمیشہ سے رہا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی میں شرکت بھی میں نے کسی اقتدار کی خاطر نہیں کی تھی جب میں اس پارٹی میں شامل ہوا اس وقت پاکستانی تاریخ کا بدترین آمر جنرل ضیاء زندہ تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ سفر جس میں شرکت کرنے جا رہا ہوں اور عوام کا یہ عظیم قافلہ جس کی پچھلی صفوں میں گرد و کارواں بن کر ساتھ چلنے کا فیصلہ میں کر رہا ہوں اسے کتنے مہینے' کتنے برس' کتنی صدیاں اسی طرح کٹھن اور دشوار گزار راہوں پر چلنا ہو گا۔ میں تو ایک چھوٹے سے قافلے سے نکل کر ایک بڑے قافلے میں داخل ہو گیا تھا اور دوسری بات جو میری پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کا سبب بنی وہ یہ تھی کہ میں نے اپنی سیاسی زندگی میں جس مقصد اور جس نصب العین کے تحت جدوجہد کی ہے' محترمہ بے نظیر بھٹو کی پیپلز پارٹی انہی مقاصد کے تحت کام کر رہی تھی۔ میں تاریخ کا ایک ادنیٰ سا طالبعلم ہوں۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ میری نظر گرد و پیش کے حالات پر بھی رہتی ہے اور دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو میں بھی تاریخ کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے دیکھتا رہتا ہوں۔ سوویت یونین کے لیڈر میخائل گورباچوف کے عالمی منظر پر ابھرتے ہی دنیا میں جو نمایاں تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں' میں نے بھی ان کی معنویت کا اندازہ کر لیا تھا میں اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی کا حصہ نہیں تھا لیکن انہی عالمی تبدیلیوں کے حوالے سے ہی میں نے ان دنوں "جنگ" میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں' میں نے بتایا تھا کہ پرانی دنیا ختم ہو رہی ہے' نئی دنیا معرضِ وجود میں آ رہی ہے اور اس نئی دنیا کی قیادت نئے ذہن اور نئے لوگ کریں گے۔ میں نے اس مضمون میں اپنے عوام کی قیادت کرنے والے نئے لیڈروں کا بھی ذکر کیا تھا۔ میں نے راجیو گاندھی' کوری اکینو' گورباچوف کے ساتھ ساتھ محترمہ بے نظیر بھٹو کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا تھا اور میں نے لکھا تھا کہ پاکستان کی قیادت کی ذمہ داریاں' اب نوجوان بے نظیر بھٹو کے کندھوں پر ہیں اور وہ

www.bhutto.org

ہی ایک ایسی لیڈر ہیں جو ملک کو نئے دور کے تقاضوں کے تحت قیادت فراہم کر سکتی ہیں۔ میں نے یہ بات تاریخ کے ایک طالبعلم کی حیثیت میں کی تھی اور مجھے خوشی ہے کہ میرے اندازے درست ثابت ہوئے۔ میرے نزدیک بے نظیر کی قدر و منزلت کا سبب ان کا وزیر اعظم ہونا نہیں تھا بلکہ مجھے تو حیرت ہے کہ وہ اتنی دیر تک اس عہدے پر فائز کیسے رہ سکیں۔ میرے نزدیک نہ تو ذوالفقار علی بھٹو کا اقتدار سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی ان کی بیٹی کا جیساکہ آئندہ کے صفحات میں آپ دیکھیں گے کہ ذوالفقار علی بھٹو ایک تحریک کا نام تھا۔ وہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین تھے تب بھی عوام کی تحریک کی قیادت کر رہے تھے اور وزیر اعظم تھے تب بھی وہ عوام کی تحریک کے قائد تھے۔ بے نظیر بھٹو بھی اس تحریک کی وارث ہیں۔ وہ اقتدار میں ہوں یا اقتدار سے باہر ہوں 'انھیں پاکستانی عوام کی انقلابی تحریک کی قیادت کرنا ہے۔

میں پیپلز پارٹی میں اسی تحریک کی وجہ سے شامل ہوا ہوں۔ اس تحریک ہی میں روز اول سے شامل ہوں اور انشاءاللہ ہمیشہ رہوں گا۔ "بھٹو سے بھٹو تک" بظاہر تو ایک باپ سے لے کر ان کی بیٹی تک ان کی سیاسی جدوجہد کا قصہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ پاکستان کے اور دنیا بھر کے مظلوم عوام کی اس جدوجہد کی کہانی ہے جو پاکستان کی تعمیر کرتی ہے اور اسے آگے بھی بڑھاتی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ واقعات کا تعلق شہید ذوالفقار علی بھٹو سے ہے لیکن یہ ناگزیر تھا۔ عوامی جدوجہد کا عہد تاریخ کی گہرائیوں میں بہت دور تک گیا ہوتا ہے اور جب تک آپ اس کی جڑوں تک نہ پہنچیں اس کے ثمرات کی معنویت اور شیرینی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ ویسے بھی بھٹو شہید کی تمام جدوجہد بے نظیر بھٹو کا ورثہ ہے۔ بے نظیر بھٹو کی جدوجہد کی کونپلیں اس کی شاخوں پر کھلتی ہیں۔ آپ اسے الگ کر کے نہ دیکھئے بلکہ یہ ایک ہی تحریک ہے جو قائداعظمؒ کی قیادت میں شروع ہوئی' ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں اس نے ایک نئے دور کا آغاز کیا اور اب بے نظیر بھٹو کی قیادت میں اکیسویں صدی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یقیناً اس کتاب میں بے شمار خامیاں ہوں گی۔ میں کوئی پیشہ ور مصنف یا صاحب قلم نہیں ہوں۔ نہ ہی مجھے محقق یا ادیب ہونے کا دعویٰ ہے میں ایک ادنیٰ سیاسی کارکن ہوں' میرے پاس کوئی ہنر نہیں' مجھے کسی علمیت کا دعویٰ نہیں' میرے پاس صرف نیک ارادے اور خلوص ہیں اور میں توقع کرتا ہوں کہ آپ میری غلطیوں کو نہیں میرے خلوص کو دیکھیں گے۔ اپنی رفیق حیات شاہدہ نفیس کا شکر گزار ہوں کہ اس کتاب کی تحریر و تدوین کے دوران قدم قدم پر مجھے ان کی معاونت حاصل رہی۔

آخر میں' میں جناب میر خلیل الرحمٰن صاحب کا بطور خاص شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ یہ اسی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ میں نہ صرف گذشتہ کئی برس سے "نوشتۂ دیوار" کے نام سے کالم لکھ رہا ہوں بلکہ اب "بھٹو سے بھٹو تک" کا مسودہ مکمل کر پایا ہوں۔

نفیس صدیقی

www.bhutto.org

نوٹ : — یہ کتاب میں نے 6 اگست 1990ء کی صبح مکمل کی اور اسی دن شام کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی منتخب حکومت 'فردِ واحد نے بیک جنبشِ قلم برطرف کر دی۔ آخری باب اس برطرفی کے بعد لکھ رہا ہوں۔ اس بناء پر پوری کتاب میں محترمہ بے نظیر بھٹو کا حوالہ بطور وزیر اعظم آتا ہے۔ کیا اتفاق ہے کہ یہ کتاب اس وقت اشاعت پذیر ہو رہی ہے کہ جب محترمہ ایک مرتبہ پھر اقتدار سے باہر ہو کر عوامی حقوق کی جدوجہد کی قیادت کر رہی ہیں اور میری یہ کتاب حکومت کی خوشنودی کا وسیلہ بننے کی بجائے 'عوامی جدوجہد کا حصہ بن رہی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس جدوجہد میں محترمہ بے نظیر بھٹو اور جناب آصف علی زرداری کے ساتھ ہوں۔

www.bhutto.org

وزارت سے عوام تک

شہید ذوالفقار علی بھٹو پاکستان اور بھارت کی تاریخ کا وہ پہلا کردار ہیں جو مارشل لاء حکومت میں وزیر ہونے کے باوجود ایک مقبول ترین ترقی پسند لیڈر بن گئے۔ وجہ ایک ہی تھی کہ بھٹو شہید نے تاریخ کی بانہوں میں بانہیں ڈال لیں اور اس کے ارتقائی آہنگ کے ساتھ ساتھ قدم اٹھائے۔ یہی سبب تھا کہ پاکستان میں بھٹو سے پہلے پچیس سال تک سیاسی کام کرنے والی ترقی پسند پارٹیوں کو عوام کی اتنی محبت میسّر نہیں آئی جتنی کہ بھٹو کو۔ یہ محض اتفاق یا حادثہ نہیں کہ ایوبی دَور میں ایندھن اور قدرتی وسائل اور پھر خارجہ تعلقات کا وزیر بن کر کام کرتے ہوئے بھٹو کے جن اقدامات کو غلط کہا گیا وہی بعد ازاں بھٹو کے کارنامے ثابت ہوئے۔ جس رومانویت کو ان کا گناہ قرار دیا گیا وہی ان کا سرمایہ ثابت ہوئی اور وہ محض ایک وزیر، صدر یا وزیراعظم نہیں رہے بلکہ عالمی تاریخ کا ایک فعال اور سنسنی خیز کردار بن کر پوری دنیا میں پہچانے گئے۔ ایوبی دَورِ حکومت میں ان پر جو بڑے بڑے الزامات لگے وہ یہ تھے۔

1 - انہوں نے 1965ء میں بھارت کے ساتھ جنگ کروادی۔ یہ الزام اس وقت کی امریکی انتظامیہ کی طرف سے لگایا گیا کہ بھٹو بھارت کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کو معمول پر لانے کی بجائے ان دونوں ملکوں کے اختلافات کو تیز کرتے رہے اور کشمیر میں گوریلے بھیجنے کی "غلط" پالیسی بھی انہوں نے بنوائی۔ اس الزام کی حقیقت یہ تھی کہ 1949ء میں امریکہ نے پاکستان کے ساتھ باہمی تعاون کے پروگرام کے زیرِ عنوان جو معاہدہ کیا تھا اس میں یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ پاکستان بھارت کے خلاف کوئی

www.bhutto.org

فوجی اقدام نہیں کرے گا۔ علاوہ ازیں 54ء میں پاک امریکی دفاعی معاہدے کے علاوہ سیٹو اور سینٹو میں بھی پاکستان پر یہی شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ سوویت یونین کے خلاف امریکی مفادات کی خاطر تو تمام پالیسیاں اختیار کرے گا لیکن بھارت کو کبھی ناراض نہیں کرے گا۔ بھٹو چونکہ بھارت کو ایک توسیع پسند قوت قرار دیتے تھے جو اس خطہ میں پاکستان کی قومی بقاء کیلئے چیلنج تھی لہٰذا وہ امریکہ کی طرف سے عائد کردہ مذکورہ بالا شرائط کی اطاعت کرنے پر تیار نہ تھے۔ اس لئے ان کے اس رویئے کو وطن دشمنی قرار دے دیا گیا۔

2 - بھٹو نے پاک چین دوستی کو آگے بڑھانے اور مستحکم کرنے میں بڑھ چڑھ کر کام کیا جس سے امریکیوں کو یہ تکلیف پہنچی کہ بھٹو پاکستان کو کمیونسٹ بلاک کے ساتھ جوڑنے کی تگ ودو میں لگے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ بھٹو ہی وہ واحد شخصیت ہیں جنھوں نے ایوب خان کو پاک چین دوستی کی ڈگر پر چلایا اور تاریخ نے یہ بات ثابت بھی کر دی کہ یہ دوستی پاکستان کی خارجہ پالیسی میں سب سے مضبوط ستون ہے۔ اس نے پاکستان کو عالمی سطح پر ایک اہم مقام دلوایا اور شاہراہِ ریشم کی تعمیر سے دونوں ملکوں کی باہمی تجارت بھی ترقی کر گئی۔ پاکستان کی صنعتی ترقی میں اضافہ ہوا اور بھارت' روس اور امریکہ تینوں ملکوں کو کمزور اور پسماندہ نظر آنے والا پاکستان ایک مضبوط مملکت بنتا نظر آیا۔ اس لئے بھٹو کے اس مبینہ "گناہ" کو بھی تاریخ نے ایک عظیم کارنامہ ثابت کر دیا۔

3 - بھٹو نے ایندھن اور قدرتی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے بھی جب روس کا دورہ کیا تو پاکستان میں تیل نکالنے کی مہم روس کے سپرد کر دی جس سے امریکہ' بھارت اور یورپ تو ناراض ہو گئے لیکن سوویت یونین اور پاکستان کے تعلقات میں موجود وہ دشمنی کم ہو گئی جو اس وقت سے شروع ہو گئی تھی جب لیاقت علی خان روس سے حاصل کردہ دورے کی دعوت کو مسترد کر کے امریکہ کے دورے پر چلے گئے اور امریکہ سے ٹوٹے پھوٹے ہتھیار اور طیارے لے کر سرد جنگ میں کود پڑے اور بعد میں جب انہوں نے بھارت کے مقابلے کا راستہ اختیار کیا تو امریکہ نے ان پر دباؤ بھی ڈالا تھا کہ وہ یہ پالیسی اختیار نہ کریں۔ لیاقت علی خان نے جب اس طرح کے دباؤ کو لیاقت باغ کے جلسہ عام میں بے نقاب کرنے کا اعلان کیا تھا تو اسی جلسہ میں خطاب سے پہلے انہیں شہید بھی کر دیا گیا۔ اس کے بعد پاکستان مکمل طور پر امریکہ کی روس دشمن کالونی بن گیا اور پھر پشاور میں موجود بڈابیر کے ہوائی اڈے سے پرواز کرنے والا امریکی جاسوس طیارہ "یوٹو" روس میں گرا لیا گیا تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ پاکستان' روس کے خلاف استعمال ہونے والے امریکی جنگی اڈے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ بھٹو نے روس کے ساتھ تیل کی تلاش کا معاہدہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ روس پاکستان میں اسٹیل مل لگائے گا جو بعد ازاں بھٹو کے اپنے دور میں مکمل ہوئی لیکن آج بھی چل رہی ہے اور جنرل ضیاء الحق اور جماعت اسلامی کی کوشش کے باوجود بند نہیں ہو سکی۔

www.bhutto.org

4 - بھٹو پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا گیا کہ معاہدۂ تاشقند کی مخالفت کر کے وہ پاکستان کو بھارت کے ہاتھوں تباہ کروانا چاہتے تھے حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ خود امریکی انتظامیہ نے روس کے ساتھ عالمی سطح پر علاقائی لین دین کر کے یہ بات مانی تھی کہ معاہدۂ تاشقند کرایا جائے لیکن یہی امریکہ بعد میں سوچنے لگا کہ پاکستان روس کے زیرِ اثر نہ چلا جائے ادھر روس نے جو اس وقت برِ صغیر کی کمیونسٹ تحریکوں کو بھارتی حکمران پارٹی کانگریس کے تابع بنا رہا تھا یہ کوشش کی کہ پاکستان کو بھارتی بالادستی میں دے دیا جائے۔ بھٹو نے اس وقت پاکستان کو ان تینوں ملکوں کے اثر و نفوذ سے نکالنے کا کٹھن راستہ اختیار کیا اور چین اور تیسری دنیا کے ممالک کے تعاون سے اسے ایک نئی اور مستحکم مملکت بنانے کے خواب دیکھے۔

5 - امریکہ، بھارت اور روس تینوں کو بھٹو سے یہ شکایت تھی کہ وہ پاکستان کو برِ صغیر کے حصار سے نکال کر اس کے رشتے مشرقِ اوسط کے ساتھ استوار کرنا چاہتے تھے۔ ایوبی دور میں یہ کام مکمل نہ ہو سکا کیونکہ ایوب خان اس عظمتِ فکر سے محروم تھے جو تاریخی شخصیتوں کے حصے میں آتی ہے۔ پاکستان کے کردار کے بارے میں ان کے تصوّر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے خود بھارت کو دفاعی معاہدہ کی پیشکش کر دی تھی لہٰذا یہ کام بھٹو نے اس وقت کیا جب وہ خود صدر اور وزیرِ اعظم بنے اور انہوں نے کہا "اب یہ نیا پاکستان ہے" جو مشرقِ اوسط تک پھیلے ہوئے اسلامی ممالک کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے قوم پرست مسلم لیڈروں کا تعاون حاصل کیا۔ مصر کے سربراہ جمال عبدالناصر، انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو اور الجزائر، شام اور عراق کی ترقی پسند حکومتوں کے ساتھ خصوصی رشتے قائم کئے۔ ان کی یہی پالیسیاں سپر پاورز کے مفادات کیلئے خطرہ بنیں۔

6 - ایوبی دور میں ہی بھٹو نے تیسری دنیا کے ان ممالک میں اتحاد اور تعاون کیلئے رابطوں کی بھرپور مہم چلائی۔ انہی رابطوں کو بروئے کار لا کر ترقی پذیر ملکوں کے کئی مشترکہ پلیٹ فارم بنائے۔

7 - ملک کے اندر بھٹو نے نوجوان نسل کو ترقی پسندانہ راستے پر چلانے کیلئے ایوبی دور میں کوششیں شروع کر دی تھیں اور ملازم کی رجعت پسندی اور تنگ نظری کا مقابلہ روشن خیالی اور عوام دوستی کے ساتھ کیا۔

8 - ایوبی دور میں ہی انہوں نے زرعی اصلاحات پر زور دے کر جاگیرداری پر ضرب لگانے اور صنعتی ترقی کے فروغ کی غرض سے اپنے بین الاقوامی دوروں میں انتھک کوششیں کیں۔

یہ تھیں وہ پالیسیاں جنہیں اختیار کر کے بھٹو نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایوبی حکومت کے ایک وزیر ہی نہیں بلکہ قومی خود مختاری اور روشن خیالی کے علمبردار لیڈر بھی ہیں اور یہی وہ پالیسیاں تھیں جن کی بنیاد پر ایک طرف ایوب خان نے اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" میں امریکی پالیسی سے اختلاف کرنے کا سہرا اپنے سر باندھا لیکن آخر کار امریکہ کے سامنے گھٹنے بھی ٹیک دیئے اور پھر بھٹو کی یہی وہ پالیسیاں تھیں، جن کو ختم کرنے کیلئے ایوب خان نے امریکہ کا دورہ کر کے صدر جانسن سے یہ وعدہ

www.bhutto.org

بھی کر لیا کہ وہ بھٹو کو وزارت خارجہ سے نکال دیں گے اور اس وعدے پر انہوں نے عمل بھی کیا۔

ایوبی دور میں اگرچہ بھٹو نے کچھ عرصے کیلئے بحیثیت وزیر اطلاعات و نشریات' میڈیا کی لائن آف ایکشن بدلی اور اس میں نئے طریقے اور رجحانات متعارف کرائے اور بطور وزیر تجارت پاکستان کی برآمدات کو بڑھایا لیکن جن کارناموں کی بنیاد پر بھٹو کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ایک دانشور اور سیاسی لیڈر کی حیثیت میں مانا گیا' وہی تھے جو انہوں نے ایندھن' پانی اور قدرتی وسائل کے وزیر اور پھر اقوام متحدہ میں اور یورپی اور ایشیائی و افریقی ملکوں میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے وزیر خارجہ کی حیثیت میں انجام دیئے۔ پاکستان میں تیل کی تلاش کا کام روس کے سپرد کرنے کا فیصلہ اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ اس کی مخالفت پاکستان کے تمام وزراء اور بیوروکریٹ کر رہے تھے لیکن بھٹو نے اپنے دلائل اور تدبّر سے ایوب خان کو قائل کر لیا۔ دوسری طرف سوویت یونین یہ پیشکش کر رہا تھا کہ تیل کی تلاش کے پروگرام پر جو قرض وہ پاکستان کو دے گا اس پر سود پانچ فیصد کی شرح سے لیا جائے گا۔ بھٹو نے روسی حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے ماسکو میں مذاکرات کرتے ہوئے کہا "پہلے تو آپ ساڑھے تین فیصد سود کی رعایت دینے پر تیار تھے' اب پانچ فیصد کیوں مانگ رہے ہیں؟" سوویت نمائندوں کا جواب تھا "ساڑھے تین فیصد سود ہم صرف ان ملکوں سے لیتے ہیں جو ہمارے دوست ہیں' پاکستان ہمارے دوستوں کی فہرست میں شامل نہیں کیونکہ یہ امریکی ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا ہے" اس پر بھٹو نے کہا کہ "آپ بھی عجیب انقلابی ہیں' جو لوگ خود آپ کے گھر دوست بننے کیلئے آئے ہیں ان کو پہچان بھی نہیں سکتے۔" اس کے ساتھ ہی بھٹو نے اپنے وفد کے ارکان سے واپس چلنے کیلئے کہا۔ سوویت لیڈر اس صورتحال سے پریشان ہو گئے۔ انہوں نے فوراً ساڑھے تین فیصد سود کے معاہدے پر دستخط کرنے کا اعلان کر دیا لیکن دوسری طرف ایوب خان نے بھٹو کو پیغام بھیج دیا کہ "میرے افسران اعلیٰ جو تمہارے ساتھ روس جانے پر تیار نہیں تھے ناراض ہو گئے ہیں۔ اس لئے تم اس معاہدہ پر دستخط کئے بغیر واپس آ جاؤ۔" بھٹو نے ماسکو میں بیٹھ کر مسلسل ٹیلیفون اور ٹیلیکس کے ذریعے ایوب خان کے ساتھ طویل بحث کی اور بالآخر معاہدہ پر دستخط کر دیئے اور سوویت یونین تیس ملین ڈالر خود خرچ کر کے پاکستان سے تیل نکالنے پر تیار ہو گیا ان دنوں روس میں پاکستان کے سفیر آغا ہلالی ہوا کرتے تھے جنہوں نے ایوب خان کو بتایا کہ روس میں ان کے ہم منصب وزیر نے بھٹو کے ساتھ مذاکرات کے بعد ان کے بارے میں کہا کہ

"اس شخص پر کڑی نظر رکھیں یہ نوجوان بھی ہے اور بہت تیز بھی۔" .....

تیل کا یہ معاہدہ 1961ء میں ہوا تھا خود ذوالفقار علی بھٹو جب وزیر اعظم بنے تو قومی اسمبلی کے اجلاس میں پاکستان سے نکلے ہوئے تیل کی بوتل قومی اسمبلی میں لا کر انہوں نے مفتی محمود کو سونگھائی تھی۔

اس وقت بھٹو ایندھن' پانی اور قدرتی وسائل کے وزیر تھے لیکن ان کی وہ تھیوری جو پوری دنیا میں ان کا عظیم نظریہ بن کر مقبول ہوئی "بائی لیٹرل ازم" کی تھیوری تھی جس پر انہوں نے وزیر خارجہ بن کر

www.bhutto.org

دن رات عمل کیا اور سوشلسٹ بلاک کے ساتھ تعلق رکھنے والے ملکوں سے پاکستان کے تعلقات بڑھانا شروع کئے۔ پاکستان نے ماضی میں مغرب نوازی کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس کا رخ موڑنے والے بھٹو ہی تھے اور یہی وجہ تھی جس سے بھٹو سوشلسٹ اور قوم پرست ملکوں کے لیڈروں میں مقبولیت اختیار کرتے گئے اور اسی وجہ سے ہی ایوب خان نے بھٹو کو اپنے لئے بھی ایک چیلنج سمجھنا شروع کر دیا اور امریکی صدر جانسن کے مطالبے پر وائٹ ہاؤس میں بیٹھ کر ہی فیصلہ کر لیا کہ بھٹو کو وزارتِ خارجہ سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ یہ بات اگرچہ جانسن اور ایوب کے درمیان اکیلے میں ہوئی تھی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ لیڈی جانسن دونوں سربراہوں کی بات چیت کے دوران کھسک کر باہر آ گئیں اور پاکستانی وفد کے ارکان سے پوچھنا شروع کر دیا کہ "اتنی سنسنی خیز شخصیت رکھنے والا ذوالفقار علی بھٹو کون ہے؟" بھٹو بلا کی پھرتی سے اٹھے اور اپنی شخصیت سے خاتونِ اوّل کو اتنا متاثر کیا کہ وہ چپکے سے انہیں بتا گئیں "آپ آئندہ پاکستان کے وزیرِ خارجہ نہیں ہوں گے"۔ امریکہ سے واپسی کے دوران طیارے میں بیٹھے بیٹھے بھٹو نے یہ بات ایوب خان سے پوچھ لی کہ "میری وزارت کا خاتمہ کب ہو رہا ہے؟" تو ایوب خان کا رنگ اڑ گیا۔ انہیں حیرت تھی کہ اتنی خفیہ بات کا اس نوجوان کو کیسے علم ہو گیا؟ بھٹو کی یہی ذہانت اور معاملہ فہمی تھی جس کی بناء پر وہ پاکستان کی حکومتوں پر چھائے ہوئے جاگیرداروں' ملاؤں اور جنرلوں کی سیاست کیلئے خطرہ بننے والے تھے۔ عالمی رہنماؤں میں بھٹو کے سب سے زیادہ تعلقات چینی وزیرِ اعظم چواین لائی کے ساتھ تھے اور نظریاتی طور پر وہ ماؤزے تنگ کے بہت قریب تھے۔ ماؤزے تنگ اگرچہ سوویت یونین کی قیادت سے اختلاف رکھتے تھے لیکن لینن کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ بھٹو اس تعلق کو سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ جب فیض احمد فیض کو سوویت حکومت نے لینن ایوارڈ دیا تو اس پر ایوب خان نے فیض کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا لیکن بھٹو نے فیض کو مبارک باد کا تار بھیجا۔ اس کے علاوہ ویت نام میں امریکی فوجوں کی طرف سے پھیلائی گئی زہریلی گیس کے مسئلہ پر بھٹو نے امریکہ کی شدید مخالفت کی اور غیر جانبدار ملکوں کی تحریک کی پُرزور حمایت کی۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بھٹو نے ایوب خان کو یہ بات سمجھائی تھی کہ اگر انہوں نے امریکی صدر جانسن کے حکم پر پاکستانی فوجی دستوں کو جنوب مشرقی ایشیا میں بھیج دیا تو یہ خود آپ کیلئے ایک تباہ کن حرکت ہوگی۔ ایوب خان نے بھٹو کا یہ مشورہ مانا تو امریکی پالیسی ساز بہت حیران ہوئے۔ وہ ایوب کو بھٹو کے اثرات سے نکالنے کیلئے شدید دباؤ ڈال رہے تھے اور بالآخر ایوب اس دباؤ میں آ گئے۔

اسلامی برادری میں گہرے تعلقات کے ساتھ' پاکستان کو افریقہ اور ایشیاء کی تحریکوں سے منسلک کرنے کا تصور مغربی پاکستان کی حکومت یا کسی بھی سیاستدان کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا تھا تاہم مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں ایسے لیڈر یقیناً پیدا ہوتے رہے تھے لیکن وہ بنگلہ دیش میں بیسویں سال تک چلنے والی سامراج دشمن تحریکوں کے زیرِ اثر پیدا ہوئے تھے۔ مغربی پاکستان میں اس قسم کی سوچ لے کر ابھرنا ایک

www.bhutto.org

معجزے سے کم نہیں تھا۔ بھٹو نے جوانی کے دَور میں مشرقی پاکستان کے جس سیاستدان سے دوستی کی وہ حسین شہید سہروردی تھے۔ وہ ایک قوم پرست سیاستدان تھے۔ سہروردی نے ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو کے پاس لاڑکانہ پہنچ کر ان سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ ذوالفقار کو عوامی لیگ میں شامل ہونے پر مجبور کریں لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے عوامی لیگ میں شامل ہونے کا مشورہ قبول نہیں کیا۔

قومی اور بین الاقوامی سیاست میں ذوالفقار علی بھٹو نے جو بلند مقام حاصل کیا اس کا پس منظر ان کی خارجہ پالیسی ہے جب کہ دوسرا مرحلہ پیپلز پارٹی کی تشکیل ہے۔ اسے قوم پرستانہ خارجہ پالیسی اور محنت کش طبقوں کو استحصال سے نجات دلانے والے منشور کی بنیاد پر قائم کیا گیا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ بھٹو نے قوم پرست خارجہ پالیسی کو اندرونی طبقاتی آزادی کے ساتھ کیوں مشروط کیا؟ جب کہ پاکستان کی کسی بھی حکومت کے کسی بھی وزیر خارجہ نے خارجہ پالیسی کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بھٹو واحد وزیر تھے جو مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی یہ بات محسوس کرنے لگ گئے تھے کہ سرمایہ داری نظام کسی ایک ملک تک محدود نہیں بلکہ ایک عالمی نظام ہے اور تیسری دنیا کے ممالک اس عالمی نظام کے استحصالی جبر سے علیحدہ نہیں ہیں۔ اس لئے انہوں نے سب سے پہلے 1917ء کے سوویت انقلاب اور دنیا بھر کی قوم پرست اور سوشلسٹ تحریکوں کا مطالعہ کیا اور پاکستانی عوام کے تاریخی ارتقاء کے سفر کی قیادت کرنے کے لئے آزاد اور خود مختار خارجہ پالیسی کو ایک بنیادی اصول کے طور پر اپنا لیا اور ایوبی دَور میں سب سے اہم کردار اسی وزارت میں ادا کیا۔ ایوبی کابینہ میں جب کبھی خارجہ پالیسی کے مسئلہ پر بات ہوتی تھی تو منظور قادر اور شعیب جیسے وزیر نوجوان بھٹو سے گھبرانے لگتے تھے جو ان کی نسبت نا تجربہ کار بھی تھا اور کم عمر بھی۔ دانشور اور صحافی امور خارجہ پر ان کی تقریروں کو چشموں کی طرح بہتی ہوئی گنگا قرار دیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ایوب خان کے پہلے وزیر خارجہ محمد علی بوگرہ کی بیماری کے دوران بھٹو نے بار بار خارجہ تعلقات کے سلسلے پر بیرونی ممالک میں پاکستان کے ترجمان کے فرائض انجام دیئے۔ مزید آں کشمیر کے مسئلے پر مذاکرات کے لئے وہ پاکستانی وفد کے سربراہ بن کر بھی گئے تھے اور ان کی اسی کارکردگی کی وجہ سے 1962ء میں محمد علی بوگرہ کے انتقال کے بعد ایوب خان ان کو وزیر خارجہ بنانے پر مجبور ہوئے۔

وزارتِ خارجہ میں بھٹو کا سب سے پہلا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اس وزارت کو مغربی ممالک کے کلرکوں اور سیکرٹریوں کا دفتر نہیں رہنے دیا بلکہ اسے علم کی دولت مہیا کی اور اس میں ایسی توانائی اور صلاحیت پیدا کی کہ یہ وزارت ایک امتیازی شناخت سے سرفراز ہو گئی۔ خارجہ تعلقات پر بھٹو کی دانشورانہ صلاحیت ہی ان کی عالمی شہرت کا بنیادی مصدر ہے اور دنیا انہیں عظیم اسٹیٹس مین کے طور پر جاننے لگی۔ بھٹو یہ بات خود بھی کہا کرتے تھے کہ ایوب خان نے مجھے صرف اس وجہ سے وزارتِ خارجہ دی تھی کہ ایوبی وزیروں میں کوئی بھی خارجہ تعلقات پر اتنا علم نہیں رکھتا تھا جتنا کہ میں۔

www.bhutto.org

بھٹو کا یہ دعویٰ حقیقت بھی ثابت ہو گیا۔ چین کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کا یوں استوار ہونا کہ پاک چین دوستی ایک بین الاقوامی قوت بن جائے معمولی بات نہیں ہے۔ سوویت یونین دفاعی حکمت عملی کے حوالے سے بھارت کو ترجیح دیتا تھا کیونکہ پاکستان مغربی ممالک کے زیر اثر تھا۔ اس صورتحال میں پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان موجود کشیدگی کو دوستانہ تعلقات میں بدل دینا کوئی آسان کام نہیں تھا جو بھٹو کی دانشورانہ پالیسیوں کے باعث ممکن ہوا۔ سیٹو اور سینٹو جیسے معاہدوں سے پاکستان کو نکالنا' پاک امریکی دفاعی معاہدوں کی پابندیوں کے باوجود پاکستان کو روس کے خلاف کرائے کا سپاہی بن کر استعمال نہ ہونے دینا اور پاکستان کو تیر صغیر کی بجائے نئے پاکستان کا نام دے کر جنوب مغربی ایشیاء اور مشرق اوسط سے جوڑنا اور پھر افریقی ایشیائی اتحاد کی کانفرنس میں پاکستان کو ایک فعال قوت بنانا ایک ایسا عالمی کارنامہ تھا جو بھٹو ہی سرانجام دے سکتے تھے۔ پاک بھارت جنگوں کے دوران اقوام متحدہ میں بھارتی وزیر خارجہ کے مقابلہ میں جو مدلل تقریریں ذوالفقار علی بھٹو نے کی تھیں وہ جدید حکمت عملی سے لے کر جدید شعروادب تک کئی فنون کا حسین امتزاج ہوتی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بھٹو جب وزیر خارجہ بنے تو ایک طرف تو انگریز اور ان کے ایشیائی ملازمین یہ کہا کرتے تھے کہ اب پاکستان اور یورپ کے تعلقات خراب ہو جائیں گے لیکن ساتھ ہی دوسری طرف وہ بھٹو کی طرف یوں نظریں جما کر دیکھا کرتے جیسے یورپی شہری شیکسپیئر کے ہیملٹ اور ہالی ووڈ کے اداکار مارلن برانڈو کو دیکھا کرتے تھے۔

مشرق کی طرف نظر دوڑائیے تو انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو' ویت نام کے سربراہ ہوچی منہ اور کمبوڈیا کے شہزادہ سہانوک پاکستان کے اس نوجوان وزیر کی سرگرمیوں پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ صدر سوئیکارنو نے تو بھٹو سے خصوصی توقعات وابستہ کر لیں اور اپنے ایک خصوصی ایلچی کے ہاتھ انہیں یہ پیغام بھجوایا کہ افریقی ایشیائی ممالک کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ بھٹو نے فوری طور پر اس تجویز سے اتفاق کیا اور پھر دنیا نے دیکھا کہ ایک طرف تو الجزائر میں کانفرنس ہوئی اور دوسری طرف چین' انڈونیشیا اور پاکستان کے اتحاد کی دھوم مچ گئی۔ واضح رہے کہ چین بھی انہی دنوں محکوم اور محتاج ملکوں کا ایک ایسا اتحاد بنا رہا تھا جو امریکہ کو سامراج اور روس کو سوشل سامراج قرار دے کر آزادانہ پالیسیاں اختیار کرے۔ یہ سنسنی خیز واقعہ بھی دنیا کو یاد ہے کہ 1965ء میں جب الجزائر کے صدر بن بیلا کا تختہ الٹ دیا گیا اور افریقی ایشیائی کانفرنس منعقد ہونے کے امکانات ہی ختم ہونے لگے تو اس وقت بھٹو اور ایوب خان انگلینڈ کا دورہ کر رہے تھے اور بھٹو اس بات پر بضد تھے کہ یہ کانفرنس ضرور منعقد کرانی چاہئے جبکہ ایوب خان کو اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن بھٹو کسی نہ کسی طرح ایوب خان کو مجبور کر کے الجزائر پہنچ گئے اور منسوخ ہوتی ہوئی افریقی ایشیائی کانفرنس بہرحال منعقد کرانے کا اہتمام کر کے سامراجی ممالک پر لرزہ طاری کر دیا اور مغربی دنیا کے بڑے بڑے اخبارات یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر بھٹو نہ ہوتا تو یہ کانفرنس منعقد ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کانفرنس میں ایشیائی ممالک کی اکثریت نے کشمیر کو ایک مسئلہ تسلیم کیا اور اس کے بارے میں

www.bhutto.org

پاکستان کے مؤقف کو درست قرار دیا تاہم اسی کانفرنس میں وہ شدید اختلافات بھی سامنے آئے جن کی موجودگی سے افریقی ایشیائی ممالک دور ہوتے دکھائی دیئے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد قاہرہ میں بھٹو کی کوششوں سے پاکستان ' انڈونیشیا' متحدہ عرب امارات اور چین کی ایک چھوٹی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں پاکستان کی طرف سے بھٹو نے شرکت کی لیکن برطانیہ سے وطن واپس آتے ہوئے ایوب خان قاہرہ کے ہوائی اڈے پر رُکے تو تمام سربراہان سے ان کا خیر مقدم کرا کے انہیں یہ تاثر دیا کہ عالمی اہمیت کے ان واقعات کا سرخیل کے رہے۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ ایوب خان جو کہ ان پالیسیوں کی بناء پر مغرب کے شدید دباؤ میں تھے انہیں نئی دنیا کی نئی جہتوں کی ہمہ قدر و منزلت کا احساس دلا کر ان میں اعتماد پیدا کیا جائے۔

یہ ایوب خان کی حکومت ہی تھی جب 1959ء میں وزیر خارجہ منظور قادر نے چین کے خلاف تبت کی بغاوت کی حمایت کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ "چین کی پالیسی تو روس کی پالیسیوں سے بھی زیادہ وسیع پسندانہ ہے۔" اور ایوب خان نے بھی کہا تھا کہ چین برصغیر پر حملہ کر دے گا لیکن بھٹو کے مذاکرات کے نتیجے میں چین نہ صرف پاکستان کو صنعتی امداد دینے پر تیار ہو گیا بلکہ اس نے شاہراہ ریشم کی تعمیر بھی سوچنا شروع کر دیا۔ یہ وہی چین تھا جو اس سے قبل افغانستان کی اندرونی سڑکیں بنا رہا تھا۔ دوسری طرف پاکستان بھی وہ تھا جو چین کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کے سوال پر غیر واضح رویہ اختیار کر رہا تھا مگر بھٹو کی مرتب کردہ پالیسیوں کی وجہ سے چین کی ممبر شپ کا زبردست حامی بن گیا تھا۔ ستمبر 1962ء میں جب چین اور بھارت کی جنگ ہوئی اور مغربی ممالک نے بھارت کو مدد دینے کا اعلان کر دیا۔ اس وقت بھی بھٹو نے ایوب خان کو یہ بات سمجھائی کہ پاکستان کو کس کے ساتھ متحدہ محاذ بنانا چاہیے؟ پاکستان کی اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ 1965ء میں جب پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑی تو چین پاکستان کی زبردست مددگار قوت بن کر سامنے آ گیا۔ اس نے تین دن کا نوٹس دیتے ہوئے کہا کہ "بھارت نے چینی سرحد پر ہمالیہ کے علاقوں میں جو فوجی چوکیاں قائم کر رکھی ہیں انہیں ختم کر دے اور چین کی جو بھیڑیں اس نے چرائی ہیں وہ واپس کر دے ورنہ سنگین نتائج کا ذمہ دار وہ خود ہو گا۔" یہی وجہ تھی کہ امریکہ نے پاکستانی سفارت خانے سے کہا کہ وہ چین کے بارے میں اپنی پوزیشن نئے سرے سے واضح کرے۔ دوسری طرف پاکستان میں ہر پلیٹ فارم پر ذوالفقار علی بھٹو چین کی حمایت کے چیمپئن بن کر دھڑلے اور علانیہ تقریریں کر رہے تھے۔ اب بھٹو ایک متنازعہ شخصیت بھی تھے اور ہیرو بھی۔ وہ ایک اسٹیبلشمنٹ میں بھی تھے اور لیڈر بھی چنانچہ انہیں کابینہ سے الگ کرنے کے فیصلے پر عملدرآمد کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں امریکی صدر جانسن کی فرمائش کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ بہانہ یہ بنایا گیا کہ نوجوان وزیر بیمار ہو گیا ہے اور علاج کیلئے انگلینڈ جانا ہے۔ اس صورتحال میں بھٹو کے پاس دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ وہ انتہا پسندانہ راستہ اختیار کریں اور چین یا روس کا سہارا لے کر پاکستان میں کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہوں۔ دوسرا یہ کہ برطانیہ چلے

www.bhutto.org

جائیں اور مغرب میں اپنے متعلق پیدا شدہ یہ تاثر دُور کریں کہ وہ کوئی انتہا پسند اور مہم جو قسم کے انقلابی ہیں اور مغرب کے آزاد خیال عناصر کی حمایت حاصل کر کے پاکستان میں ایک ایسے نظام کے نفاذ کی کوشش کریں جو کہ پاکستان کے مخصوص اسلامی کردار کی روشنی میں سوشل ڈیموکریسی کے اس ماڈل کے قریب ہو جو کہ اسکینڈے نیویا کے ملکوں میں رائج ہے۔ بھٹو نے روس یا چین کی طرف جانے کی بجائے خود سوشل ڈیموکریٹ بن کر انگلستان کا راستہ اختیار کیا لیکن اسلام آباد سے رخصت ہوتے وقت انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب بھٹو طیارے کے ذریعے کراچی نہیں پہنچیں گے بلکہ ریل پر سفر کر کے اسلام آباد سے لاہور تک پنجاب کے عوام کو ایک نئی تحریک کا اشارہ دیئے جائیں گے اور یہ بھی دیکھ جائیں گے کہ پنجاب کے عوام میں ان کی مقبولیت کے امکانات کس حد تک موجود ہیں؟ 1966ء میں پنجاب کی سیاست کی سب سے اہم تبدیلی یہی تھی کہ وزارت سے استعفیٰ دینے کے بعد بھٹو نے راولپنڈی میں اپنے دوستوں کو بلایا اور کابینہ سے مستعفی ہونے کے بارے میں اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا۔ اسی میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا کہ وہ ریل گاڑی کے ذریعہ راولپنڈی سے لاہور پہنچیں گے اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے مختلف ریلوے سٹیشنوں پر ان کا استقبال کیا جائے گا اور یہی ہوا۔ راولپنڈی سے لاہور تک ہر چھوٹے بڑے ریلوے سٹیشن پر بھٹو کو لانے والی تیز گام کو بار بار رُکنا پڑا کیونکہ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں نوجوان اپنے بھٹو کا استقبال کرنے کے لئے جمع ہوتے چلے گئے جس بھٹو نے 22 ستمبر 1965ء کو سلامتی کونسل میں پاک بھارت کی جنگ بندی کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"ہم ہزار سال تک جنگ لڑیں گے۔ بغاوت کی جنگ لڑیں گے' اپنے دفاع کے لئے لڑیں گے' اپنے وقار کے لئے لڑیں گے' ہم زندگی کو نشوونما دینے والے لوگ ہیں' ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا نام و نشان تک مٹا دیا جائے' ہم نے اپنے وقار کی خاطر لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اپنے پاکستان کی خاطر لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

اس کے بعد 28 ستمبر 1965ء کو کشمیر کے مسئلہ پر اسی سلامتی کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے بھٹو نے کہا تھا کہ "پولینڈ میں بھٹو کہلانے والے یہودیوں کے باڑے آج درد و آلام اور خوف کی یادگار بن چکے ہیں' لیکن کشمیر میں بھٹو آج بھی ہیں جن میں سے اٹھنے والی انسانی گوشت کی بدبو آسمانوں تک پھیل رہی ہے۔ جہاں جارحیت کا عادی ایک دیو انسانی گوشت کو چیرتا جا رہا ہے اور یہ ہر بستی کے خون کا پیاسا بن کر اسے تباہ کر دیتا ہے جو اس جارحیت کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے 1990ء کے واقعات سے بھٹو کے ان الفاظ کی کس طرح توثیق ہوئی؟ اور پھر 4 جنوری 1966ء کا وہ دن بھی آیا جب سوویت یونین کے شہر تاشقند میں پاکستان بھارت اور سوویت یونین کا سربراہی اجلاس ہوا اس اجلاس میں بھارت کی نمائندگی وزیر اعظم لعل بہادر شاستری' وزیر خارجہ سورن سنگھ اور وزیر دفاع وائی بی چوہان نے کی جبکہ پاکستانی وفد کی نمائندگی صدر ایوب خان' وزیر اطلاعات و نشریات خواجہ شہاب الدین' وزیر

www.bhutto.org

تجارت علاقائی تعاون کے سربراہ ایئر مارشل اصغر خان اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے کی اور اسی جگہ معاہدہ تاشقند پر دستخط ہوئے جس کو بھٹو نے بھی قبول نہ کیا۔ اسی معاہدہ کے خلاف انہوں نے اپنی تحریک شروع کی جس کے نتیجے میں پیپلز پارٹی نے جنم لیا۔ معاہدہ تاشقند کے ساتھ بھٹو کا بنیادی اختلاف یہ تھا کہ اس میں کشمیر کے مسئلے کو حل نہیں کیا گیا اس لئے یہ معاہدہ پاکستان کی خود مختاری کے خلاف ہے۔ "فروری سے جون 1966ء تک بھٹو محض برائے نام وزیر خارجہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور 20 جون 1966ء کو راولپنڈی ریلوے اسٹیشن پر وہ تیز گام میں بیٹھ گئے جو راولپنڈی سے لاہور تک بھٹو کے جلوس میں بدل گئی اور ایوب خان اور بھٹو کے راستے الگ کر دیئے فروری 1966ء سے جون 1966ء تک بھٹو نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے ایک اہم کام یہ کیا کہ انڈونیشیا کا دورہ کر کے صدر سوئیکارنو کے ساتھ مستقبل کی راہیں متعین کر لیں ان پر دونوں دوستوں کو عمل کرنا تھا۔ وزارت خارجہ چھوڑنے کے سوال پر بھٹو اور ایوب مذاکرات 6 جون 1966ء کو ہوئے تھے جبکہ بھٹو اپنا سامان اس سے پہلے ہی لاڑکانہ بھجوا چکے تھے یہ مذاکرات بھٹو ایوب تعلقات کا آخری لمحہ تھے اس کے بعد مستقبل میں بھٹو نے نئے انداز سے قائد عوام بننے کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔

20 جون 1966ء کو راولپنڈی سے روانہ ہونے والی بھٹو وار تیز گام جب لاہور پہنچی تو بھٹو کے آنسوؤں سے بھیگا ہوا رومال مظاہرین کے اجتماع میں ہزاروں روپے کی قیمت پا گیا۔ گورنر پنجاب نواب امیر محمد خان نے مستقبل کے اس لیڈر کی امکانی قوت کا اندازہ کر لیا تھا۔ ہر چند کہ حکومت میں رہتے ہوئے یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف تھے مگر اس موقع پر نواب کالا باغ نے بھٹو کو ایوب خان کے عزائم سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ وہ ان کے خلاف کسی بھی حد تک جانے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن بھٹو اپنے سفر کا آغاز کر چکے تھے اسی لاہور میں انہوں نے ایوب خان کو عوام کے بدلے ہوئے تیوروں کی ایک جھلک دکھا دی جب انہوں نے اپنا کوٹ اتار کر عوام کی طرف پھینکا تو لوگوں نے اس کے ٹکڑوں کی دھجیاں آپس میں بانٹ لیں اور برسوں تک انہیں سنبھال کر رکھا۔ لاہور کا یہ جذباتی اور پرجوش اجتماع "بھٹو کے نئے کردار کی صبح تھی۔ اس سے ایوب خان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والا وقت کیا ہو گا۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر شہید بھٹو کا استقبال مغربی پاکستان کے رجعت پسند سیاسی لیڈروں کے خیال میں ایک جذباتی مظاہرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دائیں بازو کے لیڈر جو اس وقت تک یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے عوام توہم پرستی میں مبتلا رہے ہیں۔ بھٹو کے اس استقبال سے یہ اندازہ بھی نہ کر سکے کہ عوام کی سوچ میں کتنی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ دوسری طرف بائیں بازو کے لیڈر جو چین نواز اور روس نواز گروہوں میں تقسیم ہو کر مارکس ازم کی بجائے سٹالن ازم اور ماؤ ازم کے نام پر اپنی مارکسزم کی دکان چلا رہے تھے یہ اندازہ نہ کر سکے کہ پاکستانی عوام کی روحانیت کے پس منظر میں ان کی توہم پرستی کام کر رہی ہے جو ملا ازم سے نفرت کرتی ہے لیکن بھگتی تحریک اور ملامتی صوفیاء کی تحریک کے فلسفے پر قائم ہے۔ بائیں بازو کو یہ بھی

www.bhutto.org

حساس نہیں تھا کہ پاکستان کے مزدوروں اور کسانوں کی طبقاتی سوچ بھی اسی رومانویت سے اُگی ہوئی ہے۔
درحقیقت پاکستانی دائیں بازو اور بائیں بازو کے درمیان ایک قدر مشترک بھی موجود تھی اور وہ یہ کہ دایاں بازو جاگیرداروں اور افسروں کے پروردہ مُلا ازم کی بیساکھیوں کا سہارا لے کر چل رہا تھا جبکہ سیاست میں بایاں بازو اسٹالن ازم اور ماؤازم کی بیوروکریٹک عقیدہ پرستی کا شکار ہو کر "مارکسی مُلا ازم" اختیار کر چکا تھا۔ بھٹو شہید تہذیبی رومانویت کا نظریہ رکھتے تھے تاہم اس وقت تک بھٹو کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی علیحدہ پارٹی بھی بنائیں گے۔ اس لئے انہوں نے ایک راستہ تو یہ سوچا کہ میاں ممتاز دولتانہ جیسے لوگوں کے ساتھ مل کر کونسل مسلم لیگ کو پھیلایا جائے اور وہ خود اس کی لیڈرشپ میں شامل ہو جائیں لیکن دولتانہ جیسے لیڈروں کو یہ بات ایک تو اس لئے قبول نہیں تھی کہ وہ کونسل مسلم لیگ کو عوامی تحریک میں بدلنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے اور دوسرے یہ کہ وہ بھٹو جیسے تیز طرار نوجوان کو سیکرٹری جنرل کا عہدہ دے کر اپنی لیڈرشپ کیلئے خطرہ پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

راولپنڈی سے لاہور تک ریل پر سفر کرنے اور پھر نواب امیر محمد خان کی دعوت میں جانے کے بعد بھٹو انگلینڈ روانہ ہو گئے اور ان انگریز افسروں اور لیڈروں کے خیالات کا مطالعہ اور تجزیہ کرتے رہے جو آج تک پاکستان کی سیاست کے آپ مرضی بنے ہوئے تھے اور پاکستان میں اپنا پسندیدہ کمپریڈار بورژوازی اور کمپریڈار بیوروکریسی کا طبقہ پیدا کر لینے کے باوجود امریکی انتظامیہ پاکستانی امور کے بارے میں اسی برطانوی انٹیلی جنس پر اعتبار کر رہی تھی جو سی آئی اے کے مطلوبہ مقاصد کی ٹھیکیداری بنی ہوئی تھی۔

برطانیہ میں چند ہفتے گزارنے اور اپنا مطالعاتی دورہ مکمل کرنے کے بعد بھٹو جب پاکستان واپس آئے تو انہوں نے لیگی لیڈروں کے ساتھ چند ایک ملاقاتوں کے بعد کونسل مسلم لیگ میں شامل ہونے کے ارادے ختم کر دیئے۔ انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی میں شامل ہونے کے امکان کا جائزہ لیا۔ میاں محمود علی قصوری کے ذریعے انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈروں کو اس پر رضامند کرنا چاہا کہ بھٹو کو پارٹی کے سیکرٹری جنرل کے عہدہ پر نامزد کر دیا جائے لیکن نیپ کے لیڈر انہیں چار آنے کی ممبر شپ سلپ دینے پر بھی تیار نہ تھے۔ نیپ میں بھٹو کی شمولیت پر بحث کرنے کیلئے پارٹی کا اجلاس 1967 میں محمود علی قصوری کی کوٹھی میں ہوا لیکن نیپ کے لیڈروں نے اس اجلاس میں بھٹو کو سامنے بٹھا کر ان کی جو تذلیل کی وہ انسانیت سے دشمنی کرنے کی ایک ناقابل فراموش مثال ہے اور تاریخ نے اس انسان دشمن رویئے کا جو جواب دیا وہ بھی ایک عمدہ مثال ہے کہ یہ نیپ تو عوام کے دلوں اور دماغوں سے غائب ہو گئی جبکہ بھٹو عوام کے سب سے بڑے ترقی پسند ہیرو بن گئے۔

بھٹو کا یہ جملہ آج بھی ہر سیاسی کارکن کو یاد ہے جو انہوں نے میاں محمود علی قصوری کی کوٹھی میں منعقدہ میٹنگ سے باہر نکلتے ہوئے کہا تھا "یاد رکھو 'لیفٹسٹو'! میں تمہاری گردن پر سوار ہو جاؤں گا۔" اور پھر ایک سال کے مختصر سے عرصے میں بھٹو ان سب لیفٹسٹوں کی گردن پر بھی سوار ہوئے اور رائٹسٹوں

www.bhutto.org

کے سروں پر بھی پیر رکھتے ہوئے گذر گئے لیکن یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بھٹو نے ملک کے اندر اور باہر اپنے سامراج دشمن کردار کو ایوب خان کا وزیر ہوتے ہوئے بھی منوالیا تھا۔ امریکی سامراج کے خلاف ان کے جو خیالات تھے ان کا پتہ ان کی کتاب "دی متھ آف انڈی پینڈنس" (آزادی ء موہوم) سے چل جاتا ہے جو اگرچہ اس وقت سامنے آئی جب بھٹو وزارت چھوڑ چکے تھے لیکن وزارت کے دوران امریکہ اور یورپ کے ساتھ بھٹو نے اپنی خط و کتابت میں جو کچھ لکھا وہ بھی "متھ آف انڈی پینڈنس" کے صفحات پر شائع ہونے والے اس تجزیہ کی بنیاد پر لکھا تھا جس میں بھٹو کہتے ہیں:۔

"بدلتے ہوئے حالات اور اس کے ہم نظیر جدید استعماریت کے تقاضوں کو زیادہ بڑی منڈیوں میں زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے کمیونزم کی دخل اندازیوں سے اپنا دفاع کرنے کیلئے برِ صغیر کی وحدت کی ضرورت تھی۔ یہ خدشہ محسوس کیا جاتا تھا کہ برِ صغیر کو تقسیم کرنا، تقسیم زر کے گنوانے کے مترادف ہوگا اور اس طرح خام مال کی وسیع منڈیوں تک رسائی میں رکاوٹ پیدا ہوگی اور روس کی برِ صغیر کو قابو میں رکھنے کی دیرینہ خواہش کے خلاف اس خطے کا دفاع کمزور ہو جائے گا۔ اس تشخیص کی بناء پر برطانویوں نے آخر دم تک تقسیم ہند کے خلاف کوشش کی۔"

شہید بھٹو کی مذکورہ کتاب کے اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ایوبی وزارت کے دوران پیپلز پارٹی بنا کر تحریک چلاتے ہوئے اور پھر وزیر اعظم کی حیثیت میں بار بار یہ بات کیوں کہی تھی کہ پاکستان برِ صغیر کا حصہ نہیں ہے اس کا ساتھی بھی نہیں ہے بلکہ یہ تو مشرقِ اوسط اور مغربی ایشیاء کا حصہ ہے اور اسی کا حلیف ہے جبکہ امریکہ اور یوروپ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ روس، چین اور مشرق بعید کے سوشلسٹ ملکوں کی حکومتوں اور تیسری دنیا میں پھوٹنے والی سوشلسٹ تحریکوں کے خلاف سب سے بڑا پولیس مین انڈیا کو بنایا جائے۔ بھٹو اس بات کو سمجھتے تھے کہ مغربی سامراج بھارت کو اپنا پولیس مین بنا کر پاکستان کو اس کی بالادستی میں دینا چاہتا ہے۔ اس کا ثبوت بھٹو کو ایوبی حکومت کے دوران عملی شکل میں مل گیا اور وہ یوں کہ 1958ء میں جب ایوب خان نے حکومت سنبھالی تو بھٹو نے اس کے ایک سینئر رکن کی حیثیت میں یہ دیکھ لیا تھا کہ امریکی اثر و رسوخ کس حد تک پھیلا ہوا ہے۔ خود ایوب حکومت کے اندر وزیر خزانہ محمد شعیب کی سربراہی میں ایک موثر لابی امریکی مفادات کے مطابق کام کر رہی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مصر، چین، برطانیہ اور آئرلینڈ کے دورے کر کے جب بھٹو مسئلۂ کشمیر کو اُبھارتے اور ان ملکوں کے بہت سے عناصر کی حمایت حاصل کر لیتے تھے تو اس میں امریکہ کی خوشی نہیں ہوتی تھی ہاں البتہ امریکہ یہ ضرور کہتا تھا کہ جب تک بھارت اس کا مکمل پولیس مین نہیں بنتا تب تک پاکستان کی طرف سے مسئلۂ کشمیر کو اٹھانا بھارت کو تنگ کرنے اور دباؤ کیلئے قبول کر لیا جائے لیکن جب بھٹو نے روس کی طرف سے بھی مسئلۂ کشمیر کی حمایت حاصل کر لی تو امریکیوں کو بھی اتنی ہی تکلیف پہنچی تھی جتنی کہ بھارت کو، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ

www.bhutto.org

ایوبی دور میں ہی امریکہ کے عالمی سفیر ہیری مین نے پاکستان اور بھارت کی دوستی کیلئے دونوں ملکوں کا دورہ کیا تھا اور یہ منصوبہ بنا تھا کہ ایوب خان اور پنڈت نہرو کی ملاقات میں یہ معاملہ بالائی سطح پر ہی طے کرا دیا جائے لیکن بھٹو نے کمال دانش مندی سے یہ ترکیب ناکام بنا دی اور ایوب خان کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ سربراہی ملاقات سے پہلے پاکستان اور بھارت کے وزیروں کے مذاکرات ہونے چاہئیں اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ 1962ء میں جب لداخ کے سرحدی جھگڑے کی وجہ سے چین اور بھارت میں جھڑپیں شروع ہو گئیں تو ایوب خان سوات میں گالف کھیل رہے تھے لیکن بھٹو نے خود سوات جا کر ان سے کہا کہ اس وقت ایک سنہری موقع ہے ہم اب بھی کشمیر میں فوجی اقدام کریں تو کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایوب نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ بھٹو کو اس بے حسی کا بڑا صدمہ ہوا۔ انہوں نے ایوب خان کے خلاف میدان میں آنے کا ارادہ بھی کر لیا لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ یہ ایوب خان جو کہ بھارت کو مشترکہ دفاع کا منصوبہ پیش کر چکا ہے میرے حکومت سے چلے جانے کے بعد اس کے آگے اور بھی جھک سکتا ہے جبکہ میرے پاس فی الحال ایسی مقبولیت اور تحریک موجود نہیں ہے کہ اسے روک سکوں۔ ایوب کو انہوں نے چھوڑا ضرور لیکن عین اس وقت جب وہ اپنی مقبولیت کو مستحکم کر چکے تھے اور پھر اسی مقبولیت کو انہوں نے ایک تحریک میں بدل دیا۔ بھٹو ایک طے شدہ حکمت عملی پر کام کر رہے تھے اور ایوب کی حکومت میں شامل ہونا اور پھر اسے چھوڑ دینا ان کی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا۔ بھٹو نے اپنی سیاست کی فلسفیانہ بنیاد کو واضح کرتے ہوئے جو بات اپنی کتاب "متھ آف انڈی پینڈنس" میں کہی تھی وہی اپنی آخری کتاب "اِف آئی ایم اسیسی نیٹڈ" (اگر مجھے قتل کیا گیا) میں لکھ دی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔

"جب میں امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو ایک بار میرے والد نے مجھے کتابوں کا ایک بڑا پیکٹ تحفے کے طور پر بھیجا۔ ان کتابوں میں ایک طرف تو نپولین کی سوانح عمری پر مشتمل بڑی بڑی اور مہنگی کتابیں تھیں لیکن دوسری طرف ایک بہت ہی سستی کتاب تھی جو ایک مینی فیسٹو پر مشتمل تھی اور اس کے ماتھے پر لکھا تھا "دنیا بھر کے مزدورو ایک ہو جاؤ۔"

ترقی پسند سیاست کا ہر طالبعلم جانتا ہے کہ مزدوروں کو مخاطب کرتا ہوا یہ جملہ ایک ہی مینی فیسٹو میں درج ہے اور وہ ہے کارل مارکس اور فیڈرک اینگلس کا لکھا ہوا کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو۔ بھٹو نے "اِف آئی ایم اسیسی نیٹڈ" میں لکھا ہے کہ نپولین کی جو سوانح عمری پڑھی تھی وہ تو میں بھول گیا ہوں لیکن مزدوروں کی یہ کتاب آج بھی یاد ہے اور یہ کتاب جو بھٹو کو پھانسی کی کوٹھڑی میں بھی یاد تھی ان کی جوانی کی سیاست میں بھی ایک بنیادی فلسفے کا کردار ادا کرتی رہی۔ اس کا ثبوت یہ بھی ملتا ہے کہ 1948ء میں جب وہ طالبعلم تھے تو کیلیفورنیا یونیورسٹی کی لاس اینجلز شاخ میں "اسلام کی تہذیبی میراث" کے عنوان پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ اسلامی ممالک کو اسلامی سوشلزم کا راستہ اپنانا چاہئے۔ اپنی فلاسفی کے بارے میں بھٹو نے دوسری بات یہ لکھی کہ ان کے ذہن میں رومانویت کا وہ اثر بھی موجود ہے جو

www.bhutto.org

لینن میں تھا اور تیسری بات یہ کہ بھٹو نے سوشلزم تک پہنچنے کیلئے سوشل ڈیموکریسی کا مرحلہ طے کرنے کی حکمت عملی بنالی تھی۔ یہی وہ تین فلسفیانہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے بھٹو انوکھے وزیر اور پھر عوامی لیڈر بنے اور ایک بین الاقوامی اسٹیٹسمین کے درجے پر پہنچے۔

www.bhutto.org

نظریاتی بنیادیں

جب عوامی نیشنل پارٹی نے بھٹو کو اپنی لیڈر شپ میں شامل کرنا خطرے کی بات سمجھا تو بھٹو نے اپنی علیحدہ پارٹی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے سیاسی تجزیہ نگاروں' صحافیوں' دانشوروں' وکیلوں' سیاسی کارکنوں' مزدور لیڈروں اور خصوصی طور پر طالبعلم رہنماؤں سے باتیں اور ساتھ ساتھ جلسے منعقد کرنا شروع کر دیئے جبکہ دوسری طرف بائیں اور دائیں بازو کے اصطلاحوں اور روایات کے اسیر سیاستدان بھٹو کی ان تمام سرگرمیوں کو محض ایک کھلنڈرے وزیر کا وقتی تماشہ سمجھتے رہے۔ ان بڈھے سیاستدانوں کو کبھی اس حقیقت کا پتہ نہیں چلا کہ تاریخ کوئی بانجھ عورت نہیں ہوتی۔ اس کی کوکھ سے ہمیشہ نئی اقتصادیات' نئی سیاست' نئے ثقافتی دھارے اور نئے لیڈر جنم لیتے رہتے ہیں جن کے چلن بھی نئے ہوتے ہیں' بھتن بھی نئے ہوتے ہیں' انداز اور لہجے بھی۔ ان کے میسجز بھی نئے ہوتے ہیں اور پرفارمنس بھی۔ بھٹو' ان تمام نئے رُخوں' نئی سمتوں اور نئے طریقِ عمل کو اپناتے ہوئے نئی تدبیریں اور نئی ترکیبیں اختیار کرتے جا رہے تھے اور یہ پرانے لیڈروں کی عقل سے بہت آگے کے کام تھے۔

ایوبی دور میں تعلیمی اداروں سے یونیورسٹی آرڈی ننس کے خلاف جگہ جگہ نوجوانوں کی تحریک پھوٹ پڑی تھی۔ جس کا سلسلہ خیبر سے چٹاگانگ تک چل رہا تھا۔ طالبعلموں کے جلسے جلوس ایک معمول بن چکے تھے بار بار طلباء کی گرفتاریاں ہوتی تھیں۔ ایوب خان کے وزیر کی حیثیت میں بھٹو نے طلباء کو بحث مباحثوں اور مناظروں کا چیلنج بھی دے دیا تھا اور طالبعلموں میں ان کے خلاف غم و غصہ بھی پیدا ہوا تھا لیکن

www.bhutto.org

یہی وزیر جب ایوب خان سے علیحدہ ہو کر آیا تو لاہور ریلوے اسٹیشن پر اس کے استقبال میں سب سے زیادہ تعداد بھی ناراض نسل کے انہی نوجوانوں کی تھی جو طالبعلم تحریک میں سرگرم رہتے تھے۔ وہی ذوالفقار علی بھٹو جو ایوبی دور میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرپرست بنے تھے اور 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران بھارت کے خلاف طلباء کے مظاہروں کی سرپرستی کر رہے تھے اب معاہدہ ء تاشقند کے خلاف انہی طلباء کے جوش و جذبہ کی قیادت کرنے لگے۔ بھٹو نے پیپلز پارٹی قائم کرنے سے پہلے سب سے زیادہ توجہ طالبعلموں کی تحریک پر دی تھی۔ ایوبی وزارت چھوڑنے اور 20 جون 1967ء کو ریل کے ذریعہ لاہور آنے کے بعد فلیٹیز ہوٹل وائی ایم سی اے ہال اور ملک معراج خالد کے لکشمی مینشن کے فلیٹ میں جن جلسوں سے بھٹو نے خطاب کیا ان کا انتظام مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور خصوصی طور پر اسلامیہ کالج سول لائنز کی اسٹوڈنٹس یونین کے عہدیداروں نے ہی کیا تھا جن میں افتخار شیخ اور راشد بٹ پیش پیش تھے جبکہ بھٹو کے ساتھ ملک غلام مصطفیٰ کھر، میر رسول بخش تالپور اور ملک معراج خالد شامل تھے۔ ان چھوٹے جلسوں کے بعد فیصل آباد میں مختار رانا کی پیپلز اکیڈیمی کے طالبعلم بھٹو کے ساتھ شامل ہو گئے اور بوہائینز ریسٹورنٹ شاہراہ قائداعظم لاہور اور گول باغ (جسے بعد ازاں بھٹو نے مصر کے سربراہ جمال عبدالناصر کے نام پر ناصر باغ کا نام دے دیا) میں بھی طالبعلم ہی زیادہ سرگرم تھے۔ انہی دنوں میں بھٹو نے نئی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا جس کے بارے میں ابتدائی بات چیت ملک معراج خالد کے گھر میں ہوئی۔ انہی دنوں پانچ روپے کے ایک نوٹ پر دستخط کر کے بھٹو نے یہ نوٹ اسلامیہ کالج سول لائنز کے ایک طالبعلم لیڈر افتخار شیخ کو دیا اور کہا کہ میری طرف سے یہ پیغام لے جاؤ اور ترقی پسند لیڈروں سے بات کرو۔ اسی نوٹ کے حوالے سے یہ طالبعلم بھٹو کا پیغام لے کر مولانا بھاشانی کے پاس بھی پہنچے تھے۔ بھٹو نے اپنے سوشلسٹ کردار کی وضاحت بھی انہی دنوں کر دی جبکہ پولیس نے ان کا ساتھ دینے والے نوجوانوں پر تشدد شروع کیا انہوں نے پولیس کو سامراجی قوتوں میں شمار کرتے ہوئے کہا " سامراجی قوتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ ہے تو بہادروں کی طرح موت کو گلے لگا لینا لیکن میدان خالی نہ چھوڑنا۔ "

پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کیلئے ابتدائی کنونشن 30 نومبر 1967ء کو ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر 4۔ کے گلبرگ، لاہور میں منعقد ہوا اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پلیٹ فارم پر عوام سے خطاب کرنے والے بھٹو اب پاکستان پیپلز پارٹی کے کنوینر بن گئے۔ جس کے پہلے کنونشن میں اس کے چار بنیادی اصول وضع کر دیئے گئے تھے۔

(1) اسلام ہمارا دین ہے۔

(2) جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

(3) سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

(4) طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

30 نومبر اور یکم دسمبر 1967ء کے اس کنونشن میں مسلح افواج اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جو قرار دادیں منظور کی گئیں ان کا واحد مقصد یہ تھا کہ قوم کو جس نقطہ نظر کے ساتھ ایوب خان اور سکندر مرزا نے استعمال کر کے مارشل لاء کا کل پرزہ بنا دیا ہے اس نقطہ نظر کی نفی کی جائے۔ علاوہ ازیں ان قرار دادوں میں چین، ایران، انڈونیشیا، ترکی اور اردن کا اس بنیاد پر شکریہ ادا کیا گیا کہ ان ملکوں نے 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔ ان قرار دادوں سے ایک طرف تو شیخ مجیب کے بنیادی فلسفے کی وضاحت ہو گئی اور دوسری طرف بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں ان کی حکمت عملی کی نشاندہی بھی کر دی گئی۔ کنونشن میں کشمیر کے بارے میں منظور کی جانے والی قرار داد میں کہا گیا کہ "ساری مفاہمتی کوششوں اور اقوام متحدہ کی قرار دادوں اور سمجھوتوں کے باوجود کشمیر کے عوام اپنے حق خود اختیاری سے محروم ہیں۔ ریاست کا بڑا حصہ اب بھی ہندوستان کے غیر قانونی قبضے میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ کنونشن اعلان کرتا ہے کہ جموں و کشمیر کے مسئلے کا اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے کہ اس مسئلہ کو حق خود اختیاری کی بنیاد پر حل کیا جائے۔ جیسا کہ پاکستان، ہندوستان اور اقوام متحدہ نے تسلیم کیا ہوا ہے۔ یہ کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ ہماری حکومت تنازعہ کشمیر کے مسئلے کے حل کو ہندوستان کے ساتھ تعلقات کیلئے اولین شرط قرار دے اور حق خود اختیاری کے اصول پر کسی بھی رُو رعایت سے صاف انکار کر دے۔" اس کے بعد آسام کے بارے میں منظور کی جانے والی قرار داد میں کہا گیا کہ "آسام کا صوبہ جہاں آبادی کی اکثریت حصہ غیر ہندو تھی اور جو پاکستان کا لازمی جزو بننا چاہیے تھا جیسا کہ تقسیم سے پہلے مسلم لیگ نے مطالبہ کیا تھا مگر ریڈ کلف کے غیر منصفانہ ایوارڈ کی رُو سے پاکستان کو آسام کا ایک مختصر سا حصہ یعنی صرف سلہٹ ضلع کا حصہ۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ آبادی کا اکثر حصہ خود مختار ہونے کا خواہش مند ہے۔ اس کنونشن کی رائے میں حکومت پاکستان کو آسام کی ریاست اور اس کے عوام سے خصوصی تعلقات قائم کرنے چاہئیں۔"

فوجی معاہدات کے بارے میں منظور کی جانے والی قرار داد میں کہا گیا تھا کہ سیٹو اور سینٹو کے دفاعی معاہدات نے اس وقت جبکہ ضرورت تھی پاکستان کی سلامتی اور تحفظ میں کوئی معاونت نہیں کی۔ یہ پاکستان کیلئے یکطرفہ ذمہ داریوں کا سبب بن گئے ہیں اس لئے پاکستان کو یہ قانونی حق پہنچتا ہے کہ خود کو ان کا پابند خیال نہ کرے۔ یہ کنونشن حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ سیٹو اور سینٹو کو بلا تاخیر چھوڑ دیا جائے امریکہ سے باہمی دفاع کے معاہدوں کا آئینی جواز اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب امریکہ ہندوستان سے جنگ کے دوران ہماری مدد کرنے میں ناکام رہا اور فوجی امداد بند کی۔ اب اس کی کوئی وجہ باقی نہیں کہ امریکہ کے پاس پشاور کے نزدیک فوجی اڈہ برقرار رکھنے کی سہولت موجود رہے۔ یہ کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت اعلان کر دے کہ امریکہ کے ساتھ باہمی دفاعی معاہدے کا انعدام کرنے کا اعلان کر دے اور پشاور کے نزدیک کا فوجی اڈہ امریکہ سے واپس لے لیا جائے۔

ان قراردادوں سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان کو برصغیر کے خاندان میں جونیئر پارٹنر نہیں بننے دے گی اور اسے امریکی مفادات کی خاطر سوشلسٹ بلاک کے خلاف استعمال بھی نہیں ہونے دے گی اور بھارت کی بالادستی بھی قبول نہیں کرے گی۔

اقتصادی حوالے سے پاکستان کے مسائل کو دیکھتے ہوئے اس کنونشن میں سب سے کاری وار جاگیرداری پر کیا گیا اور اس کے خلاف قرارداد منظور کی گئی۔ قرارداد میں کہا گیا تھا " یہ کنونشن اعلان کرتا ہے کہ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ استحصال کو ختم کرنا انتہائی ضروری ہے اور مؤثر انداز میں اس مقصد کا حصول سوشلسٹ اصولوں کے اطلاق سے ہی ممکن ہے۔ جب تک ایسا نہ کیا گیا عوام کی حالت زبوں کو بہتر نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت ایسے احکامات جاری کرے کہ آئندہ ساری سرکاری زمینیں کاشتکاروں کیلئے محفوظ ہوں گی اور انہی میں تقسیم کی جائیں گی۔ یہ کنونشن سفارش کرتا ہے کہ جن کاشتکاروں کے پاس گزارہ یونٹ سے کم زمینیں ہیں انہیں مالیہ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ یہ کنونشن حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ کھیت مزدوروں کیلئے کم از کم اُجرت کا تعین کیا جائے جو کہ گزارے کی سطح سے ہرگز کم نہ ہو اور ان کیلئے زیادہ سے زیادہ کام کے گھنٹوں کا بھی تعین کیا جائے یہ کنونشن حکومت سے سفارش کرتا ہے کہ وہ رضاکارانہ بنیاد پر کوآپریٹو فارمنگ کی حوصلہ افزائی کیلئے مثبت اقدام کرے۔ "

صنعتی کارکنوں کے حقوق کے حوالے سے جو قرارداد اس کنونشن میں منظور کی گئی اس میں کہا گیا تھا کہ " پاکستان کے مزدور طبقہ کو ان سارے حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے جو بین الاقوامی معیار کے مطابق معمول بن چکے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی حالت بہتر بنانے میں بے بس ہیں۔ یہ کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ

ٹریڈ یونین ایکٹ میں آئی ایل او کے معیار کے مطابق ترمیم کی جائے۔

لیبر یونین بنانے کے حق اور ہڑتال کرنے کے حق کو واضح طور پر تسلیم کیا جائے۔

کم عمر بچوں کو ملازم رکھنے کا طریقہ جو ابھی تک چل رہا ہے اسے فوری طور پر ختم کیا جائے۔

بنیادی شہری حقوق کے بارے میں کنونشن کی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ " پاکستان کے عوام کو آج وہ حقوق حاصل نہیں جو جمہوریت کا لازمی جُز ہیں۔ ان کی آزادیاں اس طرح سلب کر لی گئی ہیں کہ درحقیقت انہیں آزادیء تقریر، آزادی تحریر اور اجتماع کی آزادی اور جماعتیں بنانے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ مزید برآں پریس کو اس طرح کنٹرول کر لیا گیا ہے کہ رائے عامہ کو دبا دیا جائے۔ ان ساری سیاسی جماعتوں کا جو جمہوریت سے پیار کرتی ہیں۔ یہ فوری فرض ہے کہ وہ بنیادی حقوق کیلئے کوشاں ہوں۔ یہ کنونشن اپوزیشن کی ساری جماعتوں سے استدعا کرتا ہے کہ وہ عوام کے ان بنیادی حقوق کے حصول کیلئے جو ان سے چھن گئے ہیں، باہمی تعاون کریں۔ "

ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت پاکستانی شہریوں کے سیاسی اور معاشی حقوق پر جو پابندی لگائی گئی

www.bhutto.org

قوانین کو منسوخ کیا جائے جو طلباء اور اساتذہ کی آزادانہ زندگی پر پابندی عائد کرتے ہوں۔"

سامراجی پالیسیوں کے بارے میں پیپلز پارٹی کی پالیسی بناتے ہوئے ویت نام کے بارے میں جو قرارداد منظور کی گئی اس میں کہا گیا تھا کہ "یہ کنونشن ویت نام کے عوام کو ان کے بے مثال جہادِ حریت کیلئے خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ وہ پچھلی دو دہائیوں سے اپنی آزادی کیلئے برسرپیکار ہیں اور آج بھی دنیا کی عظیم ترین فوجی قوت کے خلاف اپنی آزادی کی حفاظت کیلئے لڑ رہے ہیں اگرچہ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے ہیں لیکن ان کے آزاد رہنے کیلئے ان کے عزم میں کبھی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ اپنی جانثاری سے انہوں نے دنیا بھر کے محکوم لوگوں کی جنگِ آزادی میں بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ کنونشن ضمیرِ انسانیت کو جھنجھوڑتا ہے کہ وہ ویت نام کی ستم زدہ سرزمین کو امن کی نعمت دیں۔ سب سے پہلے جو قدم اٹھانا ضروری ہے وہ یہ کہ شمالی ویت نام پر غیر مشروط طور سے بمباری بند کر دی جائے۔ یہ بمباری اقوامِ عالم کے قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہے پھر امن کا قیام اس طرح ممکن ہے کہ جنیوا سمجھوتے کا احترام کیا جائے جو آخری سمجھوتے کیلئے بنیاد بن سکتا ہے۔

مشرقِ اوسط کے بارے میں جو قرارداد اس کنونشن میں منظور کی گئی اس میں کہا گیا کہ اسرائیل ان عرب علاقوں پر بھی قابض چلا آرہا ہے جو اس نے عرب علاقوں پر غدارانہ حملے کر کے حاصل کئے تھے۔ اس وحشت ناک جارحیت اور ظلم کا تدارک کرنے میں اقوامِ متحدہ نے ایک دفعہ پھر اپنی بے بسی ثابت کر دی ہے۔ یہ کنونشن اسرائیل کی جارحانہ اور نو آبادیاتی پالیسی کی مذمت کرتا ہے اور صدر ناصر کے 24 نومبر 1967ء کے بیان کو بنظرِ تحسین دیکھتا ہے کہ اگر اسرائیل سے مقبوضہ علاقوں کو بات چیت کے ذریعے خالی نہیں کرایا جا سکتا تو پھر اس مقصد کیلئے طاقت استعمال کی جائے گی۔

تیسری دنیا کے استحکام کے لئے جو قرارداد اس کنونشن میں منظور ہوئی اس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی ان اقوام کے گنبد سے وابستہ ہے جو سامراجی قوتوں کے چنگل میں پھنسا رہا ہے اور جس کے بُرے اثرات کا یہ ابھی تک شکار ہو رہے ہیں۔ گو اب وہ سیاسی طور پر آزاد ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک ایک کمزور معیشت کی زبوں حالی تلے دبے ہوئی ہیں۔ طاقتور صنعتی قوتوں کے جدید نو آبادیاتی دباؤ اور اندرونی معاملات میں دخل اندازی نے ان ترقی پذیر ممالک کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ یہ ترقی پذیر ممالک باہمی یگانگت اور استحکام پیدا کر کے ہی اپنے مفادات کا تحفظ کر سکتے ہیں اور اس صورت میں ہی بین الاقوامی معاملات میں ایک تیسری قوت کا موثر کردار ادا کر سکتے ہیں کہ بڑی طاقتوں کی پیدا کردہ فرمانروائی میں کسی کا بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیں۔ یہ کنونشن اعلان کرتا ہے کہ پاکستان تیسری دنیا کے استحکام کو مضبوط کرے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ آزادی کی نعمت سے سرفراز ہو اور اپنی حکومت بیرونی دخل اندازی کے بغیر خود چنے یہ کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی حق خود اختیاری اور اندرونی معاملات میں دخل نہ دینے کے دو اصولوں پر سختی سے کاربند رہے۔

www.bhutto.org

تھی اسے ختم کرانے کیلئے جو قرارداد منظور کی گئی اس میں کہا گیا کہ یہ کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کو فوری طور پر واپس لیا جائے۔ ہنگامی حالت کو گزرے ہوئے عرصہ گذر چکا ہے اور اب بھی اگر اس کو برقرار رکھا جا رہا ہے تو صرف اس لئے کہ عوام کو آزادیوں سے محروم رکھا جائے اور تمام عدالتی طریق کار میں مداخلت کی جائے۔

آزاد کشمیر میں جمہوریت کی بحالی کیلئے منظور کی جانے والی قرارداد کا متن یہ تھا "یہ کنونشن آزاد جموں و کشمیر ایکٹ 1964ء کی مذمت کرتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر آزاد جموں و کشمیر کی حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا اور مطالبہ کرتا ہے کہ اس ایکٹ کو واپس لیا جائے اور آزاد کشمیر میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرائے جائیں تاکہ کشمیریوں کے ہر گروہ کو بشمول پناہ گزینوں کے نمائندگی کا یقین ہو۔"

حکومتی تشدد کے بارے میں جو قرارداد منظور کی گئی اس کا متن یہ تھا کہ یہ کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت معاوضہ ادا کرے۔

(1) ان مرحومین کے پسماندگان کو جو شکار ہو گئے حکومت کے جبر و ظلم کی ان کارروائیوں کا جو طلباء، مظاہرین، مزدوروں، کسانوں اور دوسرے لوگوں کے خلاف کی گئیں جو اپنے حقوق سے محرومی پر احتجاج کر رہے تھے۔

(2) جو سیاسی وجوہ کی بناء پر ظلم و جبر کے شکار بنائے گئے۔

تعلیمی آزادی کے بارے میں جو قرارداد منظور کی گئی اس کا متن یہ تھا کہ "نوجوان ہی پاکستان کا سب سے قیمتی اور عزیز سرمایہ ہیں۔ وہ ماحول جس میں اُن کی تعلیم و تربیت کی جاتی ہے اُن کی شخصیت کی مکمل نشوونما میں معاون ہونا چاہئے۔ علم اور قوتِ ایجاد کے ذریعے آزادی کا حصول صرف آزاد تعلیمی ماحول سے ہی ممکن ہے۔ یونیورسٹیاں، علماء اور فضلاء کے ان قلعوں کی طرح ہونی چاہئیں جو ہر ایسی پابندی سے آزاد ہوں جو سچے تصورات پر قدغن لگائے یا آزادانہ جولانیٔ خیال میں رکاوٹ بنے۔ یہ کنونشن ان حالات پر گہرے فکر کا اظہار کرتا ہے جو ایسے قوانین اور آرڈیننسوں کے وجود نے پیدا کر دیئے ہیں۔ جن کی وجہ سے نوجوانوں کیلئے آسانی سے پڑھنا مشکل ہے اور نہ ہی طلباء کیلئے یہ ممکن ہے کہ "غور و فکر کرنا" جولانیٔ خیال کرنا اور حقِ تعلیم سے پورا فائدہ اٹھانا۔ یونیورسٹی حکام کو وسیع اختیارات حاصل ہیں کہ وہ سرکاری نظریات سے انحراف کرنے والے طلباء و اساتذہ کے خلاف جبر کی کارروائیاں جاری رکھیں اس طرح نے تعلیمی ماحول کو اور تعلیمی آزادی کو ایک مذاق بنا دیا ہے۔ طلباء کو تعلیمی اداروں سے نکالا جا سکتا ہے۔ غیر قانونی اور من مانے طریقوں سے ان کے تبادلے اور ڈگریاں ضبط کی جا سکتی ہیں۔ یونیورسٹی یونین اور سرگرمیوں کی تشکیل ناممکن ہو گئی ہے سوائے ان کے جن کی منظوری یونیورسٹی کے خوشامدی اور چاپلوس حکام سے حاصل کی جا سکے۔ نوجوانوں کو تشدد کا شکار کرنا، وحشت زدہ کرنا اور ڈرانے دھمکانے کے واقعات کا دور دورہ ہے۔ اس لئے یہ کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ یونیورسٹی آرڈیننس اور دوسرے سیاہ سے

www.bhutto.org

ان قراردادوں کے علاوہ ترکی اور قبرص کے تنازعے میں قبرصی ترکوں کے حقوق کی حمایت کی گئی۔

ملکی ذرائع ابلاغ کے متعلق منظور ہونے والی قرارداد میں غیر جمہوری قوانین اور انتظامی احکامات کے بارے میں کہا گیا کہ پاکستان میں پریس کی آزادی غیر جمہوری قوانین اور احکامات نے محدود کر رکھی ہے اور اخبارات کی اکثریت پر حکومت نے پریس ٹرسٹ کے ذریعہ عملاً کنٹرول کر رکھا ہے۔ اس طرح حکومت اپنا پروپیگنڈہ جاری رکھے ہوئے ہے اور رائے عامہ کو بری طرح دبایا ہوا ہے۔ اس لئے یہ کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ پریس ٹرسٹ کو ختم کیا جائے اور تمام قوانین منسوخ کر دیئے جائیں جو پریس کی آزادی کو سلب کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اقلیتوں کو اکثریت کے برابر سماجی حیثیت دینے کی حمایت میں بھی قرارداد منظور کی گئی۔ سرکاری ملازمین کے حقوق کی مکمل حمایت کرتے ہوئے ایک قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ سرکاری ملازمین کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے اور مہاجرین کے حقوق کے متعلق قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ ان کی آباد کاری کا کام بلا تاخیر مکمل کیا جائے۔

مذکورہ بالا تمام قراردادوں کا تجزیہ کیا جائے تو شہید بھٹو کی بنیادی تصورات کا پتہ چل جاتا ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک عوام دوست لیڈر تھے۔ انہوں نے سامراج دشمنی اور جذبۂ آزادی کو پاکستانی محنت کشوں کے گھر گھر میں پھیلا دیا تھا اور محنت کش طبقوں کی تحریک کو ایک طوفان کی طرح متحرک کر دیا تھا اور اس مقصد کیلئے معاشی شعور کے ساتھ انہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، شہباز قلندرؒ، مادھو لعل حسینؒ، بلھے شاہؒ اور جام درک، خواجہ فریدؒ اور وارث شاہؒ جیسے صوفیاء کی روحانیت کے فلسفہ کو بنیاد بنایا تھا۔ یہاں اس سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے کہ شہید بھٹو حکومت قائم کر لینے کے بعد اپنی پارٹی کے منشور کی مذکورہ بالا قراردادوں اور روحانی فلسفہ پر مکمل طور پر عمل کیوں نہ کر سکے؟ اس سوال کا جواب صرف اس حقیقت سے مل جاتا ہے کہ جتنی مختصر مدت میں انہوں نے عوام کو متحرک کیا اور جتنی مختصر مدت میں شہید بھٹو نے ان نظریات کو عوام میں پھیلایا اتنی مدت میں پارٹی کی ایسی تنظیم کرنا ممکن نہیں تھا جو اس منشور پر مکمل طور پر عمل کروا سکتی اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اگر شہید بھٹو 1970ء کے الیکشن میں حصہ نہ لیتے تو ممکن ہے یہ تحریک تاریخی تقاضوں سے بالکل پیچھے رہ جاتی لیکن دوسری طرف یہ بھی امر واقعہ ہے کہ الیکشن میں حصہ لے کر جو ساتھی انہیں ملے تھے ان کی اکثریت مفاد پرستوں اور اسٹیبلشمنٹ کے حامیوں پر مشتمل تھی۔

ان حالات میں جب بھٹو نے 1970ء کے الیکشن جیت کر حکومت بنائی تو انہیں اپنی نومولود اور نوعمر پارٹی کے لیڈروں اور اس میں گھسی ہوئی موقع پرست قیادت کی وجہ سے یہ سوچنا پڑ گیا کہ اب اگر موقع پرست قیادت کی جگہ کلی طور پر منظم ترقی پسند قیادت کو لانے کی کوشش کی جائے تو اس میں وقت بھی بہت زیادہ لگتا ہے اور اس طویل وقت میں پارٹی کا پھیلاؤ بھی رک جاتا ہے کیونکہ حکمران طبقات تشدد کے ذریعہ پیپلز پارٹی کو کچل دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسی باعث انہوں نے بہت پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پیپلز پارٹی کو ایک ملی

www.bhutto.org

کلاس پارٹی کے طور پر چلایا جائے اور 1970ء کے انتخابات میں حصہ لینے کیلئے بھی پاپولسٹ سیاستدانوں کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ 1970ء کے انتخابات میں حصہ لینے کے بارے میں جو فیصلہ پیپلز پارٹی کی ہالہ کانفرنس میں ہوا تھا اس کا ذکر تو ہم آگے چل کر کریں گے لیکن اس وقت یہ بتانا ضروری ہے کہ سوشلزم کے بارے میں پارٹی نے اپنے پہلے بنیادی کنونشن میں جو تھیسس پیش کیا تھا وہ کیا ہے اور اس تھیسس کے مطابق نئی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیوں کیا گیا تھا؟

پہلے کنونشن میں اس سوال کا جواب دیا گیا تھا کہ اسلامی مملکتِ پاکستان میں اسلامی سوشلزم کیوں ضروری ہے؟ اس عنوان پر کنونشن میں جو تھیسس پیش کیا گیا اس میں کہا گیا کہ "پیپلز پارٹی کے مقصد کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یہ کہنا کافی ہوگا کہ اسلامی مملکتِ پاکستان میں (مسلمانوں کے نظریہء انصاف کے تحت) سوشلسٹ نظام رائج کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس پارٹی کا مقصد یہ ٹھہرا کہ یہاں ایک ایسی عوامی جمہوریت قائم کی جائے جس سے ملک کے تمام افراد کو ہر شعبہء زندگی میں مساوی حقوق حاصل ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ جمہوریت میں قانون کی نگاہوں میں سب کی برابری ضروری ہے لیکن یہ مساوات نامکمل رہ جاتی ہے جب تک کہ کسی جمہوری نظام میں معاشی و معاشرتی عدل و انصاف کی بنیاد پر سب کے حقوق مساوی نہ ہوں۔ اس لئے سوشلسٹ معیشت ہی ایک ایسا نظام ہے جو کہ تمام افراد کیلئے یکساں مواقع پیدا کرتا ہے اور ان کو معاشی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رکھتا ہے۔ طبقاتی کشمکش اور اس کے ساتھ وابستہ قید و بند سے آزاد کرتا ہے۔ ایسا نظام ہی معاشی اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو بروئے کار لا کر صحیح اقدار کو ان کے منطقی عروج تک پہنچا سکتا ہے اور ان کو ٹھوس سماجی اور معاشرتی بہبود کی عملی اشکال میں ظاہر کرتا ہے سوشلزم کے معاشی نظریئے اور اصول پچھلی دو صدیوں کے تجربات کے نتیجے میں اخذ کئے گئے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام پیداوار سے حاصل کردہ علم کے ساتھ ساتھ ہماری معلومات میں بیش بہا اضافہ ان تجربات سے بھی ہوا جو ان ممالک میں کئے گئے جہاں سوشلزم کے اصولوں کو مختلف مقامی حالات میں عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ ان ملکوں کے علاوہ جو انقلاب کی منزلیں طے کر چکے ہیں' کئی ایسے ملکوں میں بھی جہاں بظاہر آئینی بادشاہتیں ہیں سوشلسٹ اصلاحات سود مند طریقوں سے رائج کی گئی ہیں حالانکہ ان معاشروں میں کوئی انقلابی سیاسی یا سماجی ردوبدل نہیں کیا گیا۔ سوشلسٹ معیشت کا ارتقاء کسی ایک برِاعظم' عقیدے' معاشرے یا کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں بلکہ یہ عالمگیر نظامِ معاشرت ہے۔ اس نظام کے اصولوں کی عالمگیر حیثیت ان دو وجوہ کی بناء پر ہے۔

(1) حقیقی سوشلزم کی بنیادیں ٹھوس مادی حقیقتوں پر قائم ہیں۔ یہ اصول محض خوش فہمی یا ناقابلِ حصول خواہشات پر مبنی نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا مقصد کسی کی خود ساختہ تمناؤں اور امیدوں کو تسکین دینا ہے۔ ان اصولوں کی بنیاد تو سائینٹیفک تجزیئے اور تحقیق پر ہے جو کہ ایک لمبے عرصے سے انسان کی معاشی

www.bhutto.org

کشمکش اور معاشرتی تبدیلیوں کے علم سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کا مقصد اس دنیوی زندگی میں عمل کے تمام پہلوؤں کو احسن طریق پر استعمال کر کے بہترین معاشرہ قائم کرنا ہے۔

(2) حقیقی سوشلزم کا نظریۂ فکر دنیا کے ہر گوشے اور ہر ملک کیلئے ایک پیغام کی حیثیت رکھتا ہے چاہے وہ ملک یا خطہ کیسے ہی معاشی یا سیاسی دَور سے گذر رہا ہو۔ سوشلزم محض پیغام ہی نہیں بلکہ مسلسل عمل کا راستہ ہے۔ دنیا کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے تمام ملکوں کو تین گروہوں میں با آسانی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پیپلز پارٹی کے دانشوروں نے اس دَور میں اپنے ان تجزیوں کے حوالے سے جو بحثیں کیں ان کی تفصیل بھی ساتھ دے رہا ہوں۔

(الف) وہ ملک جو سرمایہ دارانہ معاشی نظام کے علمبردار ہیں اور مادی لحاظ سے بظاہر ترقی کی عروج پر ہیں۔

(ب) وہ ملک جنھوں نے سوشلزم کو اپنایا ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ (یہاں ایک امر کی وضاحت ضروری ہے کہ بھٹو شہید نے ہر چند سوشلزم کی اصطلاح کا بار بار استعمال کیا لیکن ان کے پیشِ نظر اس کے سوویت، چینی، مشرقی یورپی، لاطینی امریکی یا ایشیائی ماڈل کبھی نہیں رہے۔ ان کا سوشلزم کا تصور اپنا تھا جس کے ذریعے اسلامی عدل و انصاف جمہوری آزادیوں اور معاشی مساوات پر مبنی ایک متوازن معاشرے کا قیام مقصود تھا۔ ان کا یہ تصور سکینڈے نیویائی ملکوں کے سوشلزم سے زیادہ قریب تھا تاہم اسلامی تصورات اور اصولوں کی کارفرمائی کی بناء پر ان سے مختلف بھی تھا لیکن پاکستان کے مارکسی ملاؤں کے نظریات سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پارٹی کے اندر اور باہر نکسالی قسم کے سوشلسٹوں کو بھٹو نے کبھی اہمیت نہیں دی بلکہ ان کے ساتھ ہمیشہ شدید اختلافات ہی رہے۔ مختلف مواقع پر پارٹی کی دستاویزات کی تیاری میں جہاں ان لوگوں کو موقع ملا۔ انہوں نے سوشلزم کے اپنے نکسالی تصور کو ان میں داخل کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بھٹو کے تصورات کی عکاسی نہیں تھی۔ پارٹی کے اجلاسوں میں اس پر طویل مباحثے ہوا کرتے تھے۔ ہالہ کانفرنس کا مباحثہ اس کی نمایاں مثال ہے۔ بھٹو کا طرزِ قیادت بنیادی طور پر جمہوری تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی رائے پر اپنے علم و شعور اور دلائل کی برتری کی وجہ سے اثر انداز ہوتے۔ اس لئے پارٹی کی دستاویزات کو بھٹو کے ذاتی تصورات اور نظریات کیلئے سند کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ ان کی تیاری کے سلسلے میں بھٹو کا کردار بھی پارٹی کے رُکن کی طرح ہوتا تھا۔ جو باتیں وہ دستاویزات کی تیاری کے وقت نہیں منوا سکتے تھے وہ پالیسی سازی یا عمل کے وقت مزید دلائل کے ساتھ منوا لیا کرتے تھے۔)

(ج) وہ ملک جن کو غیر ترقی یافتہ کہا جاتا ہے یا اب انہیں کبھی کبھی ترقی پذیر ملک کا لقب بھی دیا جاتا ہے یہ وہ ملک ہیں جو کہ سرمایہ دارانہ سامراج کے ہاتھوں کسی نہ کسی رنگ میں ایک لمبے عرصے سے شکار چلے آرہے ہیں ان ملکوں کیلئے خاص طور پر سوشلزم ایک طرف تو غربت و افلاس اور دوسری طرف سامراجی

www.bhutto.org

لوٹ کھسوٹ کا سامنا کرنے کیلئے اپنے مضبوط نظام کی صورت میں دو دھاری تلوار پیش کرتا ہے کیونکہ سوشلزم کا نظام اپنے اصولوں کی سچائی کی وجہ سے انسانی عمل کی قدر و منزلت کے طفیل مختصر ترین وقت میں معاشرے کو عدل و انصاف کی بنیادوں پر ترقی کی انتہائی منازل تک پہنچا دیتا ہے۔

سوشلزم کا نظام اسی لئے پاکستان کی دلچسپی کا موجب ہے کہ ہمارا ملک ایک غریب اور افلاس زدہ ملک ہے جو کہ سنگین اندرونی اور بیرونی سازشوں کا شکار ہے۔ ملکی دولت کے توازن کے اعتبار سے ہمارا ملک غریب ترین ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس خطہء زمین پر بسنے والے بارہ کروڑ انسانوں کی غربت و افلاس کا موازنہ کسی اور ملک کے ساتھ آسانی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا سوشلزم کسی غیر ترقی یافتہ ملک میں اپنایا جا سکتا ہے؟ ہمیں اپنی موجودہ تاریخ صاف لفظوں میں اس سوال کا جواب "ہاں" میں دیتی ہے۔ یہ مفروضہ کہ غیر ترقی یافتہ ملک ان تمام اقتصادی منازل سے بُوبہُو اس طرح گزریں جس طرح کہ مغربی ممالک سرمایہ دارانہ معاشرتی اور معاشی اَدوار میں بتدریج گذرے ہیں تو کہیں جا کر ترقی کا مُنہ دیکھ سکے ہیں خود اپنی نفی کرتا ہے کیونکہ اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ جب تک کسی غیر ترقی یافتہ ملک کی اقتصادی اور معاشی تاریخ کا خاکہ اسی طرح نہ ہو جس طرح کہ ترقی یافتہ یورپی ممالک کا تھا اس وقت تک وہ ترقی کی منازل سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔

پیپلز پارٹی کے اس دَور کے دانشوروں کا کہنا تھا کہ پاکستان جس کا سیاسی، تاریخی اور اقتصادی ماضی مغربی عیسائی ملکوں سے بالکل مختلف ہے اس کیلئے مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی چربہ سازی سے ترقی حاصل کرنا بالکل ممکن نہیں (جب مغربی جمہوریت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کے حالات کے مطابق نہیں تو مغربی نظام کے متعلق بھی یہی دلیل دی جا سکتی ہے) یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ بعض مغربی عالموں نے سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق پہلے ہی یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ جب تک کوئی قوم یا ملک یہودی نصرانی کلچر کو تمام پہلوؤں سے اپنانہ لے اس کیلئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اقتصادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کو استعمال کر کے مادی ترقی حاصل کر سکے۔ تو یہ مغربی عالم صاف لفظوں میں کیوں نہیں کہہ دیتے کہ غریب ملکوں کیلئے سرمایہ دارانہ نظام کو اپنانا ہی ضروری نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ کا کلچر بھی اپنے گلے کا ہار بنانا ضروری ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو پھر یہ اور بھی ضروری ہے کہ پاکستان جو ایک اسلامی ملک ہے اور جو اسلامی مساوات اور انصاف کی بنیادوں پر بنایا گیا ہے اور جس کا دعویٰ ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ وہ اسلامی طرزِ زندگی سے کسی صورت بھی دستبردار نہیں ہو گا اور وہ تو صرف ایسے معاشی نظام کو اپنائے گا جس کے سُوتے ہماری تاریخ ہمارے کلچر اور ہمارے نظریہء حیات سے پھوٹتے ہوں اور جو ہماری موجودہ معاشی اور معاشرتی مشکلات کا حل ہو۔ اسلامی نظریہء حیات، نصرانی اور یہودی سرمایہ دارانہ نظام کی ضد ہے اور سوشلزم کا اقتصادی نظام ہرگز غیر اسلامی نہیں (اس دور میں قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے اقوال اس بات کے ثبوت کے طور پر کثرت سے پیش کئے گئے)

www.bhutto.org

لیکن اس کے برعکس پاکستان کی موجودہ حالت یہ ہے کہ اندرونی اور بین الاقوامی سرمایہ دارانہ طاقتیں اپنے تمام وسیلوں اور سازشوں سے پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہیں اور نجی سرمایہ کاری کیلئے کہا جاتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے سوا پاکستان کی معاشی پیچیدگیوں کا اور کوئی حل نہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ بہت سے مغربی ترقی یافتہ ملکوں میں سوشلزم کے اصولوں کو کھلم کھلا اپنا کر اقتصادی ترقی کیلئے نئے راستے تلاش کئے گئے لیکن یہی ملک غریبوں کیلئے سوشلزم کو ہم قاتل سمجھتے ہیں اور ہمیں اس "زہر" کے پاس نہیں آنے دیتے جو خود ان کیلئے تریاق ہے۔

ان دانشوروں کی تنقید تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام کے مثالی اجارہ دار اکثر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ صنعتی ترقی نجی سرمایہ کاری (پرائیویٹ انٹرپرائز) کے بغیر ممکن نہیں لیکن وہ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ نجی سرمایہ کاری کا جو تناسب دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں سرمایہ کاری سیکٹر کے مقابلے میں ہے اس لحاظ سے ہمارا ملک کہاں تک نجی سرمایہ کاری کو بے لگام رکھ سکتا ہے اور جب ہم مغربی ملکوں کے نجی سرمایہ کاری کے پہلو کو دیکھتے ہیں تو اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ وہاں انفرادی اور شخصی آزادی ہر رنگ میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے مثلاً ضمیر کی آزادی، گفتار کی آزادی اور اظہار کی آزادی، باہم تعلقات کی آزادی اور ملنے جلنے کی آزادی، مغربی جمہوری نظام میں اگر یہ شخصی آزادیاں بھی حاصل نہ ہوں تو یقیناً سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت میں آیا ہوا ملک محض جبر و استبداد اور ظلم کی تصویر کے سوا کچھ اور نہ دکھائی دے۔ یہ شخصی آزادیاں اور کسی حد تک مغربی تہذیب کی بے راہ روی اور سرمایہ دارانہ نظام کی گھٹن کو دور کرتی ہیں اگر یہ شخصی آزادیاں حاصل نہ ہوتیں تو سرمایہ دارانہ نظام کا کیا حال ہوتا؟ اس کی مثال ہٹلر کے جرمنی اور توجو کے جاپان کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ آپ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مثال ہی لیں جو کہ اس وقت تمام دنیا میں آزادی کی خواہاں قوتوں اور تنگیسوں کے خلاف کھلم کھلا جنگ لڑ رہا ہے اور سرمایہ دارانہ معاشی نظام کا علمبردار ہے اگر وہاں سفید فام شہریوں کو مکمل سماجی آزادی کے حقوق حاصل نہ ہوں تو امریکہ میں بذات خود ایسی تباہی آئے جس کی مثال دوسری جنگ عظیم بھی پیش نہ کر سکے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کو گوارا بنانے کیلئے فرد کو بظاہر بہت حد تک شخصی آزادی دی جاتی ہے لیکن شخصی آزادی کچھ ایسی ہے کہ جیسی پرندے کو پنجرے میں بند کر کے آزاد چھوڑ دیا جائے۔"

جس کنونشن میں پاکستان پیپلز پارٹی قائم کی گئی اس میں مذکورہ بالا مضمون کو ایک بنیادی دستاویز کے طور پر منظور کرنے کا ایک ہی مقصد تھا کہ شہید بھٹو نے تاریخ کے ارتقائی سفر پر چلنے والے محنت کشوں کے قافلے کی قیادت قبول کرلی تھی اور اپنی پیش عملی کیلئے جو حکمت عملی وضع کی تھی وہ پاپولسٹ اور ترقی پسند سیاست کی حکمت عملی تھی جس کا بنیادی نقطہ نظر وہی تھا جو لینن اور ماؤزے تنگ کا تھا لیکن اس کا طریقہ کار پاکستان کے معروضی حالات کی وجہ سے مختلف تھا۔ شہید بھٹو نے اس وقت لینن اور ماؤ کی کمیونسٹ پارٹیوں کا وہ طریقہ نہیں اپنایا تھا جو انہوں نے انقلابی سفر کی آخری منزل پر آکر اختیار کیا بلکہ ان طریقوں سے فائدہ اٹھایا

www.bhutto.org

جو لینن کی سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی نے 1905ء سے لے کر 1912ء تک اختیار کئے تھے اور جن میں بورژوازی کے ساتھ اتحاد بھی کیا تھا اور بالآخر پوری ترقی پسند تحریک کی قیادت لینن کے گروپ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

بعض میکانکی ترقی پسند یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بھٹو نے لیفٹ کی روایت پسند پارٹیوں کو مسترد کر کے غلطی کی لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عوام کبھی اتنے بے شعور بھی نہیں ہوئے کہ ترقی پسند حکمتِ عملیوں میں سے پسماندہ حکمتِ عملی کو چن لیں۔ دوسری طرف بعض لیفٹسٹوں کا کہنا تھا کہ بھٹو کو مسلح جدوجہد کرنی چاہئے تھی لیکن طارق علی کے اس وقت کے دورۂ پاکستان نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ طارق علی کا اپنا نقطۂ نظر ٹراٹسکی کے نقطۂ نظر کا بھی درست اطلاق نہیں کرتا تھا کیونکہ الیکشن میں حصہ نہ لینا اور صرف مسلح جدوجہد شروع کر دینا ایک مہم پسندی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ماؤزے تنگ اور اسٹالن کے نظریات میں جو قدرِ مشترک تھی اور جس نے پارٹی اور اسٹیٹ کے ڈھانچے میں جس سنٹرل ازم کو ترجیح دی تھی اسے آج تاریخ نے غلط ثابت کر دیا ہے لیکن ماؤزے تنگ اور اسٹالن نے یہ پالیسی اس وقت بنائی تھی جبکہ محنت کش طبقات دس دس پندرہ پندرہ سال کی جدوجہد کے بعد انقلابی تقاضوں کے مطابق منظم ہو چکے تھے۔ شہید بھٹو کی پارٹی تو اس سطح تک پہنچی ہی نہیں تھی اس لئے 1970ء کے الیکشن میں حصہ لینا حکومت بنانے یا انقلاب لانے کا نہیں بلکہ عوام کو مزید سیاسی تربیت کے ایک وسیع و عریض مکتب میں داخل کرنے کا مرحلہ تھا۔ اس لئے شہید بھٹو نے جو حکمتِ عملی اختیار کی تھی اس کی وضاحت پارٹی کے پہلے کنونشن کی بنیادی دستاویزات میں اس مضمون سے کی گئی جس کا عنوان تھا "سوشلزم کی منزل"۔

"سوشلزم کی منزل" کے زیرِ عنوان اس مضمون میں لکھا گیا ہے کہ سوشلسٹ نظام کسی قانون کے جاری کر دینے سے ایک ہی دن میں لاگو نہیں ہو جاتا نہ کسی آرڈی ننس یا ڈکٹیٹر کے کہہ دینے سے اس کا نفاذ ہو جاتا ہے۔ اس کیلئے تو ایک لمبی اور کٹھن راہ پر مسلسل چلنا پڑتا ہے۔ یہ ایک لمبے سفر کا نشان ہے۔ ایسا سفر جس میں کئی نشیب و فراز آتے ہیں۔ ہر منزل مسافر کیلئے باعثِ تسکین تو ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی نئے سفر کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ سوشلزم ایک ایسے مجاہد کا سفر ہے جسے دشمن کے غاصب ہاتھوں سے اپنے وطنِ عزیز کا قبضہ کیا ہوا علاقہ قدم بہ قدم اور لحظہ بہ لحظہ واپس لینا ہے۔ اس کے دن اور راتیں صرف اسی دُھن میں اسی لگن میں گذرتی ہیں۔ جُوں جُوں وہ اپنے کھوئے ہوئے وطن کی طرف فاتحانہ انداز میں لوٹتا ہے وہ ظلم، جبر و جہالت کے تمام اثرات مٹاتا چلا جاتا ہے۔ وہ پرانی زمین کو اپنی ہمت، خون اور علم سے نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے لمبے سفر یا جہاد کے ساتھ اپنے ملک کی تقدیر کو قومی عزت اور شرف کو علم کے سرچشموں کو تہذیب کی خوبصورت اور دلکش وادیوں کو دوبارہ دریافت کرتا ہے۔ اس لمبے سفر یا پیہم جہاد کی منزلیں جہاں وہ اپنے جان و مال، وقت، قوت اور عزت سب کچھ وقف کر کے وطن میں تہذیبِ نو کے قیام کا موجب بنتا ہے۔ اس جہاد میں غم کی گھڑیاں بھی ہوتی ہیں اور وقتی شکستیں بھی لیکن یقینِ محکم اور

www.bhutto.org

اتحادِ عوام کی بدولت دشمن بالآخر شکست کھا جاتا ہے اور سامراجی نظام اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے لیکن آخری فتح سے پہلے بہت سی مُہمات سر کرنی پڑتی ہیں اور ہر مہم کیلئے ایک وقت مقرر ہوتا ہے جب مجاہد جہاد کے سفر پر روانہ ہو تو ضروری ہے کہ اسے اپنی سمت کا پتہ ہو کیونکہ اس سفر میں اسے بنے بنائے رستے نہیں ملیں گے' نئے رستوں کی تلاش کا دوسرا نام یہ سفر ہے۔ علاقے کے مخصوص حالات' وہاں کا ماحول' وہاں کے لوگ ان کی عادات واطوار اور ضروریات یہ سب اَجزا مل کر اس کے نئے راستوں کی نشاندہی کریں گے۔ اس لمبے سفر میں اگر کسی طرف سے اسے مدد مل سکتی ہے تو ان مجاہدوں یا مسافروں سے جنھوں نے ایسے ہی سفر یا جہاد اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اپنے وقتوں میں کئے۔ ان کی سبق آموز سرگذشت اور اعمال اور اپنے علم و عمل کے سوا اور کہیں سے مدد کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔

مندرجہ بالا حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس پارٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سوشلزم کو اسلامی مملکت پاکستان میں رائج کرنا ضروری ہے اور اس سلسلے میں جتنی بھی جدوجہد کرنا پڑے اس کیلئے ہر ممکن قربانی دینے کیلئے یہ پارٹی تیار ہے لیکن یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ محض صحیح اصولوں کا انتخاب ہی کامیابی کا ضامن نہیں ہوتا بلکہ ان اصولوں کیلئے مسلسل جدوجہد اور صحیح تنظیمی صلاحیتوں اور عوامی قوتوں کا مہیا کرنا ضروری ہے۔ پاکستان کے مخصوص حالات میں سوشلزم کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے کسی ملک کے اُترے ہوئے کپڑوں سے کام نہیں چلے گا۔ سوشلزم کے اصولوں پر عملدر آمد ہماری مذہبی' سماجی اور ثقافتی اقدار کے مطابق ہی ہو سکے گا اور اس کیلئے ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ ہمارا معاشرہ اقتصادی یا معاشرتی لحاظ سے ترقی یا تنزل کی کس منزل پر ہے؟ ہم نہ تو اپنی تاریخ کو بھلانا چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنے مستقبل سے بے خبر رہنا چاہتے ہیں۔

پاکستان کا شمار جن غیر ترقی یافتہ ملکوں میں کیا جا سکتا ہے ان ملکوں کی اقتصادی حالت کو پہچاننے کیلئے آثار و قرائن مختصراً یہ ہیں:۔

(1) گرا ہوا معیارِ معیشت اور نہایت قلیل آمدنی
(2) آبادی کی اکثریت کی صحیح غذائیت سے محرومی
(3) ناقص اور پسماندہ زرعی نظام
(4) قومی صنعت کی ابتدائی اور کمزور سطح
(5) گرا ہوا معیارِ تعلیم اور ملک کی ناخواندہ اکثریت
(6) قدامت پسند سماجی اور معاشرتی رواج اور طریقے
(7) وسیع پیمانے پر بے کاری اور بے روزگاری خصوصاً دیہی علاقوں میں ناقص تقسیم کار
(8) شرحِ پیدائش میں تیزی سے اضافہ
(9) صنعتی سرمایہ دار ملکوں سے معاشی مدد کی توقع اور اس پر بھروسہ

www.bhutto.org

مندرجہ بالا تمام مسائل سے پاکستان دوچار ہے۔ ان سب کا حل پیش نظر رکھ کر ہی نیا معاشی پروگرام بنایا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانے کی رفتار اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہوسکے ان تمام مسائل کو حل کیا جائے۔ اگر ترقی کی رفتار ہر ممکن کوشش سے اور ہر ممکن وسیلے کے ذریعے تیز سے تیز تر نہ کی گئی تو آبادی کی رفتار خواہ اسے کتنا بھی قابو میں لانے کی کوشش کی جائے سست قدم ترقی کو پیچھے چھوڑ جائے گی۔ اس ملک میں لوگوں کو یہ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ یہاں بے اندازہ اقتصادی اور صنعتی ترقی ہوئی ہے اور یہ ملک اس لحاظ سے مثالی ہے کہ دوسروں کی دی ہوئی امداد سے اتنی زیادہ ترقی کر گیا ہے مگر ان قصیدہ گویوں کے پاس اس سوال کا جواب نہیں کہ اس ترقی سے عوام کا معیار زندگی کس حد تک بلند ہوا ہے اگر ملکی دولت سمٹ کر کچھ گھرانوں میں جمع ہو گئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیہات اور شہروں میں رہنے والے عوام پہلے سے زیادہ آرام دہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ہتھکنڈے اس ملک میں استعمال کر کے بھی ترقی کی صورت ابھی تک بہتر نہیں ہو سکی اور ان حالات میں ایسی کوئی امید بھی وابستہ نہیں کی جا سکتی۔

موجودہ بے ہنگم اقتصادی اور معاشی نظام کی بجائے اس ملک میں سوشلسٹ نظام کو مکمل طور پر رائج کرنے میں شاید کئی سال لگیں لیکن ہمیں بددل نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری پارٹی کا یہ لائحہ عمل ہونا چاہیے کہ موجودہ حالات میں جہاں تک ممکن ہوسکے سوشلزم کے اصولوں کو جاری و ساری کیا جائے تاکہ ترقی اور تبدیلی کے راستے کھلنے لگیں اور رفتہ رفتہ ایک ایسی فضاء پیدا ہو جائے جس سے تمام معاشرے کی اصلاح کی جا سکے۔ "

مندرجہ بالا دونوں مضامین کو بین الاقوامی صورتحال کے تناظر میں دیکھا جائے تو نتیجہ صرف ایک ہی نکلتا ہے کہ شہید بھٹو عالمی سامراج کو پاکستان کا دشمن نمبر ایک سمجھتے تھے اور یورپ کو اس سامراج کی قیادت میں چلنے والے سامراجی ملک قرار دیتے تھے جبکہ بھارت کو ابھرتا ہوا سامراج سمجھتے تھے جو تیسری دنیا میں اس بڑے سامراج کا حصہ دار بن کر ابھرنا چاہتا تھا تاہم عالمی سامراج کی اثر و رسوخ اور فوجی مفادات کو یک لخت ختم کرنے کیلئے جس عوامی قوت کی ضرورت تھی وہ تنظیمی سطح پر موجود نہ تھی اس لئے شہید بھٹو نے یہ پالیسی بنائی کہ سیٹو اور سینٹو جیسے معاہدوں اور پاک امریکی دفاعی معاہدوں اور امریکی اقتصادی لوٹ کھسوٹ کی مکمل نفی بھی کی جائے لیکن امریکہ کے ساتھ کچھ لو اور کچھ دو کی حکمت عملی بھی اپنائی جائے اور اس وقت تک یہ پالیسی جاری رکھی جائے جب تک کہ پاکستان کے محنت کش عوام ایک منظم مادی قوت بن کر آزادی حاصل کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے۔ اس حوالے سے سوشلسٹ نقطہ نظر کے مطابق پارٹی کے پہلے کنونشن میں ذرائع پیداوار کے متعلق جو بنیادی دستاویز تیار کی گئی اس میں لکھا گیا تھا :-

" ذرائع پیداوار کی افزائش کیلئے سوشلسٹ نقطہ نظر کے مطابق پاکستان میں دو طرفہ جہاد کی ضرورت ہے۔ ایک طرف تو پاکستان کو غیر ترقی یافتہ صنعتی اور زرعی حالت سے نکالنا اور دوسری طرف

عدل و انصاف کی بنیاد پر ایک سماجی اور اقتصادی نظام کو رائج کرنا۔ یہ دونوں کام ایک ہی وقت میں تیز رفتاری سے کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان دونوں میں سے اگر ایک کو بھی پس پشت ڈالا جائے تو دوسرا کام خود بخود نامکمل رہ جاتا ہے۔ پاکستان میں سرمایہ دارانہ معاشی نظام پر جس حد تک عمل کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ تو ملکی دولت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے اور نہ ہی عام لوگوں کی حالت سُدھری ہے۔ صنعت کاری کچھ گروہوں اور کچھ خاندانوں کے دائرہء اختیار میں ضرور چلی گئی ہے لیکن اس غیر مساوی تقسیم اور تقسیمِ زر کے باوجود ملک میں نہ تو خاطر خواہ صنعتی ترقی ہوئی ہے' نہ ہی زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے البتہ نئی سامراجی طاقتوں نے ہمیں اور بھی اپنا مرہونِ منت بنالیا ہے۔"

عوام کو اقتصادی لوٹ کھسوٹ سے بچانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ تمام ذرائع پیداوار چند لوگوں کے ہاتھوں سے لے کر (جو کہ پیدائشِ زر میں حصّہ نہیں لیتے) اِن وسائل کو تمام ملّت کی بہبود کیلئے یکساں طور پر استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں جو واضح اصول بنائے جاسکتے ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) وہ ذرائع پیداوار جن سے صنعتی ترقی کی جڑیں وابستہ ہیں یا جن سے تمام چھوٹی بڑی صنعتیں وابستہ ہوتی ہیں' ان کو چند ہاتھوں میں نہ رہنے دیا جائے بلکہ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لے۔

(2) وہ تمام ذرائع پیداوار جن سے قومی اقتصادیات کی بنیادیں اُستوار ہوتی ہیں' عوامی ملکیت میں ہونے چاہئیں۔

(3) زرِ مبادلہ کے تمام ذرائع اور ایجنسیاں مثلاً بنک' اسٹاک ایکسچینج اور انشورنس کمپنیاں حکومت کی ملکیت میں ہونی چاہئیں۔ مختصراً بنک' اسٹاک ایکسچینج اور انشورنس کمپنیاں حکومت کی ملکیت میں ہونی چاہئیں۔ مختصراً قومی اختیار میں مندرجہ ذیل شعبوں کو دینا ضروری ہے۔

(1) بنک کاری
(2) انشورنس کمپنیاں
(3) تمام بڑی بڑی صنعتیں مثلاً فولاد' سیمنٹ' لوہا
(4) دیگر دھاتوں کی صنعتیں
(5) بھاری انجینئرنگ کی صنعت
(6) صنعت کاری کیلئے بڑی مشینیں اور پُرزے
(7) کیمیکل فیکٹریاں اور پیٹرو کیمیکل صنعتیں
(8) جہاز سازی
(9) اسلحہ سازی
(10) موٹر کار کی صنعت
(11) بجلی پیدا اور تقسیم کرنے کے سامان کی صنعت
(12) بجلی

www.bhutto.org

(13) گیس
(14) تیل
(15) کوئلہ
(16) آمدورفت کے تمام ذرائع' روڈ ٹرانسپورٹ
(17) ریلوے
(18) جہازرانی
(19) ایئرٹرانسپورٹ
(20) تمام ذرائع معدنیات' کان کنی' خام دھاتوں کو کیمیائی طریقوں سے بہتر بنانے کی صنعت۔

نجی سرمایہ کاری' قومی اقتصادی زندگی میں اپنا کردار اسی حد تک ادا کر سکے گی جس حد تک ہماری معاشرتی ضروریات اس کی اجازت دیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ نجی سرمایہ کاری کی اجازت محض قابلیت' ہنرمندی اور جائز نفع رسانی کے اصولوں پر ہوگی نہ کہ بڑے خاندانوں کی سرپرستی اور نوکر شاہی کی ناجائز دھڑے بندیوں کی بناء پر۔ نجی سرمایہ کاری اسی حد تک نفع بخش ہو سکتی ہے جبکہ محنت کش طبقہ اس کی نفع سازی میں برابر کا شریک ہو۔

محنت کش طبقے کی صنعت و حرفت اور زراعت کے چھوٹے بڑے منصوبوں میں احساسِ شرکت والے نظام سے ہی معاشرے کے تمام افراد میں اتحاد' اتفاق' ہمت اور قوت کا احساس پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بڑی بڑی صنعتوں کو قومیانے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھا جانا چاہئے کہ کاشتکاروں' مزدوروں اور دوسرے محنت کش لوگوں کیلئے زندگی کے تمام شعبوں مثلاً کام' تعلیم' صحت اور کھیل وغیرہ میں بہتر سے بہتر مواقع جلد سے جلد پیدا کئے جائیں۔ ہماری قومی زندگی کی ترقی کی پہلی منزل یہی امر قرار پانا چاہئے۔ یہی قدم اٹھا کر ہم عوام کے اتحاد سے نئی نسل کی اُمیدوں اور اُمنگوں کو ساتھ لے کر قومی زندگی میں حقیقی انقلاب لا سکتے ہیں۔ وہ انقلاب جس سے ہماری زندگی کی مادی اور روحانی کامرانیاں وابستہ ہیں۔

شہری آزادیوں کے بارے میں اس کنونشن میں جو دستاویز منظور کی گئی اس میں لکھا گیا تھا۔

"ہماری پارٹی کا اوّلین مقصد یہ ہوگا کہ ہر شخص کو جمہوریت کی صحیح اُقدار کے مطابق مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہوں۔

1۔ آزادیٔ ضمیر
2۔ زبان و اظہار کی آزادی (اس میں اشاعت کی آزادی بھی شامل ہے)
3۔ پریس کی آزادی

www.bhutto.org

4۔ باہمی میل جول کی آزادی

5۔ جلسوں اور جلوسوں کے انعقاد کی آزادی

یہ تمام بنیادی حقوق جس معاشرے سے چھین لئے جائیں وہاں یقیناً آمریت کا راج ہوتا ہے۔ چاہے یہ آمریت کسی طبقے کی ہو یا کسی شخص کی۔ لُطف تو یہ ہے کہ مندرجہ بالا حقوق اکثر سرمایہ دارانہ حکومتوں میں بھی لوگوں کو دیئے جاتے ہیں اور

مغربی سرمایہ دار ملکوں میں ان کا تحفظ بھی کیا جاتا ہے۔ جس نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو پاکستان میں شہری آزادیوں کو سلب کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

کسی بھی معاشرے میں اگر لمبے عرصے تک ان شہری آزادیوں کو چھین لیا جائے تو اس کا نتیجہ خطرناک ہوتا ہے۔ آزاد انسانوں کی حریتِ ضمیر بالآخر انہیں تشدد پر مجبور کر دیتی ہے اور جس سماج میں تشدد سے اپنے حقوق حاصل کرنے کا راستہ کھلا رکھا جائے وہاں بہرحال ترقی کے راستے دشوار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہر رنگ میں شہری آزادیوں پر پابندی معاشرے کی ترقی کے حق میں خطرناک حد تک رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔

چند خاص اداروں کو مضبوط کرنے کی اس لئے بھی اشد ضرورت ہے کہ ان سے شہری آزادیوں کا تحفظ صحیح رنگ میں کیا جا سکے۔ ان اداروں میں سب سے اہم ادارہ عدلیہ کا ہے۔ آئین میں عدلیہ کو مکمل آزادی ہونی چاہئے۔ اس بات کی انتہائی ضرورت ہے کہ یا تو موجودہ آئین میں خاطر خواہ تبدیلی کر کے عدلیہ کو خود مختار اور آزاد کیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس آئین کی جگہ نیا آئین بنایا جائے جو ہمہ وری تقاضوں پر پورا اُترتا ہو تاکہ عوام کو اپنے حقوق کی پشت پناہی کم از کم قانون کے ذریعے حاصل رہے۔ یہ قدم جتنی جلدی ممکن ہو اٹھایا جانا چاہئے اور اس سلسلے میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ تمام روشن خیال اور جمہوریت پسند سیاسی پارٹیاں یکجا ہو کر اس مطالبے کو مفید رنگ میں منوالیں۔"

مندرجہ بالا دستاویزات کے حوالہ سے پیپلز پارٹی کے منشور اور حکمتِ عملی کا تجزیہ کیا جائے تو مختصر لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ منشور تو اسلامی سوشلزم کا پہلا مرحلہ تھا اور اس پر عملدرآمد کرنے کیلئے جو حکمتِ عملی اختیار کی گئی ہے وہ سوشل ڈیموکریسی کی حکمت عملی تھی جس میں مسلح جدوجہد اور ڈائریکٹ انقلاب کے بجائے متحدہ محاذ بنانے اور مرحلہ وار چلنے کا اصول اپنایا گیا اور طبقوں کے ساتھ ساتھ صنفوں کی برابری کے مسئلے کو بھی بنیادی اہمیت دی گئی اور زندگی کے ہر شعبے میں عورت کو مرد کے مساوی حقوق اور درجے دینے کیلئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے تمام جائز حقوق حاصل کرے۔ علاوہ ازیں ثقافت کو بھی اقتصادیات اور سیاست کے برابر درجہ دیا گیا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پیپلز پارٹی جب وجود میں آئی اس وقت قومی اور بین الاقوامی سیاسی صورتحال کیا تھی۔ اس سلسلے میں صورتحال کا وہ تجزیہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے جو پارٹی کے پہلے کنونشن میں بہ اتفاق رائے

www.bhutto.org

منظور کیا گیا۔ دستاویز میں اس اوّلین سوال کا جواب بھی دیا گیا ہے کہ پیپلز پارٹی وجود میں کیوں آئی؟ اس دستاویز میں لکھا گیا ہے کہ

"پاکستان اپنی آزاد اور خود مختار زندگی کے تیسرے عشرے میں داخل ہو رہا ہے لیکن بارہ کروڑ پاکستانیوں کے تمام بنیادی مسائل کا حل اور ان کا مستقبل ابھی تک غیر یقینی ہیں۔ یہ بات اس لئے بھی زیادہ افسوس ناک ہے کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد اس برِ صغیر کے مسلمانوں نے مکمل اعتماد کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی بنیادیں اسلام کے بنیادی اصولوں پر اُستوار کی جائیں گی اور ہماری سیاسی معاشی اور سماجی زندگی اسلام کے دینی اور دنیوی اصولوں کی قوت سے رواں دواں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ نہ ہو سکا اور اس سلسلے میں کسی لمبی چوڑی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ مارشل لاء سے قبل پاکستان اپنی قومی زندگی کے تمام ضروری شعبوں میں بہت ہی پیچیدہ مسائل اور مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ 1956ء کے آئین کو بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مخلوط اور غیر مخلوط انتخابات کا نظریہ' مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان صوبائی مساوات کا مسئلہ' دینی اور لادینی نظریہ کا باہمی تعلق' اقلیتوں کے حقوق' مغربی پاکستان کی وحدت کا مسئلہ اور دوسرے بہت سے ایسے ہی نازک اور بھڑک اٹھنے والے مسائل درپیش تھے۔

معاشرے میں نفسانفسی' رشوت ستانی اور کُنبہ پروری کا اس قدر دَور دورہ تھا کہ ہماری اخلاقی اور سماجی زندگی تیزی سے پستی کی طرف جاری تھی۔ لوگوں میں بددلی اور مایوسی پھیل چکی تھی اور حکومت کی نظم و نسق کی اہلیت پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ خصوصاً غریبوں اور محنت کشوں کے حقوق اور خواہشات کو جس بے دردی سے نظر انداز کیا گیا اس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ یہی غریب اور محنت کش لوگ ہیں جن کے بَل بوتے پر معاشی اور اقتصادی میدان میں سرمایہ داروں کیلئے بے انتہا ترقی کے مواقع پیدا ہوئے اور کارخانوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی لیکن ان کی ترقی کیلئے جو ہماری آبادی کی اکثریت ہے مختلف حکومتوں نے کوئی ٹھوس اقدام نہ اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غربت اور افلاس ہمارے ملک کے محنت کش طبقوں کو گھُن کی طرح چاٹنے لگی۔

نوکر شاہی اور حکومت کے اہلکار بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کی بہبود کی طرف متوجہ ہوتے اُنہوں نے سیاسی کشمکش میں سیاستدانوں کے ساتھ اپنے آپ کو بُری طرح الجھا دیا اور سیاستدانوں کے شانہ بشانہ اس آزاد ملک کے خادم بننے کی بجائے اس کے حاکم بن گئے۔ اس وجہ سے ملک میں غیر یقینی سیاسی ماحول اور بھی نازک حالات سے دوچار ہو گیا اور ہمارے تمام قومی مسائل میں اضطراب کی کیفیت دن بدن نمایاں ہوتی گئی۔

ملکی نظم و نسق کی کارکردگی کا معیار بجائے اس کے کہ موجودہ صدی کے بین الاقوامی معیاروں پر پورا اُترتا دن بدن تیز رفتاری سے روبہ انحطاط ہوتا گیا۔ کاشتکاروں میں بے مقصدیت اور مزدور طبقے میں

www.bhutto.org

بے تنظیمی اور غیر متعین راہِ عمل کا احساس جڑیں پکڑنے لگا اور سفید پوش اور تنخواہ دار طبقہ اپنی جائز ضروریاتِ زندگی کیلئے ترسنے لگا۔ خود غرضی اور ذاتی نفع رسانی ہمارے معاشرے کے رگ وپے میں رچ گئی۔ تعلیم اور نوجوانوں کی بہبود جو کہ قومی ترقی کا سرچشمہ قرار پاتے ہیں ہمارے ملک میں رُوبہ زوال ہوگئے۔ تمام قومی ادارے ماسوائے عدلیہ اور افواج پاکستان شدید بحران کا شکار ہوگئے۔

ہندوستان کے جارحانہ عزائم کی وجہ سے ہمارے ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اس کا بیّن ثبوت وادیٔ کشمیر میں ہندوستان کی ظلم کھلا جارحیت تھی جس کا دراصل مقصد پاکستان کے بنیادی، معاشی اور علاقائی حقوق پر غاصبانہ قبضہ تھا۔

یہ 1958ء کے مارشل لاء سے پہلے کے حالات تھے۔ مارشل لاء نافذ ہوا تو عوام کی اُمیدوں اور تمناؤں میں ایک دفعہ پھر زندگی کی رَمق نظر آئی۔ عوام نے سوچا کہ ہمارے قومی مسائل اب ایک مضبوط لیکن پُرشفقت ہاتھ سے سُلجھ جائیں گے۔ نئی حکومت نے زرعی اصلاحات سے سیاسی زندگی کی تطہیر سے اور اقتصادی اور معاشی زندگی میں نظم وضبط لانے کی کوشش کر کے کسی حد تک اپنے قیام کا جواز پیدا کیا۔ بنیادی جمہوریتوں کے باعث کچھ نئے ادارے وجود میں آئے جن سے قومی مسائل کو حل کرنے کی اُمید دلائی گئی کسی حد تک نظم ونسق میں خرابیوں کو دُور بھی کیا گیا اور رشوت ستانی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی (لیکن جلد ہی مارشل لاء کا یہ اصلاحی کردار ختم ہوگیا اور ایوب خان کی ذاتی ہوسِ اقتدار غالب آنے لگی)۔

1962ء میں مارشل لاء کے خاتمے پر ایک حد تک جمہوریت اور "حکومت شاہی" کا دوغلا نظام رائج کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی قریباً تمام قومی پریس کو نیشنل پریس ٹرسٹ کی صورت میں اپنے قبضہ میں لے لیا گیا اور دوسری طرف ایک سیاسی پارٹی کا "اجراء" کر دیا گیا جو پہلے کنونشن لیگ کہلائی اور بعد میں اس کا نام "پاکستان مسلم لیگ" رکھ دیا گیا تاکہ یہ سیاسی پارٹی ان حالات کا مقابلہ کر سکے جن کا دَر حقیقت جمہوریت سے انحراف کی صورت میں پیدا ہونے کا امکان تھا۔

بنیادی جمہوریتوں کے تحت 1962ء اور 1965ء کے انتخابات ہوئے۔ موجودہ حکومت کی نافذ شدہ اصلاحات کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ حکومت اپنی افادیت اور کارکردگی کی اہلیت کو مکمل طور پر کھو بیٹھی ہے۔ اسی دَورِ حکومت میں بہت سے بنیادی قومی مسائل کا احیاء ہوا ہے اور نئے مسائل نے سر اٹھایا ہے۔ ماضی کے مقابلے میں اب رشوت ستانی، گنہ پروری اور دوسری بدعنوانیاں کہیں زیادہ عروج پر ہیں۔ عدلیہ جو کہ مارشل سے پہلے باعثِ وقار واقتخار تھی، مارشل لاء کے بعد ایک کمزور قومی ادارہ بن کر رہ گئی ہے اور نظامِ قانون میں قانون دان طبقے کی ناراضگی کے باوجود اس قدر الجھنیں اور بے ضابطگیاں داخل کر دی گئی ہیں کہ عوام سے جن کے حقوق کی پشت پناہی عدلیہ اور قانون ہی بالآخر کرتے ہیں یہ ڈھال بھی چھین لی گئی ہے۔

www.bhutto.org

جرائم اور تشدد کی وارداتوں میں روز افزوں اضافہ نے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ صنعت کاری میں محض بے مقصد اور ذاتی اغراض کے پیش نظر ترقی' زرعی ترقی کی طرف سے مجرمانہ عدم توجہ کا باعث بنی ہے اور اس کی وجہ سے ایک بہت ہی سنگین معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جس کے دُور رس منفی نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ اس ملک کو خوراک میسر نہیں ہو سکتی جب تک کہ غیر ملکی گندم کی بھرمار اس ملک میں نہ کی جائے اور یہ غیر ملکی گندم ہمارے زرِ مبادلہ کے ذخائر کو تیزی سے ختم کرتی جا رہی ہے۔

محنت کش طبقہ سخت ہیجان میں مبتلا ہے۔ غریب اور سفید پوش طبقے کیلئے افراطِ زر اور دن بدن بڑھتی ہوئی قیمتوں کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارا دانشور طبقہ اور نئی نسل بے حسی اور بے مقصدیت کا شکار ہو رہے ہیں۔ جھوٹی اور متبدل اقدارِ زندگی نے ہمارے قومی جذبے اور حوصلے کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ طالب علموں میں اضطراب اور کرب کا احساس تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ عوام میں قومی مسائل سے لاتعلقی کی روش پیدا ہو رہی ہے۔ سول سروس تک کو آئینی حقوق کا پہلا سا تحفظ حاصل نہیں رہا۔

1962ء میں ہندوستان اور چین کی جھڑپ کے بعد پاکستان کی بری' بحری اور ہوائی افواج کی قوت میں جس قدر اضافے کی ضرورت تھی اس کی طرف توجہ نہ دی گئی حالانکہ ہندوستان نے 1962ء کے بعد اپنی قوت کو خطرناک حد تک مضبوط کر لیا تھا۔ یہ سنگین ترین لغزش ناقابل معافی ہے۔ ہندوستان کے 1965ء کے جارحانہ حملے کے بعد شروع شروع میں فوجی طاقت کو مضبوط کرنے کی طرف کسی قدر توجہ دی گئی اب بجائے اس کے کہ تمام دوسری ضروریات کو پس پشت ڈال کر فوجوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے' اس بات کا چرچا کیا جا رہا ہے کہ دشمن ہندوستان کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سمجھوتہ کر لیا جائے اور فوجوں میں تخفیف کر دی جائے۔

خارجی تعلقات اور خارجہ پالیسی میں تضاد کی وجہ سے دن بدن کھچاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ تضاد کا یہ چکر اب اس حد تک مکمل ہو چکا ہے کہ اس کی وجہ سے اب اس ملک کے بین الصوبائی تعلقات میں بھی کشیدگی بڑھ رہی ہے۔

صدارتی اور پارلیمانی طرزِ حکومت اور محدود اور بالغ رائے دہی کے سلسلے میں نئے آئینی اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ تاشقند کے بدنام سمجھوتے اور ہندوستان کے ساتھ امن کی عاجزانہ درخواستوں کے باوجود عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے قوانینِ دفاعِ پاکستان کے عُذر لنگ کے تحت غیر معیّن عرصہ کیلئے دستبردار کر دیا گیا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ قومی زندگی بے مقصد ہو گئی ہے اور تمام ملّت کا سانس گھٹنے لگا ہے۔

قومی زندگی کو مکمل سیاسی بحران کے عمیق گڑھے کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ وہ سیاستدان جو ابھی ابھی پابندیوں سے آزاد ہو کر سیاسی میدان میں واپس آئے ہیں ان میں سے کچھ نے تو حکمران پارٹی میں شامل ہو کر اس کی بے مقصدیت اور بے راہ روی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ دوسروں نے اپنی اپنی سیاست

www.bhutto.org

پارٹیوں کی دوبارہ تنظیم کر کے ایک متحدہ محاذ بنالیا ہے کہ شاید وہ اس طرح ملک کے اندرونی اور بیرونی مسائل پر قابو پالیں گے۔

لحظہ بہ لحظہ اور قدم بہ قدم قومی مسائل کا یہ تدریجی اور ارتقائی عمل ایک واضح صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ ان مختلف سیاسی اور قومی اُلجھنوں سے سُلجھاؤ کی صورت اُبھر رہی ہے۔ کوئی بھی ردِّ عمل اور تضاد بالآخر مثبت عمل اور امتزاج کی طرف لوٹتا ہے اور اسی طرح سیاسی تبدیلیاں ایک دور سے دوسرے دَور میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ سیاسی عمل ناگزیر ہے۔

ایبڈو کے ہٹنے کے بعد سابق سیاستدان صاف طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے ایک تو وہ جنھوں نے اپنے سابقہ سیاسی مقام اور نظریات سے انحراف کسی صورت میں گوارا نہ کیا اور دوسری طرف وہ جنھوں نے صحیح سیاست اور شرافت کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسی حکومت کے دامنِ عاطفت میں پناہ لی جس نے انہیں سیاسی مجرم اور قومی تباہی کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ اس کے بعد کونسل مسلم لیگ اور دوسری سیاسی پارٹیوں نے اپنے اپنے انتخاب کئے گو کچھ پارٹیوں کو انتخاب اور کچھ ایسی ہی دوسری رسمی کارروائیوں سے گزرنا ہے۔

مئی 1967ء میں ڈھاکہ میں تحریکِ جمہوریت پاکستان (پی ڈی ایم) کا وجود کونسل مسلم لیگ، عوامی لیگ، جماعتِ اسلامی اور نظامِ اسلام پارٹی کی شمولیت سے عمل میں آیا۔ تحریکِ جمہوریت پاکستان نے آٹھ نکاتی پروگرام کے تحت پاکستان میں جمہوریت بحال کرنے کا تہیہ کیا۔ گو پی ڈی ایم کے وجود میں آنے کے بعد سے عوامی لیگ کا ایک گروہ اسے چھوڑ چکا ہے اور ابھی یہ تحریک پوری طرح حرکت میں نہیں آئی لیکن پھر بھی یہ ہماری ملکی سیاست کی ارتقائی ترقی کی طرف ایک مثبت قدم ہے۔

جمہوریت کی بحالی کیلئے تمام قدامت پرست سیاسی پارٹیوں کا الحاق نہ صرف ہماری موجودہ سیاسی صورتحال کو واضح کرتا ہے بلکہ اس سے یہ بھی عیاں ہے کہ ان مختلف قدامت پسند سیاسی پارٹیوں کے اقتصادی اور معاشرتی اصول اور پروگرام کم وبیش یکساں ہیں۔ پی ڈی ایم چونکہ قدامت پسند رجحانات کی آئینہ دار ہے اسی لئے ترقی پسند عناصر پی ڈی ایم میں شامل سیاسی پارٹیوں سے آسانی کے ساتھ اشتراکِ عمل نہ کر سکے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہی وجہ ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی پی ڈی ایم کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ کر سکی اور اسے اپنے سیاسی وجود کو علیحدہ قائم رکھنا پڑا۔

حالات کی رفتار اس بات کی متقاضی ہے کہ اب اس دَور کا آغاز ہو جس میں تمام روشن خیال عناصر اور سیاسی پارٹیاں بھی مل کر پی ڈی ایم کی طرح ایک علیحدہ تنظیم قائم کریں۔ اس نئی سیاسی صورتحال سے ایک خوش آئند تبدیلی پیدا ہوگی کہ ہماری سیاسی پارٹیاں جو کہ پہلے منفی طور پر محض شخصیات کے سہارے پروان چڑھی تھیں اب واضح طور پر دو سیاسی رجحانات رکھنے والے یعنی روشن خیال اور قدامت پسند گروہوں میں بٹ جائیں گی۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ جب قدامت پسند اور ترقی پسند تنظیموں کو اپنا اپنا مقام اور

www.bhutto.org

اتحاد حاصل ہو جائے گا تو ان کیلئے آسان ہو گا کہ وہ حقیقی جمہوریت کی بحالی کی بنیاد پر ایک سمجھوتہ کر لیں اور ایک قابلِ عمل مشترکہ پروگرام بنا سکیں۔

آنے والے مہینوں میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ ترقی پسند پارٹیاں پی ڈی ایم کی طرح ایک ایسی تنظیم بنانے میں کامیاب ہو سکیں گی جس کی وجہ سے قومی سطح پر ایک ایسی فضاء ساز گار ہو گی جس میں حزبِ مخالف کی تمام پارٹیاں اکٹھا ہو کر حقیقی جمہوریت کی بحالی کیلئے آئینی جدوجہد کر سکیں گی۔

ان وجوہ کی بناء پر یہ ضروری ہے کہ حزبِ مخالف کی پارٹیوں کو آپس میں باہمی سُوجھ بُوجھ اور تعلقات کی فضاء پیدا کرنی چاہئے۔ دَر حقیقت اپوزیشن کی پارٹیوں کا نصب العین ایک دوسرے کی نفی اور نکتہ چینی کی بجائے حزبِ مخالف کے تمام عناصر اور قوتوں کو اکٹھا کر کے انہیں یکجہتی اور یکسوئی عطا کرنا ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حالات میں کیا یہ ضروری ہے کہ ایک نئی سیاسی پارٹی بنائی جائے جبکہ اصل مقصد حزبِ اختلاف کی مختلف پارٹیوں کا اتحاد ہے اگر ذرا غور سے موجودہ سیاسی حالات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ نئی پارٹی کا قیام اس وجہ سے ہی ضروری ہے کہ حزبِ اختلاف کی موجودہ سیاسی پارٹیوں کا اتحاد اس نئی سیاسی پارٹی کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ سیاسی پارٹی ہماری موجودہ سیاسی پارٹیوں کے تاریخی اور سیاسی نظریات کی الجھنوں کو سلجھانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکے گی کیونکہ یہ کام نئی سیاسی پارٹی مخلصانہ طور پر بغیر کسی تعصب یا ذاتی عناد کے کرے گی۔ موجودہ حالات میں اس لئے بھی ایک نئی پارٹی بے حد ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر روشن خیال عناصر کو اکٹھا کرنا ممکن نہیں۔

نیشنل عوامی پارٹی بدقسمتی سے تین مختلف گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور ان میں سے خاص طور پر دو گروہوں کے اختلافات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح عوامی لیگ نہ صرف بین الصوبائی اختلاف میں مبتلا ہے بلکہ پی ڈی ایم کے سوال پر اور دیگر اقتصادی اور سماجی مسائل پر بھی متحد نہیں رہی۔ مختلف سیاسی پارٹیوں کیلئے گو یہ ناممکن نہیں کہ وہ اپنے اندرونی اختلافات سے دَر گذر کرتے ہوئے ایک قومی متحدہ محاذ قائم کر سکیں لیکن یہ یقینی طور پر ایک مشکل کام ہو گیا ہے کیونکہ ان سیاسی پارٹیوں نے اپنے اپنے تفرقات کو ایک واضح شکل دے دی ہے۔ اس لئے ان میں باہمی اتحاد کا کام ایک نئی سیاسی جماعت ہی کر سکتی ہے جس کی بنیاد روشن خیال اصولوں پر رکھی گئی ہو۔ عظیم قومی مفاد کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ اگلا قدم اٹھایا جائے۔ اس لئے گو سطحی طور پر اس بات میں کچھ تضاد نظر آتا ہو کہ نئی پارٹی کا وجود ضروری ہے یا نہیں لیکن دراصل اتحادِ عوام کیلئے ان حالات میں اس سے زیادہ مثبت اور تعمیری اقدام اور کوئی نہیں ہو سکتا تمام قوم اور تمام ملت اتحاد کیلئے تڑپ رہی ہے۔ حزبِ اختلاف اپنی تمام کوششوں کے باوجود ابھی تک یہ اتحاد قائم نہیں کر سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتحاد کیلئے محض خواہشات کی ضرورت ہی نہیں اور اتحاد محض کہنے سے ہی حاصل نہیں ہو جاتا۔ اتحادِ عوام کیلئے ٹھوس کام، قربانیوں اور وسائل کی ضرورت ہے۔ یہ نئی سیاسی جماعت خدا نے چاہا تو یہ کام کر دکھائے گی اور اتحادِ عوام کا وسیلہ بنے گی۔

www.bhutto.org

اس نئی سیاسی پارٹی کے قیام کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس ملک کے عوام کا ایک فعال حصّہ جس میں ہماری نئی نسل پیش پیش ہے اس کا ایمان ہے کہ قدامت پسندی اور رجعت پسندی سے پاکستان کی بڑی بڑی مشکلات کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ ہر زمانے کا اپنا سیاسی ماحول اور اپنے سیاسی خدوخال ہوتے ہیں۔ موجودہ دَور جو کہ نئی اُمنگوں اور ان سے وابستہ عمل کی نئی دعوتوں کا آئینہ دار ہے۔ اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ ایک نئی سیاسی پارٹی نئی قوّت اور نکھار کے ساتھ پاکستان کے تمام عوام کیلئے ایک ایسے مثالی معاشرے کی تعمیر کا کام سنبھال لے جس کیلئے اس ملک کے عوام نے بے انتہا قربانیاں دی ہیں۔ اب عوام کبھی بھی اس بات پر رضامند نہیں ہو سکتے کہ وہ محض ماضی کی طرف دیکھتے رہیں اور نہ ہی موجودہ حالات کی سنگینی اور زیادہ برداشت کر سکتے ہیں۔ عوام چاہتے ہیں کہ عدل وانصاف پر مبنی ایک نیا نظام قائم کیا جائے جس میں ملک کے کروڑوں عوام کے بنیادی حقوق اور مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ یہ کام اور یہ فرض ایک نئی سیاسی جماعت ہی ادا کر سکتی ہے۔ اس اخلاص کے جذبے اور اس نئے یقین اور نئی اُمید کے ساتھ ہی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہمارے قومی مسائل کا حل ہماری اقدار کے مطابق روشن خیالی اور نئے نقطۂ نظر سے تلاش کیا جائے گا۔

ہمارے اندازِ فکر میں انقلاب آفرین تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ اب اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ لمبا راستہ اختیار کرنا کوئی خوشگوار کام نہیں جبکہ چھوٹا راستہ موجود ہو لیکن پاکستان کے موجودہ حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ لمبا راستہ اختیار کیا جائے۔ ہمیں تجربے نے یہ بتا دیا ہے کہ جب ایسے مسائل درپیش ہوں جن سے عوام اور ملک کی تقدیر وابستہ ہو' آسان اور چھوٹا راستہ دراصل منزل سے آشنا نہیں کرتا بلکہ سراب کی نشاندہی کرتا ہے۔

ان سیاسی حقیقتوں کے پیشِ نظر اور عظیم تر مفاد کیلئے جن کا کسی حد تک تجزیہ کیا گیا ہے یہ حقیقت اب واضح ہو چکی ہے کہ ایک نئی سیاسی جماعت اور ایک نیا سیاسی لائحۂ عمل اور دستور اس قوم اور ملّت کیلئے اشد ضروری ہیں۔ موجودہ حالات میں ایک نئی سیاسی جماعت کی تنظیم اور نشوونما بہت مشکل کام ہے۔ اس سلسلہ میں تمام مجبوریوں اور بندشوں کا احتساب ضروری ہے لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود جو کہ اس قدم کو اٹھانے میں پیش آئیں گی' ہماری سیاسی زندگی کی موجودہ صورت اور ہمارا قومی مفاد اس راستے کو اختیار کرنے کی ہمیں دعوت دیتے ہیں۔ چاہے اس کیلئے ہمیں انتہائی قربانی دینی پڑے اور اپنا آپ وقف کرنا پڑے۔ صرف اسی راستے کو اختیار کرنے سے ہی قومی یکجہتی اور حُبّ الوطنی کے مفادات کو تقویت پہنچائی جا سکتی ہے۔ عوام اپنے جذبہ اخلاص اور یقینِ محکم کے طفیل اس بات کے قابل ہیں کہ وہ حقیقت پسندی سے اپنے تمام مسائل کو خود حل کر سکیں۔ اسی لئے اتحادِ عوام اس نئی سیاسی جماعت کا نصب العین ہے۔ تمام مسائل کو حل کرنے کیلئے مشعلِ راہ ہمارے قائداعظمؒ کے اقوال واَرشادات ہیں اور یہ ہمارے لئے مشعلِ راہ رہیں گے۔ اس ملک کے عوام اس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ وہ اس جذبے

www.bhutto.org

اور روح کو دوبارہ زندہ کر کے رہیں گے جو ہمیں محمد علی جناحؒ نے عطا کیا تھا۔ ہمارا مقصد نئے مسائل پیدا کرنا نہیں اور نہ پرانے مسائل کو زندہ کرنا ہے بلکہ ان مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو پچھلے بیس سالوں سے ہماری سیاسی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔ ملک کی تقدیر کا فیصلہ چند افراد اپنی مرضی سے کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ملک کے تمام عوام اپنے حقیقی نمائندوں کے ذریعہ سے جنھیں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیا گیا ہو اپنے سیاسی و اقتصادی مسائل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

پاکستان کے عوام سے یہ درخواست باہمی یقین اور اعتماد کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور باہمی یقین اور اعتماد کی بنیاد ضروری ہے جو کہ عدل و مساوات کے اصولوں پر رکھی جائے نہ کہ جبر و استبداد اور لوٹ کھسوٹ کے پرانے مسلک پر۔ اس نئی بنیاد پر پاکستان کے عوام اپنے اندرونی اور بیرونی مسائل کا حل یقینی طور پر تلاش کر سکتے ہیں۔

قادرِ مطلق خدا پر غیر متزلزل ایمان کے ساتھ جو تمام جہانوں اور انسانوں کا پالنے والا ہے اور دینِ اسلام کیلئے جذبہ غیرت رکھتے ہوئے اور پاکستان کے مقاصد کیلئے اپنے آپ کو کلی طور پر وقف کرتے ہوئے ہم سب اللہ کا نام لے کر اس عظیم کام کی ابتداء اور اتحادِ عوام کا اعلان کرتے ہیں اس یقینِ محکم کے ساتھ کہ اتحادِ عوام سے اور اجتماعی تدبّر اور سوچ بچار کی بدولت پاکستان کی خدمت میں مگن ہو کر ہم اپنے شاندار مستقبل کی طرف گامزن ہوں گے اور دنیا میں عدل و مساوات اور امن قائم کرنے کا موجب بنیں گے۔ (آمین)"

پارٹی کے پرچم کیلئے اجلاس نے مندرجہ ذیل تجویز منظور کی:۔

☆ پرچم تین برابر کے عمودی حصوں پر مشتمل ہوگا۔ دستہ کے قریب لال' درمیان میں سیاہ اور دوسرے سرے پر سبز۔

☆ ہلال اور پانچ کونہ ستارہ سیاہ حصہ میں ہو اور ہلال کے سرے باہر کی جانب ہوں۔

ملک کے معاشی ڈھانچے کو تبدیل کرنے کیلئے جو دستاویز سوشلزم کے بڑھتے ہوئے ارتقائی سفر کی بنیاد پر اس کنونشن میں منظور کی گئی اس میں لکھا گیا ہے:۔

"تقسیم کے بعد پاکستان' جہاں کہ عملاً کوئی صنعت تھی ہی نہیں' سامراج کی ایک پالتو معیشت بن گیا جو اپنی زرعی پیداوار' قدرتی وسائل اور معمولی صنعتی پیداوار کو نو آبادیاتی طاقتوں کے ہاتھ بیچنے میں مگن رہا' یہ برطانوی راج کا تحفہ تھا۔

گماشتہ سرمایہ دار اس وقت تک اپنا وجود قائم رکھ سکتا ہے جبکہ اس کی ملکی برآمد بین الاقوامی منڈی میں مستقلاً اپنی قیمت نہ کھوئے اور جب تک اس کی حکومت تجارت پر پابندیاں عائد نہ کرے۔ یہ دونوں شرطیں بہت تھوڑا عرصہ پوری رہ سکیں۔ دو واقعات نے حالات کا رُخ بدلنے پر مجبور کر دیا۔

1 - سٹرلنگ کی قیمت میں کمی

www.bhutto.org

2 - جنگِ کوریا کے بعد خام مواد کی قیمتوں میں دنیا بھر میں سرد بازاری

برطانیہ نے 1949ء میں جب پونڈ کی قیمت کم کی تو پاکستان نے اس کی پیروی کرنا ضروری خیال نہیں کیا۔ پاکستانی گماشتہ سرمایہ دار کو یہی توقع تھی کہ کم قیمت اسٹرلنگ سے وہ برطانوی اور اس کے ساتھ ہی ہندوستانی مال بھی سستے داموں خرید سکے گا اور دوسری طرف یہ کہ برطانیہ اور ہندوستان دونوں کے پاس پٹ سن خریدنے کے کوئی متبادل ذرائع نہیں ہیں' اس لئے وہ پاکستانی قیمت ادا کرنے پر مجبور ہوں گے۔ پاکستان کی دوسری بڑی برآمدی جنس یعنی روئی کی قیمت چونکہ بین الاقوامی منڈی کے حالات سے مقرر ہوتی ہے اس لئے اس پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا۔ ہوا یہ کہ ہندوستان نے پاکستانی پٹ سن خریدنے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ کو جتنی پیداوار بیچی جا سکی باقی ماندہ کیلئے پاکستان کو بڑے پیمانے پر مصنوعات کی استعداد پیدا کرنا پڑی تاکہ ہندوستانی نقصان کو پورا کیا جا سکے۔ ہندوستان کا یہ اقدام اس لئے فائدہ مند ہوا وہ اپنے اثرات مرتب کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتا اگر کوریائی جنگ کے زیرِ اثر پٹ سن اور روئی کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے بین الاقوامی مانگ میں اضافہ نہ ہو گیا ہوتا۔ پاکستانی تجارت سے زرِ مبادلہ کی کمائی 51-1950ء میں اتنی ہوئی جتنی آج تک اس کے بعد کسی سال میں نہیں ہوئی چنانچہ گماشتہ سرمایہ دار ایک دفعہ پھر پھلا پھولا اور دولتمند ہو گیا۔

جنگِ کوریا کے بعد بین الاقوامی قیمتیں تیزی سے گر گئیں اور پاکستان کے زرِ مبادلہ کے محفوظ ذخیرے بھی تیزی سے ختم ہونے لگے چنانچہ گماشتہ سرمایہ داروں نے چیزوں کی درآمد پر ہجوم کر دیا تاکہ پابندیاں عائد ہونے سے پہلے زیادہ سے زیادہ درآمد کر لے۔ حکومت کو اقدام کرتے کرتے اتنی دیر ہو گئی کہ اس وقت ہنگامی اقدامات ہی کافی ہو سکتے تھے چنانچہ انتہائی ضروری اشیاء کے سوا ہر درآمد پر پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ امید کی گئی کہ پاکستان کسی آسان راستے پر صنعتکاری شروع کر سکتا ہے اور سب سے آسان راستہ روئی کی صنعت کا تھا۔ اس صنعت کا کچھ تجربہ پہلے سے موجود تھا۔ مانگ کے بارے میں یقین تھا کہ یہ ہمیشہ قائم رہنے والی ہے اور خام مال بھی وافر مقدار میں میسر تھا۔ یہ آخری نقطہ بڑا فیصلہ کن تھا کیونکہ روئی پیدا کرنے والے بڑے طاقتور مفادات رکھتے تھے اور بین الاقوامی سرد بازاری کے بعد کم از کم ایک وسیع گھریلو منڈی سے اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔

صنعت کاری کے اس دوسرے دفعتاً ابال میں پٹ سن کی صنعت بھی اور تیزی کے ساتھ پھیلی کیونکہ جنگِ کوریا کی خوش وقتی کے بعد اسے بھی کافی نقصان پہنچا تھا لیکن روئی کی صنعت کی پیداواری صلاحیت تو ہر چیز سے بڑھ گئی۔ سوتی پارچات کی کمی اور متبادلات کے فقدان نے قیمتیں چڑھا دیں اور بعض ملوں نے تو شروع ہونے کے ایک سال بعد ہی پورا سرمایہ وصول کر لیا۔ قیمتیں اتنی چڑھ گئیں کہ 54-1953ء میں حکومت کو مجبوراً زیادہ سے زیادہ قیمتیں مقرر کرنا پڑیں حالانکہ یہ بھی اتنی کم نہیں تھیں کہ سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی ہوتی۔

www.bhutto.org

اگرچہ صنعتی صلاحیت بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی لیکن برآمدی محصولات مسلسل گھٹ رہی تھیں۔ جلد ہی وہ اس سطح تک گر گئیں کہ پاکستان کو روپے کی قیمت کم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ اس اُمید پر کیا گیا کہ روئی اور خصوصاً پٹ سن عمومی قیمتوں کے باوجود بھی مقابلہ میں ٹھہر سکیں گی لیکن بین الاقوامی منڈی مسلسل گرتی گئی اور برآمدات سے زرِ مبادلہ کی وصولی بھی کم ہوتی گئی حتیٰ کہ 59-1958ء میں یہ آمدنی اس کا ایک تہائی رہ گئی جو کہ 51-1950ء میں تھی۔ اب چونکہ سرمایہ ایسی مصنوعات میں لگایا گیا تھا جن کی قیمتیں باہر کی دنیا میں مسلسل اور تیزی سے گر رہی تھیں اس لئے ان کی درآمد سے بے نیاز ہو کر بہت کم بچت کی جا سکی۔

حکومت نے بھی کوشش کی کہ سرمایہ داروں کی مدد کی جائے اور اس کیلئے مصنوعات کے مقابلہ میں مزدوروں کی اشیائے صرف خصوصاً غلّے کی قیمت کم کر دی گئی۔ مقصود یہ تھا کہ اس سے مزدوروں کی قیمتِ محنت کم ہو جائے گی اور اس طرح منافع کی شرح بڑھ جائے گی اور اسی نسبت سے سرمایہ کاری لیکن زراعت پر اس کا تباہ کن اثر تھا کیونکہ کم شرح منافع کی وجہ سے کسانوں کی طرف کوئی سرمایہ منتقل نہیں ہو رہا تھا۔ نتیجتاً غلے کی اسمگلنگ بڑے پیمانے پر شروع ہو گئی۔ غلہ اسمگل کرنے کی ترغیب سب سے زیادہ اس وقت تھی جب روپے کی قیمت کم نہیں ہوئی تھی لیکن بعد میں بھی غلّہ کی کم قیمتوں نے یہ ترغیب قائم رکھی۔ گندم اور چاول ہندوستان اور افغانستان کی مصنوعات 'ڈالر یا صرف ہندوستانی کرنسی کے عوض اسمگل کیا جاتا تھا اور پاکستان میں حاصل ہونے والے فائدے سے کئی گنا زیادہ فائدہ حاصل کر لیا جاتا تھا۔ ناموافق موسم نے بھی اپنا رنگ دکھایا اور حکومت کی پالیسی نے ملک کو خوراک کی کمی کے سنگین مسئلے سے دوچار کر دیا۔ پاکستان کو امریکی امداد کا آغاز سکّہ کی قیمت کم کرنے سے پہلے ہو گیا تھا لیکن اس نے ان وجوہ کو ختم کرنے میں کوئی خدمت سرانجام نہ دی جن کی وجہ سے سکّہ کی قیمت کم کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ غلّہ کی قیمت پہلے سے بھی کم کر دی گئی اور بڑی صنعتوں میں سرمایہ لگانے کی مزید حوصلہ شکنی کی گئی اور اگر اس سلسلہ میں کچھ ہوا بھی تو کاریں جوڑنے یا اس قسم کے دوسرے کارخانوں میں سرمایہ لگا دیا گیا۔ مزید برآں ملک کا انحصار اس بیرونی امداد پر اور بھی بڑھتا گیا کیونکہ ملک کی برآمدی تجارت گھٹ رہی تھی۔

جب مارشل لاء کا اعلان کیا گیا تو برآمدات کی آمدن بالکل ختم ہو چکی تھی۔ سیاسی بحران یکے بعد دیگرے تیزی سے آئے اور چلے گئے۔ علاقائی چپقلش ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئی۔ یہ وجوہ تھیں کہ نئی حکومت کو کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ سوائے ان لوگوں کے جن کی نگاہ سیاسی بے چینی کے پسِ پردہ اقتصادی قوتوں کی کارفرمائی کو دیکھ سکتی تھی یا کچھ کچھ ان لوگوں سے جنھیں یہ اعتماد نہیں تھا کہ حکومت مسائل کو حل کرنے کے قابل ہے یا نہیں حل کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔

نئی قوتِ حاکمہ کا پہلا کام بہت سی چیزوں کی بڑھتی ہوئی قیمت کو کم کرنا تھا۔ قیمتوں کی یہ تیزی دو کنٹرول کے بغیر منتقل نہیں کیا جا سکتا لیکن یہاں تو کنٹرول آہستہ آہستہ ختم ہونے والے تھے۔

www.bhutto.org

وجوہ کی بناء پر تھی۔ اولاً زرِ مبادلہ کی کمی اور کرنسی کے پھیلاؤ نے بیرونی اشیاء کو بہت مہنگا کر دیا اور وہ درآمد کنندگان جن پر درآمدی لائسنسوں کا خاص لطف و کرم تھا مزے سے یہ بلند قیمتیں وصول کرتے رہے۔ ثانیاً مصنوعات پیدا کرنے والوں نے خصوصاً سوتی ملوں کے مالکوں نے یہ سیکھ لیا کہ کیسے گٹھ جوڑ کر کے پیداوار محدود کی جا سکتی ہے اور قیمتیں بڑھائی جا سکتی ہیں۔ اس طرح دہ 54-1953ء کے دنوں کی طرف لوٹ گئے۔ مارشل لاء سے چند ماہ تک تو قیمتوں میں کمی رہی لیکن پھر تاجروں پر یہ راز کھل گیا کہ یہ سب خالی خولی دھونس تھی جس پر مزید عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی جذبے سے کچھ عرصے کیلئے بلیک کی کمائی اور زرِ مبادلہ کے ذخیروں کو رضا کارانہ طور پر باہر کی ہوا لگائی گئی۔

نئی حکومت نے ملک کو درپیش ایک مشکل کا بڑے واضح انداز میں احساس کر لیا یہ تھی زرِ مبادلہ کی کمی۔ اس سے روپیہ کی شکل میں تو ان لوگوں کو بہت منافع مل جاتا تھا جنھیں لائسنس یا سرمایہ کاری کا اجازت نامہ مل جاتا تھا لیکن صنعتی پھیلاؤ بہت محدود ہو گیا تھا۔ بیرونی امداد حاصل کرنے کیلئے پاکستان نے سیاسی اور فوجی پابندیاں بہت سال پہلے قبول کر لی تھیں۔ درحقیقت تجارت میں خسارہ 57-956ء سے پہلے ہوا ہی نہیں تھا۔ اس سے پہلے اوسطاً تجارت متوازن تھی اور امداد صرف غلہ اور فوجی سامان تک محدود تھی لیکن 1958ء میں تجارت متوازن ہونے کے لگ بھگ بھی نہیں پہنچی۔ درآمدات پھیلتی گئیں اور برآمدات بہت آہستہ آہستہ بڑھ سکیں جس کا نتیجہ کیا تھا؟ ہماری سرمایہ کاری کی حکمتِ عملی پر مکمل غیر ملکی کنٹرول اور سیاسی، فوجی اور ثقافتی غلامی۔

بڑھتا ہوا بیرونی اثر و رسوخ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا مثلاً خارجہ پالیسی اور ہارورڈ ایڈوائزری گروپ کی شکل میں۔ یہ گروپ پاکستانی منصوبہ بندی کیلئے امریکی عقل و خرد کی سوغات ہے اور پلاننگ کمیشن کے ہر کام پر چھایا ہوا ہے۔ پاکستانی ماہرینِ معاشیات یا تو اتنے قابل نہیں تھے یا سیاسی طور پر اتنے باشعور نہیں تھے کہ گروپ نے جو امریکی نظریات ہم پر ٹھونسے ان کی مخالفت کر سکتے چنانچہ دوسرا پنج سالہ منصوبہ امریکی لبرلزم اور پاکستانی سرمائے کے گٹھ جوڑ سے پیدا ہوا اور دونوں طرف کسی کو یہ واضح احساس نہیں تھا کہ وہ کون سی وجوہ ہیں جو دوسرے کو اکثر اپنے ہی مفادات سے ٹکرانے پر مجبور کرتی ہیں۔

پاکستانی تاجروں کیلئے مسرت و شادمانی کی وجہ یہی تھی کہ اب زرِ مبادلہ بکثرت تھا اور ہارورڈ والے مطمئن تھے کہ آزادانہ تجارت کا نظریہ پھل پھول رہا تھا۔ ہارورڈ والوں نے مسئلہ کو جتنا سمجھا وہ یہی تھا کہ آزادانہ تجارت کی حکمت عملی رائج کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو آزاد تجارت کے اصولوں کے تحت سرمایہ دارانہ مفادات اور اپنے اغراض و مقاصد میں مطابقت پر عمل درآمد کیا جائے پھر جب سرمایہ داروں اور منصوبہ بندی کرنے والوں میں مکمل مطابقت پیدا کرنے میں ناکامی ہو گئی تو منصوبوں کو سرمایہ داروں کے میلانِ طبع میں ڈھالا گیا۔ لبرلزم کی بدقسمتی یہ ہے کہ تاجروں کی بچت کو سرمایہ کاری کی طرف براہِ راست وہ فیصلہ کن سرمایہ جس پر حکومت کا براہ راست اور مکمل کنٹرول تھا زرِ مبادلہ تھا لیکن بونس ووچر کے نفاذ نے یہ صورت بھی الٹ دی۔ اس نظام کا مقصد برآمد کنندگان اور صنعتکاروں کو سب سڈی مہیا کرنا

www.bhutto.org

تھا اور مقابلتاً زرِ مبادلہ کی آزاد تجارت کی اجازت دیتا تھا۔ بونس ووچر کے منڈی میں آجانے سے درآمد کنندگان رنگارنگ چیزوں کی درآمد میں آزاد تھے گو ان کی قیمت نسبتاً زیادہ تھی۔ مزید برآں چونکہ دولت کی تقسیم بہت زیادہ غیر مساوی ہو چکی تھی اس لئے ان درآمدی اشیاء کو امیروں کے گھرانوں میں بڑی آسان منڈی مل گئی کیونکہ صرف یہ امیر گھرانے ہی غریبوں کی نسبت اس درآمدی سامانِ تعیش کے خریدار بن سکتے تھے۔ یہ بات بھلائی نہیں جانی چاہئے کہ بونس ووچر کا نفاذ ایک جرمن ماہر کی سفارش پر کیا گیا تھا لیکن اس کا مقصد مارشل لاء کے آغاز میں ایک وقتی ضرورت کو پورا کرنا تھا اس کے نزدیک بھی اس طریق کو مستقل کر دینا غیر مناسب تھا کیونکہ اس طرح زرِ مبادلہ کو اشیائے صرف پر خرچ کرنے کی کھلی چھٹی مل جائے گی اور دراصل ہوا بھی یوں ہی ہے۔

ہارورڈ کے ماہرینِ علم جس مغالطے میں پھنسے ہوئے تھے وہ تھا قومی پیداوار کے اضافے کو اقتصادی ترقی کے مترادف تصور کرنا۔ مجموعی قومی پیداوار کے تصور میں تو بینکاری اور اشتہار بازی کی خدمات بھی شامل ہیں۔ اس لئے ضرورت یہ ہے کہ کوئی بہتر اور محتاط کسوٹی تلاش کی جائے۔ اب حقیقت یہ ہے کہ دوسرے پنج سالہ منصوبہ میں قومی دولت میں ساٹھ فیصد اضافہ ایسی ہی خدمات کا مرہونِ منت ہے۔

ان ساری چیزوں کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ 1952ء کے بعد پاکستان نے جو بھی ترقی کی ہے اس نے قومی معیشت کو مستحکم نہیں بنایا۔ بہت زیادہ براہِ راست کھپت اور اشیائے صرف میں روپیہ لگانے کی اجازت دے دی گئی۔ قوم کو بیرونی امداد کی غلامی سے آزاد کرنے کیلئے بڑے پیمانے پر انجینئرنگ کا آغاز نہ کیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ نجی سرمایہ کاری کو منڈی ملنے کا یقین نہیں تھا اور خارجی مفادات اعداد کو اس شعبہ میں خرچ کرنے پر معترض تھے کہ مبادا پاکستانی منڈی میں اسے مسابقت کا سامنا کرنا پڑے۔ انجینئرنگ یا دھاتوں کی بڑی صنعت میں روپیہ لگانا اسی صورت میں زیادہ منفعت بخش ہو سکتا تھا اگر پلانٹ کا سائز بڑا ہو۔ نہ صرف پاکستانی سرمایہ داران میں روپیہ لگانے میں گریزاں تھا بلکہ خارجی مفادات بھی اس کی مخالفت کر رہے تھے چنانچہ پہلے تو چھوٹے پلانٹ کیلئے تحقیقاتی رپورٹیں اس مفروضے پر بنائی گئیں کہ بیرونی امداد میسر نہیں اور پھر یہ اعلان کر دیا گیا کہ یہ صنعت تو بہت مہنگی ہے اور آزادانہ مسابقت کی تاب نہیں لا سکے گی۔ پاکستان نے سوتی ملوں میں ضرورت سے زیادہ روپیہ لگا دیا ہے۔ کورین خوش بختی (کوریا کی جنگ کی طرف اشارہ) کے دنوں میں زرِ مبادلہ کی افراطِ زر سے انجینئرنگ کی صنعت کا آغاز کیا جا سکتا تھا جو ہلکی صنعت کا محدود آغاز ہی ہوتا۔ روئی کی صنعت میں کچھ روپیہ لگانا تو ضروری تھا تاکہ بیرونی ملکوں پر انحصار کچھ کم ہوتا۔ ایسا کرنا ان مصنوعات کیلئے بھی ضروری تھا جو صرف پاکستان ہی میں بن سکتی تھیں لیکن اس میں اتنا زیادہ سرمایہ لگا یا گیا کہ آج ہمیں وہ مصنوعات برآمد کرنی پڑ رہی ہیں جن کی قیمت دنیا بھر میں کم ہوتی جا رہی ہے۔ کوئی بھی صنعتکار اپنی آزادانہ مرضی سے تو اس قسم کی صنعت میں روپیہ نہیں لگائے گا لیکن اگر صنعت کاروں نے پھر بھی اس میں روپیہ لگایا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ انہیں زیادہ قیمتیں وصول کرنے میں زیادہ تحفظ دیا گیا۔ اس طرح عام آدمی کا گھاٹا سرمایہ دار کا منافع بن گیا۔

www.bhutto.org

معاشی حقائق

ایک غریب ملک کو جہاں شرحِ مزدوری کم ہو' اس امیر ملک کے مقابلے میں جہاں شرحِ مزدوری زیادہ ہے اپنی مصنوعات کو سستے داموں بیچنے کی زیادہ صلاحیت ہونی چاہئے۔ جن پیداواری ٹیکنیکز میں ہنرمندی کی ضرورت ہے ان میں مہارت پیدا کرنے میں تو وقت لگتا ہے اور اس قسم کے منصوبوں کی ابتدائی مشکلات پر حکومتی تحفظات کے بغیر قابو بھی نہیں پایا جاسکتا لیکن یہ تحفظات درآمدات پر کنٹرول یا ٹیرف کی پابندیوں سے مختلف بات ہے جو اب پاکستانی معیشت کی مستقل خصوصیت بن گئی ہے۔

پاکستان اگر بڑے پیمانے پر صرف روئی اور پٹ سن کی مصنوعات ہی برآمد کر سکتا ہے اور وہ بھی بونس ووچر کے سہارے تو ظاہر ہے کہ ہمارے سرمایہ دار نے اپنی تجارت کی مشکلات اور سختیوں سے دامن کشی کی کوشش کی ہے۔ اس کی بجائے انہوں نے ان سادہ اور آسان صنعتوں تک ہی خود کو محدود رکھا۔ جن کی پیدائش روزمرہ کی زندگی کیلئے ضروری تھی۔ پھر تحفظات کے ایک گورکھ دھندے سے انہوں نے قیمتیں اتنی بڑھا دینے میں کامیابی حاصل کرلی کہ اکثر حالتوں میں پوری فیکٹری کی قیمت ایک ہی سال میں وصول ہوگئی بلکہ کئی صورتوں میں یہ منافع کئی گنا بڑھ گیا۔ منافع بڑھانے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ سرمایہ سستے داموں حاصل کیا جائے۔ یہ مقصد بنکوں اور دوسرے حکومتی اداروں سے سستی شرح پر قرض لے کر پورا کیا گیا۔ یہ بوجھ آخر کار بچت کرنے والوں اور ٹیکس دھندگان پر پڑتا ہے۔ پاکستانی روپے کی شرحِ مبادلہ بھی اونچی رکھی گئی تاکہ تاجروں کو درآمدات سستے داموں پڑیں اس امر کا کوئی خاص لحاظ نہ رکھا گیا کہ قوم کو مجموعی

www.bhutto.org

طور پر اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی۔ بالآخر 1955ء میں روپے کی قیمت کم کر دی گئی۔

اس قسم کی چالبازیاں قومی دولت میں اضافہ کی نمائندہ نہیں۔ ان سے ایک ہی مقصد پورا ہوتا ہے کہ سستی مزدوری' سستے سرمائے اور قیمتیں بڑھا کر زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جائے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ پاکستانی سرمایہ داری 'اس اقدام کیلئے رضامند نہیں جسے آزادانہ مسابقت کہا جاسکے یعنی آزاد اور شدید مقابلہ اور محنت کوشی۔ اس کی بجائے اس نے ہتھکنڈے استعمال کر کے اپنے لئے ایک ایسا مقام پیدا کر لیا ہے کہ نجی منافع قومی نقصان بن کر رہ گیا ہے۔ اس قسم کی چالبازیوں کی کثرت نے جس سے پاکستانی سرمایہ دار زیادہ سے زیادہ منافع کماتا ہے ایک ہی نتیجہ پیدا کیا ہے کہ دولت گنتی کے چند سرمایہ داروں کے طبقہ میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ آج پورے ملک کی معیشت کس طرح صرف چند خاندانوں کے قبضہ میں ہے۔ یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی عوام میں سے بہت کم لوگوں کی حقیقی آمدنی 1947ء کے مقابلے میں بڑھی ہے' مزدور بیچارہ اب پہلے سے بھی زیادہ زبوں حال ہے۔

پاکستانی معیشت میں سرمایہ لگانے کیلئے بچت مشتمل ہے 'بڑے سامان کی پیداوار پڑ یا اس زرِ مبادلہ کی کمائی پر جو اپنی کھپت سے بچ جائے یا اس محنت کو حرکتِ عمل میں لانے پر جسے سرمایہ کی پیداوار میں بغیر کھپت بڑھائے ہوئے مصروفِ عمل کیا جاسکتا ہو۔ آزاد مقابلے کے اصول کی تختی سے تیسرا امکان بالکل ختم ہو جاتا ہے حالانکہ یہی سب سے زیادہ اہم ہو سکتا ہے۔ شہری اور دیہاتی آبادی کا معتدبہ حصہ بیکار رہتا ہے اور بہت بڑا حصہ اپنی بروزی ان سرگرمیوں سے کماتا ہے جہاں پہلے ہی گنجائش کم ہے۔ مثال کے طور پر اگر دو کسان ایک کھیت کو اس طرح کاشت کرتے ہیں کہ ایک کی کارگزاری بھی اس سے کم نہیں ہوگی تو ظاہر ہے وہ دونوں صرف اتنی ہی دولت پیدا کر رہے ہیں جتنی کہ ایک پیدا کر سکتا تھا۔ اس کا واضح حل یہی ہے کہ ایک کسان کیلئے دوسرا پیداواری کام ڈھونڈا جائے اور صرف ایک کو کھیت میں رہنے دیا جائے اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ساری قوم کی قوتِ کار کو ایک جامع منصوبے کے تحت مصروفِ عمل کیا جائے۔ نجی سرمایہ کاری یہ مقصد سرانجام دینے سے قاصر ہے اور نہ ہی اسے اس قسم کی کوشش سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔

پاکستان میں بڑی مشینوں کی پیدائش اتنی کم ہے کہ عملاً قومی سطح پر سرمایہ کاری کیلئے بچت وہی زرِ مبادلہ کی کمائی ہے جو ہم اپنے آپ پر صرف کرنے سے بچا لیتے ہیں۔ تقریباً ساری کی ساری مشینری ہم باہر سے خریدتے ہیں اور معیشت کی نشوونما کا انحصار بیرونی امداد اور برآمدی تجارت کے اُتار چڑھاؤ پر ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماضی میں روپیہ لگانے کی حکمتِ عملی کس حد تک سرمایہ جمع کرنے میں معاون رہی ہے۔ پٹ سن کی مصنوعات کے علاوہ باقی ہر صنعت میں پاکستانی روپیہ اتنی مصنوعات کی پیداوار میں لگایا گیا ہے جو ہم پہلے درآمد کیا کرتے تھے۔ اب درآمدات بھاری مشینری پر زیادہ سے زیادہ مشتمل

www.bhutto.org

ہوتی جارہی ہیں۔ پہلی نظر میں یہ اقدام بہت صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن دَر حقیقت یہ ترقی پسندی سے بہت دُور ہے کیونکہ پاکستان نے جن برآمدات سے زرِمبادلہ کمانے کی کوشش کی ہے۔ وہ وہی ہیں جن کی قیمت بین الاقوامی منڈی میں گرتی جارہی ہے اگر شروع ہی سے معیشت کو بھاری صنعتوں کی پیداوار کی طرف لگالیا جاتا تو آج پاکستان وہی چیزیں درآمد کر رہا ہوتا جن کی بین الاقوامی قیمت گر رہی ہے اور وہ مال برآمد کر رہا ہوتا جس کی قیمتیں چڑھ رہی ہیں۔ جرأت اور ژرف نگاہی کی یہ کمی سارے ہی کم ترقی یافتہ ملکوں کی مشترکہ خصوصیت ہے۔ صرف تجارت سے ہی جتنا گھاٹا یہ ملک کھا رہے ہیں وہ اس ساری بیرونی امداد سے بہت زیادہ ہے۔ قطع نظر اس کے یہ امداد کون کون سی فوجی اور سیاسی پابندیاں اپنے ساتھ لاتی ہے اگر کم ترقی یافتہ ملک اپنی صنعتی پیداوار کو بھاری مشینری پیدا کرنے میں لگا دیتے تو خواہ تجارتی شرائط میں کوئی بہتر تبدیلی نہ بھی ہوتی تو بھی فائدے بہت زیادہ ہوتے۔ اس غلط حکمتِ عملی کو چننے کی تشریح ان ممالک کے طبیعاتی نظام اور نو آبادیاتی نظام کے اثرات میں ڈھونڈی جاسکتی ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کو واضح کرنے کیلئے سوتی کپڑے کی صنعت کو زیرِ بحث لانا کافی ہوگا۔ روئی کی قیمت میں کمی کے ساتھ سوتی کپڑے کی قیمت بھی کم ہوگئی۔ مشینری کے مقابلہ میں سوتی مصنوعات کی قیمت کم ہونے کے علاوہ بُنائی اور کتائی پر منافع بھی کم کیا جارہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوتی کپڑا خام روئی کے مقابلہ میں سستا ہو رہا تھا اور بہت سے ملکوں کی سوتی کپڑوں کی ملیں زائد پیداواری گنجائش کا شکار ہوگئی تھیں۔ اس لئے پاکستان کو چاہئے تھا کہ وہ کاٹن ملوں میں زیادہ روپیہ لگانے کے بجائے اس صنعت کو صرف اس حد تک پھیلنے کا موقع دیتا جو اسے بیرونی صنعت کاروں سے خود مختاری دِلانے کیلئے ضروری تھی۔ درحقیقت کچھ روئی پیدا کرنے والی زمینوں کو غلّہ کی کاشت میں بدلا جاسکتا تھا اور یہ غلّہ برآمد کیا جاسکتا تھا چنانچہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان نے ایک انتہائی غیر منفعت بخش راستہ اختیار کیا۔ ایسا راستہ جس پر چل کر قومی دولت کا مناسب استعمال نہیں کیا جاسکا اور جو سرمایہ کاری کی بھرپور گنجائش پیدا کرنے میں ناکام رہا۔

اس کے مقابلے میں منصوبہ بندی کمیشن نے یہ دلیل پیش کی کہ دولت کا چند ہاتھوں میں جمع ہو جانا بچت کیلئے مددگار ہوگا کیونکہ یہ امیر ہی ہیں جو اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصّہ بچا سکتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ یہ سارا گھپلا اس وجہ سے ہے کہ قومی بچت کو انفرادی دولت سے گنڈ کر دیا گیا ہے۔ سرمایہ داروں میں زرِمبادلہ کی مانگ ہمیشہ بہت زیادہ رہی ہے اور یہی حکومتی حکمتِ عملی کا افلاس ظاہر کرتی ہے۔ جب زرِمبادلہ نایاب تھا جیسا کہ 1956ء سے 1958ء تک کے سالوں میں تھا تو جمع شدہ دولت کو اس سے بہتر کوئی مصرف نہ ملا کہ پُرتکلف اور ٹھاٹھ باٹھ کے محلات بنائے جائیں۔

منصوبہ بندی کمیشن کے دلائل میں ایک سنگین کوتاہی تعلیم کو نظرانداز کرنے میں ملے گی۔ ملکی حکومت نے اسے مناسب نہیں سمجھا کہ تعلیم پر زیادہ توجہ اور سرمایہ صرف کیا جائے اور یہ اس غلط تصوّر کی

www.bhutto.org

بناء پر ہوا کہ صرف فیکٹریاں ہی حقیقی دولت ہیں۔ اسی رخنہ کے سبب شروع سے ہی ایک حوصلہ مندانہ منصوبے کے امکان کو نظرانداز کر دیا گیا۔ نتیجتاً تعلیم چند گنے چُنے لوگوں کا امتیازی حق بن کر رہ گئی۔ طبقاتی معاشرے کے پس منظر میں اس کا مطلب یہی ہوا کہ تعلیمی سہولتیں بہتر بنانے میں حکومت کی ذمہ داری کس حد تک کم ہو گئی لیکن ملک تو ابھی تک ماہر کارکن اور انجینئر پیدا کرنے کا اہل نہیں ہوا جو پیچیدہ پیداواری طریقوں کیلئے ضروری ہیں۔ جاپان کے ساتھ ایک تقابلی مطالعہ اس کوتاہی کی سنگینی کو اور بھی نمایاں کر دے گا۔ جاپان نے ہمیشہ فنی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دی ہے حتیٰ کہ کچھ یورپی ملکوں سے بھی زیادہ۔

ہُنرمندی کا اعلیٰ معیار جو اسے میسّر ہے ایسی چیزیں پیدا کرنے میں لگایا گیا جس پر محنت زیادہ صرف ہوتی ہے مثلاً کیمرے، ریڈیو، ہلکی انجینئرنگ کی اشیاء وغیرہ اور سستی مزدوری کی وجہ سے انہیں باہر کی منڈیوں میں مقابلتاً سستے داموں بیچ دیا گیا۔ یہاں کی معیشت موٹر کاروں، جہازوں، بھاری انجینئرنگ مشینری پیدا کرنے کی طرف بلا روک ٹوک بڑھتی گئی۔

پاکستان نے ابھی تک پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا۔ اس کی بجائے بہت سا زرِمبادلہ غیر ملکی صلاح کاروں پر خرچ کر دیا جاتا ہے یا غیر ملکی سرمایہ اور اس کی لگی بندھی مہارتوں کی تلاش کی جاتی ہے جبکہ یونیورسٹیاں اس معیار سے بہت پست رہ گئی ہیں جو ترقی کیلئے ضروری ہے۔

سرمایہ داروں کی بچت ظاہر ہے کہ ان کی سرمایہ کاری کیلئے کافی نہیں۔ کرنسی کا پھیلاؤ، حکومتی امداد اور بنکوں کے قرضے اب بھی ضروری ہیں۔ یہ سارے اقدامات عام لوگوں کی بچت کو سمیٹتے ہیں اور سرمایہ داروں کو سستے شرحِ سود پر دے دیتے ہیں۔ یہ حکمتِ عملی غیر سرمایہ دار لوگوں کو بچت کرنے سے باز رکھتی ہے اور سرمایہ زیرِ زمین چلا جاتا ہے یا بلیک مارکیٹ کی سرگرمیوں میں کھپایا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ معیشت میں سرمایہ کے مالک کو اس امر کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے منافع کو جہاں چاہے منتقل کر دے یا کاروبار میں لگائے۔ تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان میں سرمایہ کا زیادہ تر حصہ پٹ سن کی صنعت میں لگایا گیا تھا اور ان پر مغربی پاکستان کے مفادات کا تصرّف اور قبضہ تھا۔ اس صورت سے کوئی خاص فرق نہ پڑتا اگر منافع کو مناسب حد تک دوبارہ مشرقی پاکستان میں ہی لگا دیا جاتا لیکن ایسا نہ ہوا۔ روئی کی صنعت کی ساری خوش بختی مغربی پاکستان تک ہی محدود تھی کیونکہ روئی کی زیادہ تر کاشت اسی خطہ میں تھی۔ حالانکہ زرِمبادلہ جس سے مشینری درآمد کی گئی تھی مشرقی پاکستان کا کمایا ہوا تھا۔ روئی کی صنعت کے علاوہ بھی مغربی پاکستان نے درآمدات میں حصّہ مشرقی پاکستان سے زیادہ حاصل کیا اگرچہ مشرقی پاکستان کی سستی اُجرتیں پیداواری قیمت کو اتنا کم کر سکتی تھیں کہ نقل و حمل کا خرچ پورا نکل آتا۔

سرمایہ لگانے کی یہ تعمیل و تکمیل صرف اقتصادی اسباب کی بناء پر نہیں تھی۔ سرمایہ دار زیادہ تر مغربی

www.bhutto.org

پاکستانی تھے اور یہی مغربی پاکستانی تھے جنھوں نے سیاسی طور پر مشرقی حصہ پر غلبہ حاصل کیا ہوا تھا حکومت جو مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں کی اعانت پر انحصار رکھتی ہے سرمایہ لگانے کے اجازت نامے انہیں ہی دینے پر راغب تھی۔ بہت سے اقتصادی عوامل نے بھی سیاسی محرکات کو تقویت دی۔ نقل و حمل کے ذرائع مغرب میں زیادہ ترقی یافتہ تھے اور اسی طرح بنکوں کی سہولتیں اور تقسیم مال کی ایجنسیاں۔ مشرقی پاکستان میں بجلی پیدا کرنے پر کبھی توجہ نہ دی گئی جبکہ مغرب میں بڑے بڑے اور گراں قیمت بجلی گھر بنائے گئے۔ اس کے علاوہ دونوں صوبوں کے درمیان مال برداری کی سہولتیں بہت کم اور غیر یقینی تھیں۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سارے مشرقی پاکستان میں بڑے پیمانے کی مصنوعات پیدا کرنے کی صلاحیت اتنی ہی تھی جتنی اکیلے کراچی میں۔ مزید برآں اگرچہ مشرقی پاکستان نے 1951ء کے بعد ہمیشہ مغربی پاکستان سے زیادہ زرِ مبادلہ کمایا لیکن اس کی درآمدات کی قیمت اس سے آدھی بھی نہیں رہی۔

درآمدات کیلئے یہ تعینات اشیائے صرف پر ہی مشتمل تھے جس کا فائدہ آبادی کے دولت مند طبقے کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ زرِ مبادلہ بے فائدہ مصرف میں ضائع کر دیا۔ مارشل لاء کی حکومت نے اس عدم توازن کی تلافی کا دعویٰ ضرور کیا لیکن اس کی کوششیں زیادہ سے زیادہ معمولی اور اوسط درجے کی قرار دی جا سکتی ہیں اگرچہ بہت سے منصوبے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ مشرق کو سرمایہ کاری کا کچھ زیادہ حصہ میسر آ جائے لیکن اس کی عملی کارگزاری کوئی اُمید افزا نہیں۔ نجی سرمایہ اب بھی مغربی پاکستان کو ترجیح دیتا ہے اور یہی سرمایہ قومی سرمایہ کاری کا ایک بڑا حصہ ہے۔

براہ راست پیداواری کاموں میں سرمایہ لگانے کے علاوہ بھی دوسری سرمایہ کاری کی شکلوں میں یہ بیجا طرف داری نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں تعلیم کی مثال اہم ہوگی۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں مشرقی پاکستان میں نئے پرائمری سکول کھولنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ حالانکہ مغربی پاکستان میں یہ تعداد کافی بڑھائی جانی تھی۔ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور فنی گریجوایٹ پیدا کرتا ہے۔ اس کا اثر طویل عرصہ کے بعد اسی طرح محسوس ہوگا جس طرح تعلیم کے عمومی افلاس نے پورے ملک پر برا اثر ڈالا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ صنعت کاری کی جو پالیسی پاکستان نے اختیار کی وہ شروع سے ہی غلط تھی کیونکہ اس نے سرمایہ داروں کو بے تحاشا منافع بازی کا امکان دیا حالانکہ انہوں نے اس کیلئے کوئی خطرہ مول نہیں لیا اور اسی لئے انہوں نے سرمایہ کاری میں کفایت شعاری نہیں کی اور نہ ہی فیکٹریوں کو استعداد کے مطابق چلایا۔ اس کا براہ راست نقصان قوم کو ہوا یہ حکمتِ عملی اس لحاظ سے بھی غلط تھی کہ صنعتوں کا غلط انتخاب اس بناء پر کر لیا گیا کہ خام مواد کہیں پہ میسر تھا یا اس لئے کہ اینگلو سیکسن معاشیات کی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہوا تھا۔ کورین خوش بختی کے زمانہ میں بڑی صنعتوں کی بنیاد رکھنے کا سنہری موقع موجود تھا۔ سوتی ملوں میں

www.bhutto.org

سرمایہ لگانے کو ایک حوصلہ مندانہ منصوبہ کے مطابق محدود کر دینا چاہئے تھا اس کی بجائے قوم کو دنیا بھر کیلئے جولاہے بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ پہلے تو صرف اپنی ضرورت کے مطابق کپڑے بُنے جاتے تھے اب فروخت پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

غیر ملکی صلاح کار پاکستانی منصوبہ بندوں کو یہی تعلیم دیتے ہیں کہ حرفتی پیداوار کا فن بہت مشکل ہے اور ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا چاہئے جب ہماری ذہانت اس سطح تک بڑھ جائے کہ ہمیں پیچیدہ تکنیکی کام سونپے جاسکیں یہ بتادینا غیر ضروری ہے کہ یہ دلیل تو ہمارے خلاف اُبد تک استعمال کی جاسکتی ہے۔ سرمایہ دار اور مدد گزاروں سے اس سے مختلف بات کی توقع بھی نہیں کرنی چاہئے۔ یہ انتہائی شرمناک ہے کہ ہمارے نام نہاد منصوبہ بندوں نے بڑی ذلالت کے ساتھ یہ دلیل قبول کرلی ہے نہ صرف قبول کرلی ہے بلکہ بڑے فخر کے ساتھ دنیا بھر میں اس مسرت کا اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ دیکھو ہماری فرمانبرداری اور نا اہلی کی کتنی تعریف و توصیف ہو رہی ہے کہ ہم امداد کا استعمال بڑی استعداد سے کر رہے ہیں۔

لیکن قومی عزتِ نفس سے بھی زیادہ کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے قوم نے ابھی تک صنعتی بنیاد پیدا نہیں کی جو اس کی سلامتی کی ضامن بن سکے۔ ابھی تک بیرونی امداد کی ضرورت نہ صرف فیکٹریاں بنانے کیلئے بلکہ انہیں چلتے رکھنے کیلئے بھی ہے۔ اب جبکہ ویت نام کی جنگ کے سبب اور اس وجہ سے بھی کہ اینگلو سیکسن نسل کی نگاہوں میں اب ہم شرارت پسند ہو گئے ہیں امداد کم کی جارہی ہے تو ہماری صنعتوں کا پہیہ چلتے چلتے رُک گیا ہے جتنا تھوڑا بہت زرِ مبادلہ حاصل کیا جاسکتا ہے اس کیلئے قوم نے برآمدات کو چاہے وہ پٹ سن ہو یا کپاس، سب پر ہی سب سڈی دینا شروع کر دی ہے آخری تجزیہ میں یہ امداد زراعت سے آتی ہے یا صنعتی کارکنوں سے جو اپنی اشیائے صرف کیلئے زیادہ قیمت ادا کرتے ہیں۔ اب جبکہ زراعت کو سستی کھاد اور زرعی قرضے کی شکل میں امداد دینے کا منصوبہ بنایا گیا ہے تو صنعت کو نقصان پہنچے گا اور یہ بڑا دلچسپ مشاہدہ ہو گا کہ دوسرے پنج سالہ منصوبہ کی ترقی کا جو ڈھول اتنے زور و شور سے پیٹا گیا تھا وہ کب تک باقی رہتا ہے اگر سرمایہ داروں کے زرِ مبادلہ کے ذخیروں کو ہوا لگائی جائے تو کچھ فوری فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ ذخیرے جو سمگلنگ کی پیداوار ہیں یا درآمدات کی قیمت کو بڑھا چڑھا کر اور برآمدات کی قیمت کم دکھا کر جمع کئے گئے ہیں اب بے تحاشا بڑھ چکے ہیں اس حکومت سے اس نقصان کی تلافی کی کیا اُمید کی جاسکتی ہے۔ اُلٹا یہ بحران تو سرمایہ داروں کو اور بھی زیادہ چھینا جھپٹی کی طرف متوجہ کرے گا۔

شاید یہ کہا جائے کہ بیرونی امداد اس مشکل سے نجات دلا سکے گی لیکن اس کی بھی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ویت نام کی جنگ میں امریکہ کا روز افزوں دولت کا صرف اور کانگرس میں امدادی بل پر عمومی مخاصمت کے پیشِ نظر پاکستان کو چند بچے کھچے ٹکڑوں پر ہی قناعت کرنی ہوگی نہ ہی یہ امداد وصول کرنا کوئی فائدہ مند ہے کیونکہ یہ اتنی غیر پیدا آور ہے کہ قوم کا ان قرضوں کی ادائیگی میں خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑا جا

www.bhutto.org

رہا ہے۔ یہ کتنا عبرت ناک منظر ہے کہ وہی حکومت جو خود کو بیرونی قرضوں کے حصول میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہونے کی دعویدار تھی۔ اب بھیک مانگ رہی ہے کہ سود کی شرح کو کم کر دیا جائے بلکہ یہاں تک کہ ہندوستان کی طرح ہمیں بھی کچھ عرصے کیلئے قرضوں کی واپسی سے معاف کر دیا جائے۔

یہ زائد شرح سود ہی نہیں جو امداد کو ناقابلِ قبول بناتی ہے۔ بہت سی امداد اشیائے صرف کی صورت میں آتی ہے۔ حکومت کا رویہ یہ تھا کہ زراعت کو چاہے نظر انداز کر دیا جائے اور غلّہ کی پیداوار میں جو کمی ہوا سے امریکہ سے 480۔ پی ایل کے تحت امداد سے پورا کر لیا جائے۔ یہ اسی واہیات پالیسی کا نتیجہ ہے کہ زراعت بُری طرح متاثر ہوئی ہے اور ہم آج یہ پروپیگنڈہ سننے پر مجبور ہیں کہ "بڑھاؤ کھیت کی پیداوار"۔

اشیائے صرف کی امداد کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ یہ فوری طور پر مصرف میں آ جاتی ہے۔ حکومت کی فضول خرچی نے یہ اسباب پیدا کر دیئے ہیں کہ امداد فوری طور پر امیر آدمی کی تعیش پسندی پر خرچ ہو جاتی ہے اور اس طرح آنے والی نسلوں کو وہ قرض ادا کرنے کیلئے چھوڑا جا رہا ہے جو انہوں نے حاصل نہیں کیا۔ حکومت کا یہ اسراف بونس ووچر سسٹم سے اور بھی بڑھ گیا ہے کیونکہ بیرونی امداد بونس ووچر کا بھاؤ کم رکھنے میں معاون ہے اور اس طرح کھپت کا رجحان بڑھ رہا ہے۔

قرضوں کی ادائیگی کے بھاری بوجھ اور برآمدی پروگرام کی مکمل ناکامی نے حکومت کو تقریباً پاگل بنا دیا ہے۔ حکومت اب اتنی مضطرب ہے کہ اب وہ صنعت سے زراعت کی طرف بھاگ اٹھی ہے کہ شاید یہیں کوئی معجزہ ہو جائے اور دیکھئے ہمیں معجزنما گندم اور معجزنما چاول مل گئے ہیں یعنی دونوں صوبوں کیلئے ایک ایک معجزہ۔ اب پروپیگنڈہ کی قوت سے جو ظاہر ہے کہ کھاد کا بدل نہیں ہو سکتا اور جس کے پیچھے عملی اقدامات کی قوت نہیں۔ یہ توقع کی جا رہی ہے کہ ایک ہی سال میں ملک خوراک کے بارے میں خود کفیل ہو جائے گا۔ اتنے عرصے میں امریکی امداد اس غلّہ کی کمی پوری کر دے گی جو ہندوستان کو سمگل ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان اس وقت خود کفیل ہو گا جب وہ اپنے ہمسایوں کی خوراک کی ضروریات بھی پورا کرنے لگے گا۔

فوری امکانات بڑے تاریک ہیں۔ محدود بیرونی امداد سے کرنسی کا پھیلاؤ بڑھے گا۔ قیمتیں پہلے ہی تیزی سے بڑھ چکی ہیں اور اب یہ رفتار اور بھی تیز ہو جائے گی اگر حکومت نے کرنسی کے پھیلاؤ کو روکنے کی تدابیر نہ کیں تو ان تدابیر سے صنعتی پیداوار کو نقصان پہنچنا لازمی ہے۔ مزدوری کی شرح اس سے بھی گھٹا دی گئی جو عام زندگی کیلئے ضروری ہے۔ وہ مزدور جس نے آج تک صنعتی ترقی کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اب مجبور ہو گا کہ کرنسی کے پھیلاؤ کی وجہ سے اپنی زبوں حالی کا مزید تماشہ کرے۔ بے روزگاری اتنی ہی زیادہ ہے جتنی کبھی پہلے تھی اور یہ لازماً بڑھتی جائے گی جب تک کوئی نئی قیادت قومی قوتوں کو متحرک کرنے کیلئے میدان میں نہیں آ جاتی۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

ملکی سالمیت کیلئے کوششیں

پاکستان پیپلز پارٹی کے مخالفین کا پسندیدہ الزام یہ ہے کہ بھٹو نے ملک توڑنے میں اہم کردار ادا کیا حالانکہ وہ پہلے پاکستانی سیاستدان تھے جنہوں نے علیحدگی کے امکانات کا سب سے پہلے اندازہ لگا کر حقیقی اسباب کو دُور کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ یہ بدقسمتی تھی کہ فوجی حکمرانوں نے طاقت کا اندھا دھند استعمال کر کے 'سیاسی عمل کے سارے راستے بند کر دیئے اور اقتدار اس وقت چھوڑا جب مشرقی پاکستان کا کنٹرول جنرل اروڑہ کے ہاتھوں میں دیدیا گیا۔ تاریخی حوالے کیلئے ضروری ہے کہ بھٹو کے ان تصورات کا جائزہ لیا جائے جو وہ اس مسئلے کے سیاسی حل کے سلسلے میں رکھتے تھے۔ اس وقت ملک کے اقتصادی بحران کے علاوہ 'یہ بات ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ پیپلز پارٹی جب وجود میں آئی اس وقت مشرقی پاکستان کی قومیت نے اپنی خود مختاری کی زبردست جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ مشرقی پاکستان میں اس جدوجہد کی قیادت عوامی لیگ کر رہی تھی اور اس کے ساتھ روس نواز لیفٹسٹوں نے بھی اتحاد کر رکھا تھا جبکہ مشرقی پاکستان کے چین نواز کمیونسٹ بھی مکمل خود مختاری تو مانگتے تھے لیکن الیکشن 1970ء کے بعد وہ عوامی لیگ سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ پاکستان میں حکومت کی طرف سے مشرقی پاکستان کی اس قومی تحریک کو تسلیم ہی نہیں کیا جا رہا تھا اور دائیں بازو کی پارٹیاں بھی اس کی مخالفت کر رہی تھیں جبکہ پیپلز پارٹی نے عوامی لیگ کے منشور کی تو مخالفت کی تھی لیکن مارکسٹ لیننسٹ کمیونسٹ پارٹی آف ایسٹ پاکستان کے منشور کے بارے میں کوئی مخالفانہ بیان بازی نہیں کی تھی۔ اس صورتحال میں پیپلز پارٹی نے عوامی لیگ کے چھ نکات

www.bhutto.org

کے بارے میں جو مؤقف اختیار کیا اسے بھی پارٹی کو جنم دینے والے کنونشن کے اجلاس میں ایک بنیادی دستاویز کے طور پر منظور کر لیا گیا اس دستاویز میں لکھا گیا تھا۔

"عوامی لیگ پارٹی کے صدر اور چھ نکاتی فارمولا کے مصنف شیخ مجیب الرحمن کو قید کی صعوبتیں سہتے ہوئے ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ ایک انسان کو تو جیل میں ڈالا جا سکتا ہے لیکن خیالات کو کال کوٹھڑیوں میں بند نہیں کیا جا سکتا! شیخ صاحب اگرچہ اپنی آزادی سے محروم کر دیئے گئے ہیں لیکن ان کے ذہن کی پیداوار ہر کس و ناکس کے علم میں ہے اور ان کے اس اعلان کے محرک جذبہ میں ہماری قوم کے کروڑوں افراد برابر کے شریک ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان کے خیالات کو جانچا جائے۔ ان پر سوچ بچار کی جائے اور بحث کی جائے خواہ شیخ صاحب کو اپنے نقادوں کو جواب دینے کا موقع نہ ہی ملے۔ بہتر اور مناسب تو یہ تھا کہ شیخ صاحب اپنے عقائد کا آزادانہ طور پر دفاع اور ان کی وضاحت کرنے کے قابل ہوتے۔ اس سے نہ صرف ان کے متعلق ظاہر کئے گئے خدشات کی تردید ہو جاتی بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ اپنے سابقہ مؤقف میں کہاں تک اور کن پہلوؤں سے ردوبدل پر تیار ہیں۔ موجودہ حالات میں چونکہ شیخ صاحب سے استفسار کرنا اور ان کی رائے لینا ممکن نہیں۔ اس لئے ہم اپنی موجودہ بحث کا موضوع ان کا پمفلٹ بعنوان "چھ نکاتی فارمولا ہمارا حق زیست" مورخہ 23 مارچ 1966ء کو بناتے ہیں۔

20 صفحات کی معمولی ضخامت پر مشتمل یہ کتابچہ چھ نکاتی پروگرام پر شیخ صاحب کا اپنا تبصرہ ہے اس لئے یہ کہنا نامناسب نہیں ہوگا کہ جو کچھ اس کتابچے میں لکھا گیا ہے ان کے اپنے نظریات کی صحیح عکاسی ہے اور وہ اسے اسی شکل میں دوسروں کے مطالعہ کیلئے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ صاحب کو اپنے اس موقف کے اعلان کرنے کا حق حاصل ہے کہ اگر ان کی تجاویز پر عمل کیا جائے تو ملک کو درپیش بیشتر مسائل سے نجات دی جا سکتی ہے اور یہ اقدامات قومی اتحاد کو نقصان پہنچانے کی بجائے اس کے استحکام کا باعث بنیں گے۔ ماضی میں جو خدمات شیخ صاحب نے ملک کیلئے سرانجام دی ہیں ان کے پیش نظر ان کی ایمانداری پر شبہ کرنا نامناسب بات ہوگی اور پھر اس لحاظ سے بھی کہ جن مسائل کی انہوں نے نشاندہی کی ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی طور پر حل طلب ہیں اگرچہ ان مسائل کے حل کیلئے شیخ صاحب کے تجویز کردہ اقدامات سب سے اعلیٰ نہیں ہیں۔ اس ضمن میں خواہ ان کی خامی ظاہر بھی ہو جائے پھر بھی ان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

اپنے چھ نکاتی پروگرام کے متعلق شیخ صاحب کی طرف سے پیش کی جانے والی وضاحت انتہائی قابل احترام ہے کیونکہ اس کا تعلق شیخ صاحب کے نکات کے مفہوم اور مقاصد سے ہے لیکن اگر اس چھ نکاتی فارمولا کے ممکنہ عملی اثرات کا جائزہ لیا جائے تو معاملہ مختلف ہو جاتا ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ نتائج کسی شخص کی پیش کردہ رائے سے ہمیشہ مطابقت رکھتے ہوں۔ چنانچہ اس رائے پر کہ شیخ صاحب کی تجاویز وہی نتائج پیدا کریں گی جن کے بارے میں شیخ صاحب ہمیں یقین دلاتے ہیں مکمل انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے جو

www.bhutto.org

نسخہ ایک بیماری کے لئے انتہائی کارگر سمجھا جاتا تھا آج جدید علم اور ریسرچ نے اسی نسخے کو اسی بیماری کے لئے غیر مؤثر ثابت کر دکھایا ہے۔ جس طرح بیماری کے لئے صحیح ترین دوائی تجویز کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح قومی مسائل کے حل کے لئے بھی صحیح اقدامات تجویز کرنے کی ضرورت ہے ایسے اقدامات جو سیاست تجربہ اور چھان بین کی خوبیوں سے آراستہ ہوں۔

اصلاح کے لئے کسی بھی تجویز کے تمام ممکنہ نتائج کا پہلے سے اندازہ لگالینا آسان بات نہیں ہے لیکن اس ضمن میں سب سے پہلے اس امر کا یقین حاصل کر لینا ضروری ہے کہ کیا اس سے پیشِ نظر مقصد کو حاصل کرنے میں مدد ملے گی؟ دوسرے تجویز کے ضمنی اثرات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کیونکہ ہر تجویز میں اچھے اور برے دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ معاشیات اور سیاسیات میں ہر اہم تجویز ضمنی اثرات رکھتی ہے' چونکہ چھ نکاتی فارمولا ایسی آئینی اور انتظامی تبدیلی کی تجاویز پر مشتمل ہے جن پر عمل درآمد سے ریاست کا موجود ڈھانچہ ہی بدل جاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ تجاویز کے اس مجموعہ کا نہایت دقیق نظر سے جائزہ لیا جائے چونکہ فارمولا کی تہہ میں کارفرما مقصد واضح ہے اس لئے اس کو سمجھنے میں دقت پیش نہیں آئے گی۔ مقصد صرف یہ ہے کہ قوم کے ایک حصہ سے جب بے انتہائی اور ناانصافی برتی جائے تو ایسی صورت کی اصلاح کے لئے قدام اٹھانا انتہائی ضروری ہے۔

تلخ حقائق سے چشم پوشی اختیار کر لینا قومی خدمت نہیں ہے۔ ملک کو درپیش معاشی اور معاشرتی مسئلے خوبصورت لفظوں' نعروں یا بہانہ سازی جیسے جھکنڈوں سے حل نہیں ہو سکتے۔ اس سے صرف یہی ظاہر ہو گا کہ ارباب اختیار زیادتیوں کے خلاف انصاف پر آمادہ نہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ وہ کون سی صورتِ حال ہے جس کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکاتی فارمولا جیسے پروگرام نے جنم لیا۔ اگر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو بہت سے مسئلوں کا حل نکل آتا ہے۔ دونوں صوبوں کے عوام چونکہ ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان میں نفرت کی دیوار کھڑی کرنا کسی لحاظ سے بھی سودمند نہیں ہو گا۔ ہر ایسی صورت میں جہاں معاشی استحصال سیاسی اسباب سے مربوط ہو' اصل مسئلہ کی جڑ مخصوص مفادات کے حامل اونچے طبقے ہوتے ہیں' عوام خواہ ان کا تعلق کسی بھی علاقے سے ہو' استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔

تقسیم کے وقت پاکستان کے دونوں حصوں میں معاشی عدم مساوات کا کوئی وجود نہیں تھا۔ دونوں میں صنعتیں برائے نام تھیں۔ اس لئے ہر صوبہ کو اس میدان میں شروع سے کوشش کرنی پڑی۔ دونوں صوبوں میں مشرقی پاکستان کی پیداوار ہی زرمبادلہ کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ پٹ سن اس معاملہ میں سرفہرست تھا جبکہ مغربی پاکستان میں کاشت ہونے والی کپاس کا دوسرا نمبر تھا اگرچہ کوریا کی جنگ کے مختصر عرصہ میں کپاس پٹ سن پر بھی سبقت لے گئی تھی دوسرے تمام پسماندہ ممالک کی طرح پاکستان بھی بین الاقوامی مارکیٹ میں خام اشیاء مہیا کرتا تھا۔ صنعتوں کا قیام جس پر ملکی خوشحالی کا دارومدار تھا ان خام اشیاء کی برآمد سے حاصل ہونے والی دولت سے ممکن ہوا چونکہ پٹ سن زرمبادلہ کمانے کا سب سے بڑا

www.bhutto.org

ذریعہ تھا اس لئے ملکی درآمدات کی ادائیگی مشرقی پاکستان کی پیداوار سے کی گئی۔ درآمدات کے زمرے میں نقد ادائیگی کے بدلے منگوائی جانے والی ہر چیز شامل ہے۔ مثلاً صنعتی مال، دفاعی سامان، رولنگ سٹاک، تیل اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں وغیرہ وغیرہ۔ اس زرمبادلہ کی بدولت بیرونی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والے پاکستانی طلباء کا خرچ، سفارتی عملہ کے اخراجات، فنی ماہرین کی بیرونی ممالک میں تربیت کا خرچ اور بین الاقوامی انجمنوں کو چندہ بھی ادا کیا جاتا رہا۔

شروع میں دفاعی افواج میں مشرقی پاکستان کے لوگ کم ہونے کے برابر تھے سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر فائز اشخاص میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کی نسبت قلیل تعداد تھی اور مرکزی ملازمتوں کے نچلے درجوں میں ان کی نمائندگی نسبت کم تھی چنانچہ مشرقی پاکستان کے مفاد کے سراسر خلاف روپے کے خرچ میں عدم توازن قائم تھا پاکستان کی تاریخ کے بیس سالہ دور میں اس عدم مساوات کو دور کرنے کی کوئی صورت نکالی جا سکتی تھی اور وسیع صنعتی ترقی کے پیش نظر اس مسئلہ کا حل اور بھی آسان ہو سکتا تھا اگر مخصوص مفادات کے حامل حلقوں کی ناجائز حوصلہ افزائی نہ کی جاتی ۔ برطانوی سامراج سے ورثہ میں حاصل ہونے والے نوآبادیاتی تعصبات سے بھی نجات حاصل کرنا ضروری تھا اگر دوسری جنگ عظیم میں جاپان کا عملی مظاہرہ ناکافی ہے تو موجودہ دور میں ویت نامیوں کی جدوجہد سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ چاول کھانے والے لوگ کسی بھی لحاظ سے گندم کھانے والوں سے کم جنگجو نہیں ہیں۔

ملازمتوں میں عدم مساوات کا مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ جس نے وقت گذرنے کے ساتھ خود بخود سنگین شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کے برعکس یہ عدم مساوات پہلے مرحلوں میں آہستہ اور پھر تیزی سے غائب ہو جاتی اگر شروع سے ہی مشرقی پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے قیام پر توجہ دی ہوتی چونکہ ایسا نہیں کیا گیا اس لئے نتیجہ سامنے ہے۔ مشرقی پاکستان میں تعلیمی معیار بلند ہونے کی بجائے گرتا چلا گیا اس کے مقابلہ میں مغربی پاکستان میں تعلیم پر زیادہ توجہ دی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت کی اقتصادی پالیسیوں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے نئے امیر خاندانوں کے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع بھی میسر آنے لگے۔ حکومت کی معاشی پالیسی اور تعلیم کے بارے میں مشرقی پاکستان سے مکمل بے اعتنائی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی عدم مساوات دونوں صوبوں میں منافرت کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اصل برائی تو غلط معاشی پالیسی کو اپنانے سے پیدا ہوئی ہے۔ بھاری صنعتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی جو ملک کو صنعتی میدان میں خود کفیل بننے میں مدد دے سکتی تھیں اگر اس سلسلہ میں کوشش کی جاتی تو سرکاری سرمایہ کا خرچ ہونا لازمی بات تھی کیونکہ ایسی صنعتیں قلیل مدت میں زیادہ نفع پیدا نہیں کرتیں چنانچہ سارا زور جلد نفع کمانے والی نجی ملکیتوں کی صنعتوں پر صرف کیا گیا اور انہیں مارکیٹ میں مقابلہ کے خلاف اتنا تحفظ دیا گیا کہ صارفین کو بدترین استحصال کا سامنا کرنا پڑا جو سرمایہ دار اس میدان میں سامنے آئے ان کی تمام تر پونجی بینکوں سے لئے گئے قرض پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان صنعتوں سے جنہیں سرکاری

www.bhutto.org

تحفظ حاصل تھا اس تیزی سے دولت حاصل ہوئی کہ سرمایہ دار کے سرمائے میں ایک دو سال کے اندر کئی گنا اضافہ ہوا۔ حکومت بھی پی آئی ڈی سی کے ذریعہ صنعتیں قائم کر رہی تھی لیکن انہیں عوام کے مفاد کیلئے چلانے کی بجائے بالآخر سرمایہ داروں کے حوالے کرنے کیلئے تیار کیا جا رہا تھا۔ لوٹ کھسوٹ کے اس نظام میں جس شخص نے بھی سرمایہ لگایا (اکثر اوقات بینک کی مدد سے) اسے اپنی دولت میں بے پناہ اضافہ کرنے کے خوب مواقع میسّر آئے اور یہ چہیتے لوگ زیادہ تر مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے جس حساب سے ان کی دولت میں اضافہ ہوا اسی حساب سے دونوں صوبوں میں عدم مساوات بھی بڑھتی گئی۔ ان لوگوں نے مشرقی پاکستان میں بھی صنعتوں پر قبضہ جمالیا چنانچہ وہ بڑی آسانی سے مشرقی پاکستان میں کمائی ہوئی دولت کو مغربی پاکستان میں منتقل کرنے لگے۔ دولت کو پیدا کرنے والا مشرقی پاکستان بذات خود ایک دیہی غربت خانہ بن کر رہ گیا۔ یہ صرف ایک خود غرض نظامِ سرمایہ داری کی ہی کارگزاری ہے کہ دولت کا فرق کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ امیر 'امیر تر ہوتا جا رہا ہے اور غریب 'غریب تر ہو رہا ہے' مشرقی پاکستان کی نسبتاً پس ماندگی کی دو وجوہ ہیں۔

1 - ایسا معاشی نظام جس کا لازمی نتیجہ عوام کا استحصال ہے

2 - تعلیم کے بارے میں مشرقی پاکستان سے مجرمانہ بے اعتنائی

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی پاکستان کو درپیش موجودہ مسائل کے متعلق شیخ مجیب الرحمٰن کی تشویش جائز اور مبنی برحق ہے اب ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ کیا ان کے پیش کردہ چھ نکات اس صورتحال کا صحیح حل ہیں؟

چھ نکاتی فارمولے کے پہلے نکتہ کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

" آئین میں پاکستان کی صحیح وفاقی حکومت قائم ہونی چاہئے۔ یہ وفاق قراردادِ پاکستان منعقدہ لاہور کے مطابق پارلیمانی طرزِ حکومت کی بنیاد پر قائم ہو اور اس میں بالغ رائے دہی پر منتخب مقننہ کو بالادستی حاصل ہو۔ "

آئین کے متعلق ہمارے ملک کی غالب اکثریت موجودہ دستور کی جگہ کسی اور بہتر حقیقی جمہوری آئین کو نافذ کرنے کے حق میں ہے۔ یہ آئین ایسا ہونا چاہئے جس میں نہ صرف عوام کے شہری حقوق کی ضمانت ہو بلکہ ریاست میں شامل مختلف علاقوں کے مفادات کو بھی تحفظ حاصل ہو۔ وفاق کے سوال پر رائے مختلف ہو سکتی ہے لیکن پھر بھی موجودہ ڈھانچہ صحیح وفاق نہیں ہے اور اسے موجودہ آئین کے مصنفوں نے بھی نیم وفاق کا نام دیا ہے۔

ایک طرف تو ہمارے ملک میں پارلیمانی طرزِ حکومت کا تجربہ مایوس کُن رہا ہے اس کی مذمت میں سب سے بڑی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اس کی خامیاں موجودہ حکومت کے قیام کا سبب بنیں جو کہ اپنی بدترین معاشی اور معاشرتی پالیسیوں کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے۔ دوسری طرف صدارتی طرزِ

www.bhutto.org

حکومت کے تجربہ نے خوفناک نتائج پیدا کئے ہیں کیونکہ اس کے نتیجہ میں لوگوں کو اپنی شہری آزادیوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ چند خاندانوں کو ملک کی دولت سمیٹنے کی عام اجازت دے دی گئی۔ روزمرہ زندگی میں بدعنوانی کا دخل اتنا بڑھ چکا ہے کہ رشوت خوری' دھوکے بازی' ناجائز لین دین غرضیکہ ہر قسم کی بددیانتی کے دفاع کیلئے سرکاری بیانات جاری کئے جاتے ہیں اور یہ سب کچھ جمہوریت کے نام پر ہو رہا ہے حکومت جسے چاہتی ہے ہراساں کرنے کیلئے تشدد اختیار کرتی ہے۔ ہر شخص کے سر پر اس وقت بلاوجہ گرفتار' قید اور روزگار کے ذرائع سے محروم کر دینے کا خطرہ سوار ہے۔ کوئی بھی جمہوریت پسند شخص موجودہ صدارتی طرز حکومت کے جاری رہنے کی حمایت نہیں کر سکتا۔

پہلے نکتے کے جواب میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تجویز کردہ حل دوسری صورتوں کے ممکنہ فائدوں کا جائزہ لئے بغیر اپنایا نہیں جا سکتا۔ نئے آئین کے مجموعی مسئلہ پر عام بحث ہونی چاہئے اور پھر اسے پاکستانی عوام کی منظوری کیلئے پیش کر دینا چاہئے۔

دوسرا نکتہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"وفاقی حکومت کا اختیار صرف دو شعبوں تک محدود ہو گا۔ دفاعی اور خارجی تعلقات اور تمام باقی ماندہ محکمے وفاق کے رکن صوبوں کو حاصل ہوں گے۔" وفاق کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں لیکن ایک شرط کا پورا ہونا لازمی بات ہے کہ وفاقی اختیارات قومی وحدت میں اضافہ کریں اور اسے مستحکم بنائیں۔ نکتہ نمبر 2 کی تجویز دو خود مختار ریاستوں کے باہمی اتحاد کے مترادف ہے جو صرف دو شعبوں یعنی دفاع اور خارجہ تعلقات سے محروم ہیں اس صورت میں وفاقی قانون ساز اسمبلی کی حیثیت بالکل ختم ہوئی کیونکہ اس کیلئے کام کرنے کو کچھ نہیں ہو گا۔ پس مرکزی امور پھر کیسے چل سکتے ہیں اس کے نتیجہ میں وفاق میں شامل ریاستوں کی ایک کونسل ہی قائم ہو سکتی ہے۔

ایسا وفاق خواہ اس میں بیرونی حملہ یا مداخلت سہنے کی صلاحیت بھی کیوں نہ موجود ہو جلد انتشار کا شکار ہو جائے گا اگر وفاق میں صرف دو صوبے شامل ہیں تو نفاق کا پیدا ہونا جلد ممکن ہو جائے گا۔ داخلی معاملات میں کسی مشترکہ پالیسی کے نہ ہونے کی وجہ سے معمولی اختلاف کسی بڑے بحران کا سبب بن جائے گا۔ کسی بھی وفاق کے اتحاد کی بنیاد ایک جیسے معاشی نظام اور بنیادی قوانین کو اپنانے سے قائم ہو سکتی ہے۔ ایک سوشلسٹ اور ایک سرمایہ دار ریاستوں میں وفاق اس لئے ممکن نہیں کیونکہ اتحاد کی بنیاد مفقود ہے۔

شیخ مجیب الرحمن نے اپنی دلیل کے حق میں 1946ء کے کیبنٹ مشن پلان کا حوالہ دیا ہے جس میں تجویز کی گئی تھی کہ مرکز کے پاس صرف تین محکمے رہیں گے۔ دفاع' خارجہ امور اور مواصلات اور یہ کہ اس سکیم کو مسلم لیگ نے منظور کر لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ نے اسے ایک چال کے طور پر قبول کیا تھا کیونکہ اس کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ کانگرس نے بھی اس کے مضمرات کو سمجھ کر فی الواقع اسے مسترد کر دیا تھا۔

www.bhutto.org

نکتہ نمبر2 قومی اتحاد کے خواہش مند کسی بھی پاکستانی کیلئے قابل قبول نہیں ہے پاکستان کو درپیش مشکلات کا حل صرف ایسے نظام کے نفاذ میں ہے جو معاشی استحصال کو ختم کر دے۔

نکتہ نمبر3 - کے الفاظ ہیں۔

ا - "دو علیحدہ لیکن آسانی سے تبدیل ہو جانے والی کرنسیوں کا اجرا ہونا چاہئے یا

ب - سارے ملک کیلئے ایک ہی کرنسی رکھی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو سرمائے کے انتقال کو روکنے کیلئے مؤثر آئینی دفعات ہونی چاہئیں۔ مشرقی پاکستان کیلئے علیحدہ بینک ریزرو اور علیحدہ مالی پالیسی اختیار کرنی چاہئے۔

"الف" کا جواب واضح ہے کہ ایک ملک کی دو مختلف کرنسیاں نہیں ہو سکتیں۔ دونوں صوبوں کی معیشتیں ایک دوسرے سے کٹ جائیں گی۔ اس کا نتیجہ ایسا ہو گا جسے شیخ صاحب اپنی خواہش اور مقصد کے مطابق مشرقی پاکستان کا استحصال روکنے کی آخری کوشش کے طور پر قبول کر لیں۔ اس تجویز سے نہ صرف معیشت انتشار کا شکار ہو گی بلکہ ملک کا شیرازہ بھی بکھر جائے گا۔ دونوں صوبے خود مختار بننے کیلئے علیحدگی اختیار کرتے چلے جائیں گے۔ اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ دونوں صوبوں میں استحصال کو روکنے کیلئے سوشلسٹ نظام قائم کیا جائے چنانچہ استحصالی نظام کے پیچھے چھوڑے ہوئے اثرات کو مٹانے کیلئے خصوصی توجہ دینی پڑے گی۔

جہاں تک (ب) کا تعلق ہے ایک ماہر معاشیات کو یہ تجویز فنی پہلوؤں کی مالک نظر آتی ہے۔ مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو جانے والے سرمائے کو روکنے کیلئے کیا کیا اقدامات ہو سکتے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صاحب نے نو آبادیاتی نظام کے استحصالی ہتھکنڈوں کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ شیخ صاحب کی تجاویز سے سرمایہ دارانہ نظام جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ بے شک ان کے نزدیک مغربی پاکستان کے علاوہ دوسرے سرمایہ کار بشمول امریکی قابل قبول ہوں گے جو کہ مشرقی پاکستان کی صنعتی ترقی میں مدد دیں گے۔ تب وہ بیرونی سرمایہ کاروں کو اپنے منافعے اور کچھ سالوں بعد اپنے سرمائے ملک سے باہر لے جانے کی اجازت دینے پر آمادہ ہو جائیں گے لیکن اس قسم کی رعایت مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سرمایہ داروں کو حاصل نہیں ہو گی۔ ان کی تجاویز میں مشرقی پاکستان کے عوام کو خود مشرقی پاکستان کے چند سرمایہ داروں کی لوٹ سے بچانے کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ اصلاح انتہائی مایوس کن ہے اس کی بدولت مشرقی پاکستان کبھی بھی معاشی ترقی حاصل نہیں کر سکتا۔

اس کا صحیح علاج بالکل عیاں ہے۔ مشرقی پاکستان میں تمام صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ چند لوگوں کو امیر تر بننے کا موقع دینے کی بجائے اس طرح سرمایہ کا حصول آسان ہو گا۔ مشرقی پاکستان پی آئی ڈی سی کے سرمائے کو چند مشرقی پاکستان کے لوگوں کو سرمایہ مختص کرنے کی تکنیک مکمل طور پر غلط ہے جن سے یہ سرمایہ ان کی کمائی جانے والی دولت کی رفتار کے حساب سے واپس لیا جائے گا۔ اس تجویز کا

www.bhutto.org

مطلب یہ ہو گا کہ چند لوگ جن کی جیب میں ایک پائی تک نہ ہو گی، صنعتوں کے مالک بن بیٹھیں گے۔ ایک شخص کو دوسرے کے مقابلہ میں کیوں ترجیح دی جائے۔ کچھ لوگوں کو دوسروں کے مقابلے میں کیوں چنا جائے اور پھر ان کا چناؤ کون کرے گا؟ غالباً صوبائی گورنر یا مقامی حکام جن کی نظر اس سودے سے حاصل ہونے والے فوائد پر ہو گی۔ چھ نکاتی فارمولا پر زیادہ اعتماد کیا جا سکتا تھا اگر اس امر کا یقین حاصل ہو سکتا کہ یہ تجاویز اس قسم کے نتائج پیدا نہیں کریں گی۔

نکتہ نمبر4 - ٹیکس لگانے کے وفاقی اختیارات سے متعلق ہے ٹیکس جمع کرنے کا کام کیا وفاقی حکومت کو سرانجام دینا چاہئے یا صوبائی حکومت کو؟ اس امر کا تعلق عملی انتظامات سے ہے۔ نکتہ نمبر4 کے مطابق مرکز کو ٹیکس لگانے کا حق حاصل نہیں اگر نکات نمبر2 اور نمبر3 کے مندرجات کو قبول کر لیا جائے تو نکتہ نمبر4 سے اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی اگرچہ اس میں مرکز کی آزاد حیثیت کو برقرار رکھنے کیلئے مالیہ کے کچھ ذرائع مرکز کو مختص کرنے کی ضرورت ظاہر کی گئی ہے۔ نکتہ نمبر4 پر بحث لاحاصل ہے کیونکہ اصولی اختلافات پہلے تین نکات میں موجود ہیں۔

نکتہ نمبر5 - یوں ہے۔

1 - زر مبادلہ کا حساب رکھنے کیلئے دو علیحدہ اکاؤنٹ ہوں گے۔

2 - مشرقی پاکستان کی آمدنی مشرقی پاکستان کی حکومت کے ماتحت اور مغربی پاکستان کی آمدنی مغربی پاکستان کی حکومت کے ماتحت ہو گی۔

3 - مرکزی حکومت کے زر مبادلہ کے اخراجات پورے کرنے کیلئے دونوں صوبائی حکومتیں برابر کا حصہ دیں گی یا ان کے حصوں کی ایک نسبت مقرر کی جائے گی۔

4 - خام اشیاء بلا محصول دونوں صوبوں میں آ جا سکیں گی۔

5 - آئین کی رو سے صوبائی حکومتیں بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات استوار کرنے اور وہاں پر اپنے تجارتی مراکز قائم کرنے کی مجاز ہوں گی۔

نکتہ نمبر5 پر عملدرآمد تب ہی ممکن ہو سکتا ہے اگر دونوں صوبوں کی معیشت کو علیحدہ علیحدہ کرنے پر رضامندی حاصل کر لی جائے اور اس کے ساتھ ہی ناگزیر اور اہم سمجھ کر صوبوں کی مکمل خود مختاری کو تسلیم کر لیا جائے اس نکتے کی پانچویں دفعہ بیرونی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کہ خارجہ امور سے علیحدہ نہیں ہیں۔ اس لئے یہ دفعہ نکتہ نمبر2 میں بیان کئے گئے موقف سے متصادم نظر آتی ہے جہاں تک پہلی اور تیسری دفعہ کا تعلق ہے یہ اور کئی صورت میں بھی ممکن ہو سکتی ہیں حتیٰ کہ مضبوط مرکزی حکومت کے تحت بھی یہ اقدام حاصل ہو سکتے ہیں لیکن اس مقصد کیلئے چھ نکاتی پروگرام میں بیان کئے گئے اقدامات کے علاوہ اور بھی تقاضے پورے کرنے ضروری ہیں۔

نکتہ نمبر6 - کے بارے میں مصنف کا بیان ہے۔

www.bhutto.org

"اس نکتہ میں' میں نے مشرقی پاکستان کیلئے ملیشیا یا پیرا ملیشیا فورس قائم کرنے کی سفارش کی ہے۔"

یہ ایک شاندار تجویز ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن اس تجویز کو وسعت دینے کی ضرورت ہے صرف مشرقی پاکستان میں ہی نہیں بلکہ مغربی پاکستان کے علاقوں میں بھی ملیشیا فورس قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ملیشیا پیشہ ور سپاہیوں سے تربیت حاصل کرے گی اور ان کمانڈ میں رہے گی۔ یہ ہماری دفاعی افواج کا ایک حصہ ہوں گے لیکن اس پر اخراجات کچھ زیادہ نہیں ہوں گے۔

چھ نکاتی فارمولے میں معاشی اور معاشرتی اصلاح کیلئے کسی تجویز کو پیش نہیں کیا گیا۔ اس لئے مجموعی طور پر یہ مشرقی پاکستان ایک طرف اور مغربی پاکستان اور مرکز دوسری طرف کے درمیان تعلقات میں مضمر اصلی مسائل کیلئے قطعاً ناکافی ہے۔ مغربی پاکستان کے عوام اپنے مشرقی بھائیوں کی طرح ایک ہی قسم کے استحصال کا شکار ہیں۔ پاکستانی ایک قوم ہیں نہ کہ دو۔ معاشی' معاشرتی اور سیاسی مسائل کے حل میں تمام پاکستان کو شامل کرنا چاہئے۔ ان مسائل کو صرف سوشلسٹ پروگرام کے ذریعہ ہی حل کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

بھارتی بورژوازی کے سپر پاور بننے اور علاقائی ملکوں پر اس کے غلبے کا مقابلہ کرنے کیلئے شہید بھٹو نے جو پالیسی اختیار کی تھی اس کا ایک اہم نقطہ آسام کے ساتھ پاکستان کے تعلقات قائم کروانا تھا اس موضوع پر پارٹی کے پہلے کنونشن میں جو دستاویز منظور کی گئی وہ حسب ذیل ہے۔

ریڈ کلف ایوارڈ کی ناانصافیوں سے پاکستان کے عوام اچھی طرح واقف ہیں۔ ریڈ کلف کمیشن نے تقسیم کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے من مانی کارروائی سے گورداسپور اور فیروزپور کے اضلاع اور امرتسر کا بہت سا علاقہ ہندوستان کو دے دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ علاقے پاکستان کو ملنے چاہئیں تھے۔ پاکستان کے قومی علاقوں کے اس نقصان کو لاکھوں بے گناہ انسانوں کے قتل عام نے جو ان علاقوں سے بے گھر کر دیئے گئے تھے اور بھی المناک بنا دیا شاید انہی المناک حالات کے سبب اس کا بہت کم علم ہے کہ مشرقی حصہ میں بھی پاکستان کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی روا رکھی گئی۔

آج جبکہ ہم جموں و کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے ساتھ مفاہمت کا ذکر بار بار سن رہے ہیں جس کی بنیاد حق خود اختیاری پر نہیں بلکہ چند من مانے انتظامات پر ہے تو یہ مناسب ہو گا کہ ہم ان یادوں کا اعادہ کریں کہ آسام کیسے پاکستان سے چھین لیا گیا اور یہ مسئلہ کیسے کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے چاہے بظاہر اس کے بارے میں آخری سمجھوتہ ہو چکا تھا۔

8 اور 9 اپریل 1946ء کو مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں کا ایک کنونشن دہلی میں قائداعظمؒ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ حسین شہید سہروردیؒ کی تجویز پر ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں ان دو حصوں کی وضاحت کی گئی تھی جن پر پاکستان مشتمل ہونا تھا۔

www.bhutto.org

"ہندوستان کے شمال مشرق میں بنگال اور آسام پر مشتمل اور شمال مغرب میں پنجاب سرحدی صوبہ سندھ اور بلوچستان پر مشتمل وہ منطقے..... یعنی پاکستان کے منطقے..... جہاں مسلمان واضح اکثریت میں ہیں انہیں خود مختار مملکت میں تشکیل کر دیا جائے اور غیر مبہم یقین دلایا جائے کہ پاکستان کا قیام بلا تاخیر عمل میں لایا جائے گا۔"

یہ ٹھیک ہے کہ غیر منقسم بنگال میں ہندوؤں کی آبادی کافی ہوتی لیکن یہاں صورتحال غیر منقسم پنجاب سے بُری نہ ہوتی جہاں سکھ اور ہندو دونوں بڑی اقلیت میں موجود ہوتے۔ ان حالات میں پنجاب کی تقسیم ناگزیر تھی اور جب اصول ایک دفعہ مان لیا گیا تو بنگال کی تقسیم سے بھی مفر نہیں تھا۔

برطانوی حکومت نے تقسیم ہند کے جس منصوبے کا اعلان 3 جون 1947ء کو کیا تھا اس میں آسام کی تقسیم کی تجویز بھی تھی۔ (متن کا پیرا نمبر 13)

"اگرچہ آسام ایک غیر مسلم اکثریتی صوبہ ہے لیکن سلہٹ کے ضلع میں جو بنگال سے متصل ہے غالب مسلم اکثریت ہے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ اگر بنگال کی تقسیم ہونا ہی ہے تو سلہٹ کو مسلم بنگال میں مدغم کر دیا جائے۔"

یہ واضح تھا کہ اس تجویز کی قبولیت کے بعد آسام کا ایک اکائی کے طور پر پاکستان میں شامل ہونا بعید از امکان تھا، اسی لئے آسام کی نسبت باؤنڈری کمیشن کے دریافت طلب مسائل کو ضلع سلہٹ تک محدود کر دیا گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آسام کی اکثر آبادی مسلمان نہیں تھی لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اکثریت ہندو تھی؟

انگریز اس اصول پر مصر تھے کہ آبادی کو مسلم و غیر مسلم میں اس مفروضہ پر تقسیم کر دیا جائے کہ سارے غیر مسلم خود کو مسلمانوں میں گنے جانے کی نسبت ہندوؤں میں گنے جانے کو ترجیح دیں گے۔ کیا یہ مفروضہ جو پنجاب میں سکھوں کی نسبت تو صحیح ہو سکتا ہے۔ آسام پر بھی قابلِ اطلاق تھا؟ ہم پہلے 1941ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کی روشنی میں آسام کی فرقہ وارانہ ہیئت ترکیبی پر بحث کریں گے۔ برطانوی حکومت اور دوسرے فریقوں نے اپنے مذاکرات اور تنازعوں میں انہی اعداد و شمار کو رہبر بنایا تھا۔

تقسیم سے متعلق امور کے فیصلوں کیلئے انگریزوں نے صرف مندرجہ ذیل فرقوں کی علاقائی عددی قوت پر توجہ دی۔ ہندو، اچھوت، ہندوستانی، عیسائی، سکھ اور مسلمان برطانیہ کی نگاہوں میں دوسرے فرقوں کی عددی قوت اتنی کافی نہ تھی کہ وہ مرکزی فیصلے یعنی تقسیم کے بارے میں کوئی بات کہنے کا حق رکھتے۔

اگر یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ ہندوستان کو دو مملکتوں سے زیادہ میں تقسیم نہیں کرنا چاہئے تو پھر وہ اس میں حق بجانب تھے کہ ان گروہوں کے سارے مسائل کو نظر انداز کر دیتے جو ان متنازعہ منطقوں کے باہر

www.bhutto.org

تھے جن کا پاکستان نے دعویٰ کیا تھا۔ مغربی منطقہ میں ساری آبادی مذکورہ قوموں پر ہی مشتمل تھی لیکن مشرقی منطقہ میں آبادی کی صورت حال بالکل مختلف تھی۔

1941ء کی مردم شماری کے مطابق سارے آسام میں کوئی سکھ نہیں تھا۔ وہاں جو قومیں آباد تھیں وہ (1) ہندو' (2) اچھوت' (3) ہندوستانی عیسائی' (4) مسلمان' (5) وہ قومیں جن کی اوپر بتائی ہوئی قوموں میں تخصیص نہیں کی جاسکتی۔

اس آخری گروہ کا انگریزوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا جو اصول وضع کیا گیا تھا وہ یہی تھا کہ آبادی کو صرف مسلم اور غیر مسلم پر مشتمل تصور کیا جائے۔

آسام کی کل آبادی 10204753 دی گئی تھی اس میں سے مسلمانوں کی تعداد 3422479 تھی اور ہندوؤں کی 3536932۔

یہ بات دیکھی جائے گی کہ دونوں قوموں کی تعداد میں بہت کم فرق تھا اتنا کم کہ جسے تخمینہ کی غلطی شمار کیا جاسکتا ہے۔

اچھوتوں کی تعداد 676291 دی گئی ہے اور ہندوستانی عیسائیوں کی 37750

اگر مسلمان' ہندو' اچھوت اور ہندوستانی عیسائیوں کی تعداد جمع کی جائے تو وہ 7673452 بنتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ 2531281 لوگ جو کافی بڑی تعداد میں اب بھی باقی رہ جاتے ہیں جنھیں کسی گنتی میں لانا چاہئے۔ آیئے ہم ان اعداد و شمار پر ساری آبادی کے فیصد کی صورت میں نظر ڈالیں۔

مسلم 33ء7 فیصدی ہندوستانی عیسائی 0ء4 فیصدی

ہندو 34ء6 فیصدی دوسرے 24ء7 فیصدی

اچھوت 6ء6 فیصدی

مسلمان اور ہندو تقریباً برابر تعداد میں تھے یعنی ہر قوم آبادی کا تقریباً ایک تہائی تھی اچھوت جن کی تعداد صرف 6ء6 فیصد تھی فیصلہ کن ووٹ کے بمشکل حقدار سمجھے جاسکتے تھے۔ ہندوستانی عیسائی بالکل ناقابل لحاظ تھے اور اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے مفادات ترازو کے پلڑوں کو ایک طرف یا دوسری طرف جھکا سکتے تھے۔ اب ہمارے پاس صرف وہی جمِ غفیر رہ جاتا ہے جنھیں ہم "دوسرے" کہیں گے۔ ان کی تعداد پوری آبادی کا ایک چوتھائی ہے۔ ان کے مفادات کو اس مفروضے پر نظر انداز کر دیا گیا کہ انہیں اپنی الگ شخصیت کو "غیر مسلم" کی منفی درجہ بندی میں گم کر دینا ضروری تھا۔

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ مغربی حصہ کی تقسیم کے مسائل نپٹاتے وقت سارے غیر مسلموں کو اکٹھے گن لینے کا کچھ جواز تو ہو سکتا تھا۔ ہندوؤں' اچھوتوں' سکھوں اور ہندوستانی عیسائیوں کے علاوہ مغرب میں کوئی غیر مسلم اقلیتیں ایسی نہیں تھیں جن کی عددی قوت نہ ہونے کے برابر نہ ہو۔ کچھ پارسی جو سندھ میں آباد ہیں ان کی یہی صورت ہے۔ جب ہم مغربی منطقے کی ان غیر مسلم قوتوں کے بارے میں سوچتے

www.bhutto.org

ہیں جو ہندو نہیں تو ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ پارسیوں کے سوا یہ سارے نسبی طور پر ہندو ہیں یا ہندو جاتی کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلے کی بیرونی کڑی ہیں۔ بلاشبہ سکھ اپنے نسب کا ماخذ ہندوؤں سے بیان کرتے ہیں اور یہی حال ' ہندوستانی عیسائیوں کا ہے جن کی بہت بڑی اکثریت اونچی ذات کے ہندوؤں یا نیچی ذات کے ہندوؤں سے نئے مذہب میں داخل ہوئی۔ اچھوت تو ہندوؤں کی ایک مخصوص قوم ہیں۔

آسام میں صورت حال مختلف تھی۔ کل آبادی کے ایک چوتھائی کا ہندو قوم سے کوئی رشتہ نہیں تھا اگرچہ وہ مسلمان نہیں تھے ہر عہد میں انہوں نے ہندو غلبہ کی مزاحمت کی اور اتنی کامیابی سے کہ ان کے مقبوضہ علاقوں میں ہندو مداخلت انگریزی راج کے بعد ہی شروع ہو سکی انہوں نے تو خود کو ہندوستانی بھی کبھی نہیں مانا اور نہ وہ اب مانتے ہیں۔

برطانوی منتظمین کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ غیر ہندوستانی آبادی استحصال کا بُری طرح شکار ہو جائے گی۔ اگر انہیں ہندو جاتی کے تاجروں بنیوں اور سود خوروں کی غارت گری سے محفوظ نہ کیا گیا۔ غیر ہندوستانی آبادی کے علاقوں میں خصوصی انتظامی اقدامات کیے گئے تھے۔ انگریزوں کا اس کے علاوہ اپنا بھی ایک مفاد تھا۔ پہاڑی علاقوں میں چائے کے وسیع باغات کیلئے انہیں سستے مزدوروں کی ضرورت تھی۔

وہ فارمولا جس کا اطلاق مغربی خطے پر ہو سکتا تھا یا بنگال کی صورت میں بھی قابل قبول تھا۔ آسام کے لئے بالکل ہی بے جوڑ تھا۔ آسام میں ہندو اور مسلمان عملاً مساوی تعداد میں تھے۔ ایک چوتھائی آبادی کا مفاد اس میں نہیں تھا کہ وہ ہندوستان میں مدغم ہو۔ بعد کے واقعات یعنی ناگا اور میزو قبائل کی بغاوت ' نکسل باڑی میں گڑبڑ اور آسام کے دوسروں علاقوں میں بے اطمینانی نے واضح طور پر ثابت کر دیا کہ آسام کی قسمت کا فیصلہ اس طرح کرنا غلط تھا کہ سارے غیر مسلموں کو ایک اکائی سمجھ لیا جائے۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آسام کے جغرافیائی محل وقوع اور اس کی آبادی میں غیر ہندو اکثریت کے باوجود انگریز کیوں بے تاب تھا کہ آسام بھارت کو دان کر دیا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ انگریز اس بات سے احتراز کر رہا تھا کہ پاکستان کی سرحدیں کہیں بھی چین یا وسطی ایشیا سے متصل ہوں۔ مغربی حصہ میں وہ اس حکمت عملی میں صرف اس لئے ناکام ہو گیا کہ مہاراجہ کے خلاف کشمیر کے شمال مغربی خطہ کی بغاوت کو دبانا مشکل ہو گیا تھا۔ مشرقی حصہ میں ان کی پالیسی کامیاب رہی۔ انہوں نے آسام کے اصل مسئلہ کا رخ سلہٹ کی علیحدگی کی طرف موڑ دیا ' جہاں کہ مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

دوسری وجہ جس کی بنا پر انگریز جو چاہتے تھے کر گزرے ' چائے کی صنعت کا مفاد تھا جو زیادہ تر انگریزوں کے ہاتھ میں تھی ' آسام میں چائے کے بڑے بڑے باغات انگریزوں کی ملکیت تھے۔ ان پر کثیر سرمایہ لگ چکا تھا اور بہت زیادہ منافع کا ذریعہ تھے۔

دارجیلنگ میں چائے کے عظیم باغات بھی برطانوی ملکیت تھے۔ اگر آسام پاکستان کا حصہ بنتا تو امکان یہی تھا کہ دارجیلنگ بھی پاکستان کو دے دیا جاتا لیکن اگر دارجیلنگ ہندوستان میں ہی رہتا تو

انگریزوں کی چائے کی وسیع صنعت دو ملکوں میں بٹ کر رہ جاتی۔ انگریزوں کے لئے بہتر یہی تھا کہ چائے کی صنعت متحد رکھی جائے اور اس ملک میں رہے جہاں انہوں نے کثرت سے سرمایہ لگا رکھا ہے یعنی بھارت میں چائے کی برطانوی صنعت کے لئے سکم اور بھوٹان بھی سروکار رکھتے تھے۔ برطانیہ کو یہ یقین نہیں تھا کہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے اگر پاکستان کی سرحدیں ان سے متصل ہو گئیں۔ اگر ان ریاستوں نے خود مختاری کا فیصلہ کر لیا تو دارجلینگ کی چائے پر برطانوی اجارہ داری رکھنے میں کافی الجھاؤ پیدا ہوں گے۔ پاکستان کے مرکزی علاقوں میں برطانوی سرمایہ بہت کم لگا ہوا تھا۔ مزید برآں تقسیم کے وقت یہ بھی غیر یقینی تھا کہ پاکستان کس قسم کی اقتصادی پالیسی اپنائے گا کسی طرح بھی یہ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ پاکستان مغربی ممالک کی آغوش میں آگرے گا۔

آسام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے 3 جون کے منصوبے میں کر دیا تھا اور اس طرح یہ فیصلہ برطانیہ کا سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ برطانیہ نے یہ گمراہ کن فیصلہ اپنے نو آبادیاتی مفادات کے لئے کیا جو دو تھے۔

1 - پاکستان کو مرکزی ایشیا اور چین کی سرحدوں تک رسائی حاصل نہ کرنے دی جائے۔

2 - چائے کی برطانوی املاک کی حفاظت۔

آیئے ہم اس پر غور کریں کہ اگر تقسیم ضروری ہی تھی تو کیا پاکستان کو صرف سلہٹ کا اکثر حصہ دے دینا ہی کافی تھا۔ سلہٹ میں مسلمانوں کی قطعی اکثریت تھی اور ان کا تناسب 7ء60 فیصدی تھا۔ ہندو 2ء25 فیصدی، اچھوت 7ء13 فیصدی اور ہندوستانی عیسائی 08ء0 فیصدی۔ "دوسرے" بہت ہی کم تعداد میں تھے یعنی 3ء2 فیصد، سلہٹ سے متصل ضلع کاچار ہے جس کی کل آبادی 6416181 ہے اور مختلف قوموں کی قوت حسب ذیل ہے۔

مسلمان 3ء36 فیصدی ہندوستانی عیسائی 06ء0 فیصدی

ہندو 1ء27 فیصدی دوسرے 44ء28 فیصدی

اچھوت 1ء8 فیصدی

غیر ہندو نسب کے لوگوں کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ تھی۔ مسلمانوں سے مل کر ان کی آبادی 75ء64 فیصدی تھی یعنی تقریباً 65 فیصدی ہو جاتی تھی۔ مسلم لیگ نے کاچار کا ایک حصہ مانگا تھا کیونکہ یہاں مسلمانوں کی آبادی گنجان تھی ریڈکلف نے نہ صرف سارا کاچار ہندوستان کو دے دیا بلکہ سلہٹ کا ایک ٹکڑا بھی کاٹ ڈالا تاکہ بھارت کے لئے تری پورہ تک رسائی آسان ہو جائے۔

مسلم لیگ کا مطالبہ واجبی سا ہی تھا کیونکہ اس نے ایسے بہت بڑے علاقے بھی ہندوستان کے لئے چھوڑ دیئے۔ جہاں ہندو آبادی مقابلتاً ناقابل اعتنا تھی۔ مسلم لیگ نے سلہٹ کے علاوہ درج ذیل علاقوں کا مطالبہ کیا۔

www.bhutto.org

1- لوشائی کی پہاڑیاں
2- کاچھر کا ایک حصہ
3- گارو کی پہاڑیاں
4- گوئپاڑا
5- کامارو پ کا تھوڑا سا حصہ۔

آیئے ہم ان ضلعوں کا جائزہ لیں جہاں ہندو قطعی اکثریت میں تھے۔ ان کی یہ پوزیشن صرف تین جگہوں پر تھی۔ کامارو پ' سب ساگر اور لاکی پور' جہاں وہ بالترتیب 4ء50فیصد' 0ء55فیصد اور 1ء51فیصد تھے تاہم کامارو پ میں مسلمان کسی طرح بھی ناقابل لحاظ نہیں تھے۔ ان کی آبادی 1ء39فیصدی تھی اس لئے مسلم لیگ نے جو خط تقسیم تجویز کیا تھا' وہ منصفانہ تھا۔

گارو کے پہاڑی علاقوں میں مسلمان اور ہندو دونوں کا تناسب ایک جیسا کم تھا جہاں بالترتیب وہ 5ء4فیصد اور 8ء5فیصد تھے۔ باقی کے تقریباً 0ء90فیصد لوگ مقامی باشندے تھے جن کی تعداد 210000 کے لگ بھگ تھی۔ لوشائی کے پہاڑی علاقے بھی "کلیتاً" مقامی آبادی سے بھرے ہوئے تھے۔

اگرچہ مسلم لیگ نے کھاسی اور جینتا کے پہاڑی علاقوں پر حق نہیں جمایا تھا لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہاں ہندوؤں کی تعداد 7ء10فیصدی تھی اور اسی طرح ناگا میں 2ء2فیصدی تھی۔ ہم یہاں اس کا بھی اضافہ کر دیں کہ نوگانگ میں مسلمانوں کا تناسب ہندوؤں سے زیادہ تھا کیونکہ وہ 2ء35فیصد تھے اور ہندو صرف 2ء32فیصد۔

تقسیم کے بعد کے واقعات نے حتمی طور پر واضح کر دیا ہے کہ آسام کی مقامی غیر ہندو آبادی کیلئے ایک خود مختارانہ وجود زیادہ قابل قبول تھا۔ ان کیلئے یہ مقام ہندوستانی یونین کے اندر ممکن نہیں۔ ہندوستانی حکومت نے جو بھی رعائتیں انہیں اب دی ہیں وہ زیادہ مدت کیلئے ان کی نسلی وجود کی ضمانت نہیں دے سکتیں۔ تقسیم کے وقت ان کی آزادانہ خواہشات نہیں پوچھی گئیں۔ انگریز اپنی چائے کی صنعت محفوظ رکھنے کو زیادہ بے قرار تھا۔ یہ نسبت اس کے کہ مقامی قبیلوں کے حقوق کی نگہداشت کرتا۔

"یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ تقسیم کے اصولوں کے مطابق ہندوستان کا آسام پر کوئی تاریخی دعویٰ نہیں تھا۔"

مشرقی پاکستان کے بارے میں اتنے دور رس معاشی و جغرافیائی تصورات رکھنے والے قائد پر یہ الزام لگانا ڈھٹائی کی بات ہی ہے کہ وہ ملک کے اس حصے کی علیحدگی میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہے۔ بھٹو تو ان اضلاع کے پاکستان سے چھن جانے کا ماتم کر رہے تھے' جن کے نام تک الزام لگانے والوں کو معلوم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بھٹو کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا جاتا تو وہ علیحدگی کے عمل کو روک سکتے تھے۔ پاکستان توڑنے کے ذمہ دار وہ فوجی حکمران اور سیاسی عناصر ہیں جو ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتے رہے۔

www.bhutto.org

کشمیر اور پیپلز پارٹی

مسئلہ کشمیر میں وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی دلچسپی کوئی اتفاقیہ امر نہیں' یہ ان کے والد شہید بھٹو کے عظیم خوابوں کے ورثے میں شامل ہے۔ جن کی تکمیل کا وہ عزم رکھتی ہیں۔ پیپلز پارٹی کے پہلے کنونشن میں کشمیر کے بارے میں جو دستاویز منظور کی گئی اس کے مطالعہ سے اس کشمیر پالیسی کے تسلسل کا پتہ چلتا ہے جو بے نظیر بھٹو نے مرتب کی۔ اس دستاویز میں درج ہے کہ پاکستانی عوام تنازعۂ کشمیر کی کرب ناک تاریخ سے پوری طرح واقف ہیں۔ اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ کیسے پیدا ہوا اور گذشتہ 20 سال کے عرصے میں اسے کن سنگین مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔

تمام دنیا جانتی ہے کہ کس مکاری سے اقتدار کو چھوڑ کر بھاگتے ہوئے ایک جابر حاکم کی ایک جنبش قلم سے جموں و کشمیر کے عوام کو ان کے پیدائشی حق خود اختیاری سے محروم کر دیا گیا تھا۔ دنیا کو یہ بھی معلوم ہے کہ بھارت کی غاصب حکومت نے طاقت کے بل بوتے پر کشمیر پر قبضہ کرنے کے بعد روز روشن میں کشمیری عوام اور اقوام عالم کے روبرو یہ وعدہ کیا تھا کہ ریاست کے عوام کو حق خود اختیاری استعمال کرنے کا حق دیا جائے گا۔

گذشتہ 20 سال کے عرصہ میں بھارتی وعدوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں لیکن جموں و کشمیر کے عوام میں اپنا پیدائشی حق استعمال کرنے کا عزم اور کشمیریوں کو حق خود ارادیت دلانے کیلئے پاکستانی عوام کی حمایت اور استحکام میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان' تاریخ اور جغرافیہ کے

www.bhutto.org

اس مشن کو پارٹی کی تمام اندرونی اور بیرونی ذمہ داریوں پر فوقیت حاصل ہے۔ جموں و کشمیر کے عوام کا مستقبل پاکستان کے اپنے مستقبل کا ایک حصہ ہے۔ اس ریاست کے لوگ پاکستان کا ویسے ہی حصہ ہیں جیسے پنجاب، بنگال، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں رہنے والے لوگ اور بھارت سے آنے والے مہاجرین ہیں۔ پاکستان کشمیر کے بغیر ایسے ہی ادھورا ہے جیسے ایک جسم سر کے بغیر ہوتا ہے۔ بیس سال تک کشمیر کے نہتے عوام نے بھارتی قبضے کے خلاف جدوجہد کی ہے ان کی جدوجہد آزادی پاکستان کو مکمل کرنے کی جدوجہد ہے۔ کشمیری عوام سے کیے گئے وعدہ کو پورا کرانے کے مقابلے میں پاکستان میں اور کوئی کام اس سے اہم نہیں ہو سکتا اور کوئی دوسرا فرض افضل نہیں ہو سکتا۔ اس ذمہ داری سے پہلوتہی پاکستان کیلئے تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

بھارت نے ریاست کو غلامی میں جکڑ رکھا ہے اور وہ انسانیت کے مجموعی احساس ضمیر اور عالمی رائے عامہ کا مذاق اڑا رہا ہے بھارت یہ سب کچھ اس لئے نہیں کر رہا کہ اسے علاقائی ہوس ہے، اس تمام کارروائی سے بھارت کا مقصد دو قوموں کے نظریئے کی جو پاکستان کی بنیاد ہے "نفی کرنا ہے۔ اس مسئلہ کے حل کیلئے پاکستان نے ایک عرصے تک اقوام متحدہ اور بڑی طاقتوں پر انحصار کیا ہے۔ اقوام متحدہ کی مداخلت ہمیں کسی ایسے حل کے قریب نہیں لائی ہے جو حق خود اختیاری پر مبنی ہو۔ اس کے برعکس یہ محض ایک سراب ہے اور بے عملی کی پردہ پوشی ہے۔ اسی طرح بڑی طاقتوں کی مداخلت نے اس تنازعہ کیلئے انصاف کی راہیں ہموار کرنے کے بجائے پیچیدگیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ نہ اقوام متحدہ اور نہ ہی بڑی طاقتیں کشمیر کے ستم زدہ عوام کو امن کے راستے دکھائیں گی بلکہ اس شدید ناانصافی کو ختم کرنے کی تمام تر ذمہ داری پاکستان اور کشمیر کے عوام پر عائد ہوتی ہے۔

20 سال گذر گئے ہیں لیکن اس جدوجہد میں مزید طویل عرصہ درکار ہو گا اور آخری فتح حاصل کرنے تک مزید قربانیاں دینی پڑیں گی، چاہے اس کیلئے کتنی ہی قربانیاں دینی پڑیں، مشکلات کا سامنا کرنا پڑے اور یہ جدوجہد کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے اس بات میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بالآخر آخری فتح کشمیری عوام اور پاکستان ہی کو حاصل ہو گی کیونکہ جس مقصد کی سربلندی کیلئے وہ جدوجہد کر رہے ہیں وہ حق و انصاف اور اخلاقی اقدار پر مبنی ہے۔ قوم اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے آگے قدم بڑھانے کو تیار ہے۔

پاکستان سچائی کو جیل میں بند نہیں رکھ سکتا۔ اس کے عوام اپنے عقیدوں کا سودا نہیں کر سکتے۔ ہم ایک اعتبار سے کشمیری عوام پاکستان کے ساتھ نہ ٹوٹنے والے رشتے میں منسلک ہیں اور بھارت کی کوئی بھی عیارانہ چال ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ان کی آزادی پر پردہ نہیں ڈال سکتی۔ چاہے ان کی راہ میں کتنی ہی رکاوٹیں کھڑی کیوں نہ کی جائیں اور انہیں دبانے کیلئے ان تھک کوششیں کیوں نہ کی جائیں۔ جموں و کشمیر کے عوام پاکستان کی برادری میں شامل ہو کر رہیں گے۔ یہ پاکستانی عوام کا ایمان اور پارٹی کا اعلیٰ ترین مشن ہے۔

www.bhutto.org

سچے مؤقف سے دستبردار نہیں ہو سکتے اور پائیدار اصولوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اگر عوام میں سے کچھ لوگ جن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں اور جن کے کچھ اپنے ذاتی مفاد بھی وابستہ ہیں اس مسئلہ کو بنیادی ذمہ داری سمجھنے کی بجائے اپنی ذات کیلئے ہوا خیال کرنے لگے ہیں تو دنیا کو جان لینا چاہئے کہ پاکستانی عوام ان کے خوف و ہراس میں شریک نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی جدوجہد کو آخر تک چاہے وہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو' جاری رکھنا چاہتے ہیں اور بین الاقوامی طاقتوں کی سیاسی مداخلت یا طاقت کے اثرات انہیں خوف زدہ نہیں کر سکتے۔ پاکستان کے لوگ کبھی شکست تسلیم نہیں کریں گے اور اگر بر سر اقتدار لوگوں میں سے کچھ افراد نے حالات کے دباؤ یا خوف کے تحت جھکنے کی کوشش بھی کی تو عوام اسے کبھی برداشت نہیں کریں گے۔

پاکستان اس مسئلہ کا پُرامن حل چاہتا ہے اور یہ حل حق خود اختیاری پر مبنی ہونا چاہئے۔ ہم طاقت کا استعمال کئے بغیر ان وعدوں کو پورا ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں جو جموں و کشمیر کے لوگوں سے کئے گئے تھے لیکن جنگ کا خوف جنگ سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ پاکستان جنگ کی تباہ کاریوں اور خون خرابے سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس نے اپنی چھوٹی سی عمر میں دو مرتبہ بڑے پیمانے پر جنگ اور اس کے خون خرابے کا مشاہدہ کیا ہے۔ ہم پوری سنجیدگی سے یہ کہتے ہیں کہ ہم جنگ اور تصادم نہیں چاہتے ہم امن چاہتے ہیں لیکن ہم کشمیر کے سودے پر امن نہیں خرید سکتے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تصادم سے بچنے کی خاطر اور امن کی امید میں پاکستان نے بہت سے علاقے بھارت کے حوالے کر دیئے ہیں اور وہ ابھی تک ہمیں دھوکے میں رکھے ہوئے ہے۔ گذشتہ 20 سال کے عرصہ میں یہ روّیہ اختیار کرنے کے باوجود پاکستان دو مرتبہ میدان کارزار بن چکا ہے اور یہاں کے عوام جنگ کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جنگ کی غیر موجودگی میں پاکستان کے لوگ امن سے ہمکنار نہیں ہوئے۔ امن کی شرائط جن کیلئے ہم بہت خواہش رکھتے ہیں اپنے حقوق سے دستبرداری کی بجائے حقوق کی حفاظت کرنے سے حاصل ہوں گی۔

گورداسپور' فیروزپور' امرتسر کے کچھ حصوں' آسام اور حیدر آباد سے واپس ہٹنے میں اس لئے مصلحت سمجھی گئی تھی کہ بھارت نے اپنی بھری ہوئی توپوں کا رخ پاکستان کی طرف موڑ رکھا تھا۔ باوجودیکہ ہم اپنے کچھ علاقوں سے دستبردار ہو گئے بھارت کی توپیں اب بھی پاکستان پر نشانہ لگائے ہوئے ہیں۔ اگر اسی غلط قسم کی منطق کے تحت ہم کشمیر یا اس کے کسی ایک حصے سے امن خریدنے کی امید میں واپس ہٹ جاتے ہیں تو ہماری نا امیدی کی انتہا اتنی ہی ہوگی جس طرح زندگی کے بعد موت کا سامنا کرنے میں ہوتی ہے۔ بھارت کشمیر نہیں چاہتا بلکہ کشمیر کو پاکستان کے حوالے کرنے سے انکار کر کے پاکستان کو ختم کرنے کی فکر میں ہے۔ پاکستان کا بنیادی نظریہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے اگر پاکستان مسلم اکثریت کے علاقے کو بھارت کا حصہ بننے کے اصول کو تسلیم کر لیتا ہے۔ اس وجہ سے بھارت کشمیر پر اپنا شکنجہ مضبوط تر کرتا چلا جا رہا ہے بغیر کسی شک و شبہ کے بھارت پر یہ واضح کر دینا چاہئے کہ پاکستان مزید مراعات دینے کیلئے تیار نہیں ہے ہمیں یہ

www.bhutto.org

اس آخری قلعے کی حفاظت کیلئے اپنے پرچم کو اور عزم کو بلند رکھنا چاہئے۔

بھارت کھوکھلے بیانات یا اقوام متحدہ کی قرار دادوں سے پاکستان کے اس عزم کو نہیں سمجھے گا۔

اس کو سمجھانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ہم اس پر واضح کر دیں کہ ہم جموں و کشمیر میں انصاف کی پاسبانی کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ بھارت ہمارے موڈ، نقل و حرکت، ہماری تیاری، جرأت کے مظاہرے، عوام کے جذبے اور راہنماؤں کے رویئے سے ہماری نیت اور عزم کا اندازہ کرلے گا۔

ایسی فضاء پیدا کی جانی چاہئے۔ یہ فضاء اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے اگر ہم سر جھکانے کی بجائے سینہ تان کر ہر مقابلے کیلئے تیار ہو جائیں۔ اب وقت ہے کہ ہم بھارت کے دفاعی بجٹ کے اعداد و شمار اور اس کی جنگی تیاریوں کو بار بار بیان کر کے پاکستانی عوام کو خوف زدہ کرنے سے باز آجائیں۔ ہمیں گھٹنوں کے بل ہو کر امن کی درخواستیں کر کے پاکستانی اور جموں و کشمیر کے عوام کے حوصلے جو جدوجہد آزادی میں مصروف ہیں، کم نہیں کرنے چاہئیں۔ بھارت مناسب موقع کی تلاش میں ہے اور وہ پاکستان پر ضرور حملہ کرے گا۔ بھارت پاکستان کی طرف سے امن کی تجاویز اور بامقصد مذاکرات کی پیشکش کے پیش نظر ہتھیار نہیں ڈالے گا اور نہ ہی وہ غیر ملکی طاقتوں کی اپیل پر اپنے دفاعی اخراجات میں کمی کرے گا۔ وہ اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنے کی مہم جاری رکھے گا۔

ہمیں باتیں کرنے کی بجائے حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے۔ بھارت اپنی روایتی پالیسیوں کے رخ کو تبدیل کرنے کیلئے تیار نہیں ہے کیونکہ اس کے تعصب کی جڑیں صدیوں پیچھے جنم لیتی ہیں اور اگر خدانخواستہ وہ کشمیر کو ہڑپ کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو وہ اسی پر اکتفا نہیں کرے گا۔ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا، جب تک وہ پاکستان کو ختم نہیں کر دیتا۔

کیا برصغیر کی ہزاروں سال پرانی تاریخ پاکستان کے لوگوں کو یہ سبق نہیں سکھلاتی کہ بھارت الفاظ پر کبھی دھیان نہیں دھرے گا؟ بھارت مٹو کے الفاظ کا پیروکار ہے جو تمہاری کتابوں سے راہنمائی حاصل نہیں کرے گا بلکہ اس کا قائد کوتیلیہ ہے۔ ہتھیار بند بھارت کا جواب پاکستان کے مسلح ہونے میں ہے۔ تم اس بات کی کوشش مت کرو کہ بھارت کو ہتھیار نہ دیئے جائیں کیونکہ یہ تمہارا فرض نہیں ہے کہ تم عادی جارح کو غیر مسلح کرو۔ اس کی بجائے تم اپنے عوام کو بندوقیں دو، جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کا جواب یہی ہے کہ پوری قوم اپنے وطن اور حقوق کی حفاظت کیلئے تیار ہو۔ جب پوری قوم مسلح ہو تو اس صورت میں تباہی ضرور ہو سکتی ہے مگر شکست کبھی نہیں ہو سکتی۔ ویت نام کی جنگ سے یہی سبق ملتا ہے اگر ہم ان کی بہادری سے سبق حاصل نہیں کرتے تو پھر ہم کبھی سبق حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے خدا کے نام پر بھارتی قوت اور اس کے تجم اور اس کے اثرات کے بارے میں باتیں کرنا چھوڑ دو۔ قوم کو تیار کرو تاکہ وہ فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اگر ویت نام کے بہادر عوام اپنی جدوجہد کو اسی منطق پر آزماتے اور لائحہ عمل اختیار کرنا ہی ہو گا اور بہتر یہی ہے کہ ہم اس تنازعہ پر ہی یہ رویہ اختیار کر لیں ہمیں اپنے حقوق کے

www.bhutto.org

حالات کو جوں کا توں تسلیم کر لیتے تو وہ بھی اپنے دفاع میں ایک گولی چلائے بغیر دنیا کی طاقت ور ترین قوم کے آگے ہتھیار ڈال دیتے لیکن یہ سبق وحشت ناک نہیں ہے اور نہ ہی یہ سبق رومنوں کے زمانے سے لے کر اب تک تاریخ کا ہے۔

اگر انصاف اور دھاندلی' جابر و مجبور کے درمیان فیصلہ طاقت کے بل بوتے پر ہی ہوتا تو آج دنیا میں رومن حکمرانی کرتے نظر آتے لیکن تاریخ ہمیں اس سے مختلف سبق دیتی ہے کسی ملک پر قبضہ ہمیشہ قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے قوموں کی آزادی سلب نہیں کی جاسکتی۔ جارحیت کو ہمیشہ کیلئے کھلی چھٹی نہیں دی جاسکتی۔ بہرحال ناجائز دباؤ بہرحال ختم ہو کر ہی رہتا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آج پوری دنیا زنجیروں میں جکڑی ہوتی اور موجودہ تہذیب کا جو اپنی پوری تابانی کے ساتھ دنیا میں قائم ہے کوئی وجود نہ ہوتا اور دنیا ایک قید خانے کی صورت اختیار کر جاتی۔ دنیا کی ابتداء سے لے کر اب تک محکوم حاکموں اور جابروں کے خلاف جدوجہد کرتے آئے ہیں۔ اس جدوجہد کی بدولت انسانیت نے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ یہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ ہمیشہ کمزور نے انصاف اور برابری کے نام پر طاقت ور پر فتح پائی ہے۔

اگر ہتھیاروں کی برتری پر سب کچھ منحصر ہوتا تو دنیا میں کوئی بھی جنگِ آزادی نہ لڑی جاتی لیکن تاریخ شاہد ہے کہ نہتے عوام نے اپنے خالی ہاتھوں کی مدد سے طاقت ور حملہ آوروں کو شکست دی ہے اور چھوٹی قوموں نے ناقابلِ تسخیر فوجوں کے مقابلے میں آزادی حاصل کی۔ جموں و کشمیر کے عوام تاریخ کے اس دھارے سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ تہذیب کے رخ کی نفی کریں۔ بھارت وہ پہلا حملہ آور نہیں ہو سکتا جو اپنی تباہی کے انجام سے بچ سکے۔ بھارت دنیا کی ان تمام طاقتور سلطنتوں سے زیادہ طاقتور نہیں جن کے قلعے ماضی میں مسمار ہو چکے ہیں۔ بھارت کی ذات پات سے متاثر بیمار سوسائٹی کو پیغمبروں کی کون سی دعائیں حاصل ہیں کہ وہ ہمیشہ فاتح کے روپ میں قائم رہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ بھارت طاقت ور اور ناقابلِ شکست ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ بزدل اور کمزور ہو گئے ہیں۔ اسی خوف کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ کشمیر پاکستان کے لئے اور پاکستان کشمیر کے لئے نہیں ہے اور یہ کہ ہم کشمیر کے لئے پاکستان کے وجود کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ یہ عجیب و غریب دلائل خود مختاری کے ابتدائی قواعد کے بھی خلاف ہیں۔ یہی وہ منطق ہے جو بتدریج پاکستان کی جدوجہد کو کمزور ہونے کا باعث بنے گی۔ کیا یہ فراموش کیا جاچکا ہے کہ پاکستان کے عوام اپنی مادرِ وطن کے ایک ایک انچ کی حفاظت کرنے کے لئے تیار ہیں اور یہ کہ ملک کے کسی ایک حصے پر حملہ پورے ملک پر حملے کے برابر ہے۔

اس دلیل کی قوت اسی صورت حاوی ہو سکتی ہے اگر ہم پاکستان کو قسطوں میں دوسروں کے حوالے کر دینے کے لئے تیار ہو گئے ہوں۔ حقوق کی حفاظت کی خاطر قوموں نے دوسرے لوگوں کے لئے جنگیں لڑی ہیں۔ عظیم جنگیں انسانی حقوق کی حفاظت اور جارح کو ختم کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں۔

www.bhutto.org

اگر دنیا میں ایسی قومیں موجود ہیں جو دوسروں کے حقوق کے لئے لڑنے کے لئے تیار ہیں تو ہمیں کم از کم اپنے علاقے کی حفاظت کے لئے جنگ کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ آؤ ہم عہد کریں کہ ہم ان دلائل کو نہیں سنیں گے جن سے حملہ آوروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور جن سے ہمارے عوام کی رسوائی ہوتی ہے۔

جموں و کشمیر کا تنازعہ حقِ خود اختیاری کی بنا پر حل ہونا چاہئے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی اور کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے جب ہم اس تنازعے کے حل کے بارے میں بار بار لچک دار زبان ہوتے سنتے ہیں تو ہمیں تشویش ہوتی ہے۔ قدم بہ قدم ہم نے حقِ خود اختیاری کا موقف چھوڑ کر بامقصد مذاکرات کا ذکر شروع کر دیا ہے۔

اس مسئلہ کا باعزت حل حقِ خود اختیاری کے استعمال میں ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ جموں و کشمیر کسی جاگیر کا ٹکڑا نہیں ہے کہ اس پر تجارتی سطح پر بات چیت کی جائے۔ اگر ایک دفعہ ہم حقِ خود اختیاری کے اصول سے دستبردار ہو جاتے ہیں تو ہم اس اخلاقی اور سیاسی ذمہ داری سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں جو جنگ کے تمام ہتھیاروں سے زیادہ اہم ہے۔ یہ سوال غیر لچک دار ہونے کا نہیں ہے بلکہ سفیرانہ زبان سے دھوکہ کھا جانے کا ہے۔ پاکستان کو اس سلسلے میں کوئی رعایت نہیں روا رکھنی چاہئے۔ یہ بھارت ہے جو حملہ آور ہے۔ یہ بھارت ہی ہے جس نے جموں و کشمیر پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے یہ پاکستان کیلئے نہیں کہ وہ معقول رویہ اختیار کرے۔ یہ بھارت ہے جس نے غیر معقول رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ پاکستان کیلئے نہیں کہ وہ اپنے رویئے میں لچک پیدا کرے۔ یہ بھارت ہے جس نے غیر لچک دار رویہ اختیار کر رکھا ہے جب یہ کہا گیا تھا کہ ہم ایک ہزار سال تک جنگ لڑنے کیلئے تیار ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم لفظوں کے لغوی معنوں کے پیش نظر جسمانی طور پر ایک ہزار سال تک جنگ جاری رکھیں گے اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کسی حالت میں حقِ خود اختیاری کے اصول پر سودا بازی نہیں کریں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا عزم کبھی کمزور نہیں پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کبھی ناجائز دباؤ برداشت نہیں کریں گے۔

یہ بہتر ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی حل نہ ہو۔ بجائے اس کے کہ ہم اس کا غیر منصفانہ حل قبول کر لیں اس مسئلہ کا غیر منصفانہ حل غیر یقینی صورتحال سے بدتر ہے۔ آخری حل کیلئے ضروری ہے کہ وہ انصاف پر مبنی ہو۔ اسی وجہ سے ہمارے اندر اتنا صبر اور حوصلہ ہونا چاہئے کہ ہم منصفانہ حل تلاش ہونے تک انتظار کر سکیں۔ ہمیں حوصلہ نہیں چھوڑنا چاہئے ہمیں دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے ہمیں باہوش رہنا چاہئے اور مناسب موقع کا انتظار کرنا چاہئے۔ آئندہ بھی مناسب مواقع آئیں گے جس طرح ماضی میں آتے رہے ہیں۔ پاکستان تین مرتبہ اس مسئلے کے باعزت حل کے قریب آ گیا تھا۔ 1948ء میں ہم سری نگر کے قرب و جوار میں تھے۔ 1962ء میں بھارت و چین کے درمیان تصادم میں دوسرا موقع تھا۔ 1965 میں پاکستان جموں و کشمیر کو آزاد کرانے کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔

www.bhutto.org

اگر گذشتہ 20 سال کے عرصے میں تین مختلف مواقع پر پاکستان اپنے حقوق حاصل کرنے کے قریب تر ہو گیا تھا تو اس امر کا بہت زیادہ امکان ہے کہ آئندہ بھی ایسے مواقع پیدا ہوں گے۔ ہمیں اس موقع کا انتظار کرنا چاہئے اور مخالفت کی پالیسی پر کاربند رہنا چاہئے۔

تمام دنیا میں بہت سے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ بھارت میں بھی کئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ وقت کا دھارا ہماری موافقت میں ہے۔ ہمیں جلدی میں کوئی کام نہیں کرنا چاہئے۔ بھارتی توپوں کو دیکھ کر کانپنا نہیں چاہئے۔ یہ بات پاکستانی عوام کے خمیر میں شامل نہیں ہے کہ وہ کانپیں' عوام تیار ہیں اور اب یہ قیادت پر ہے کہ وہ عوام کو ان کے آخری مقصد سے ہمکنار کرے۔ یہ جنگ کرنے کا مطالبہ نہیں ہے یہ مطالبہ انصاف کا تقاضا کرتا ہے ہم امن کے خواہاں ہیں لیکن ہمیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے اور اپنی قوم کو سفارتی بلیک میل کا نشانہ نہیں بنانا چاہئے۔

بھارت کے ساتھ میل جول کے سلسلے میں گذشتہ ایک ہزار سال کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ آئندہ ایک ہزار سال کی تاریخ بھی ہمارے سامنے ہوگی۔ ہمارا مستقبل اتنا ہی درخشندہ ہو گا جتنا کہ ہمارا ماضی تھا۔ بشرطیکہ ہم اپنے ایمان کو پرکھنا اور اس سے قوت حاصل کرنا جان جائیں۔ اگر ہم اپنے نظریہ حیات اور وعدوں پر کاربند ہو جائیں تو ہم کامیاب ہو جائیں گے اور جموں و کشمیر کے لوگ پاکستانی عوام کے ساتھ خونی رشتے میں منسلک ہو جائیں گے۔

اگر ہم نے اپنے ماضی کی تاریخ سے ہٹ کر کوئی راستہ اختیار کیا تو ہم صرف جموں و کشمیر کو ہی نہیں چھوڑ دیں گے بلکہ پوری قوم کیلئے بدنامی کا باعث بنیں گے اور ملک کو خطرے سے دوچار کر دیں گے۔

یہ پارٹی کا عہد ہے کہ وہ عزت کے راستے سے کبھی نہیں ہٹے گی اور جموں و کشمیر کو آزاد کرانے کے عہد سے کبھی نہیں پھرے گی۔ نتائج سے بے نیاز ہو کر پارٹی خدا اور انسان سے کئے گئے وعدے کو پورا کرے گی۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

لیڈر بھی ہیرو بھی

پیپلز پارٹی کے قیام کے ساتھ ہی سامنے آنے والے جس منشور اور دستاویزات کو پچھلے صفحات میں پیش کیا گیا ہے ان کی اہمیت سمجھنے کیلئے اس صورتحال کے بارے میں شہید بھٹو کے تجزیئے سے بھی آگاہی ہو۔ بھٹو کے تجزیئے کی بنیادی بات یہ ہے کہ وہ پاکستان کی اندرونی صورتحال میں موجود استحصال اور آمریت کا پس منظر بین الاقوامی صورتحال کو قرار دیتے تھے اور اس سائنسی حقیقت سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ پاکستان کوئی علیحدہ ملک نہیں ہے بلکہ سامراجیت کے جال میں پھنسی ہوئی ایک ایسی نو آبادی ہے جو ایک طرف تو بین الاقوامی سامراجی نظام کا جزو ہے لیکن دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر چلنے والی قومی خودمختاری اور طبقاتی آزادی کی تحریکوں کا حصہ بھی ہے۔ شہید بھٹو کے اس نقطہ نظر کو سائنسی حوالے سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شہید بھٹو نے اسٹالن کے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا تھا جس کے تحت اس نے امریکی صدر روز ویلٹ کے ساتھ اقرار کر کے تھرڈ انٹرنیشنل کو خود ہی ختم کر دیا تھا۔ لینن نے یہ ادارہ اس اصول کے تحت بنایا تھا کہ چونکہ سرمایہ دار نظام عالمی حیثیت رکھتا ہے اس لئے انقلابی پارٹی کو بھی انٹرنیشنل حیثیت میں قائم رہنا چاہئے لیکن پسماندہ عوام اور قوموں کے حوالے سے بھٹو شہید نے "سوشلزم ان ون کنٹری" اور "انٹرنیشنل آنسولیشن" کی پالیسی کو مسترد کر دیا اور پاکستانی عوام کی تحریک کو ایک طرف تو ملک کے اندر تیز کیا دوسری طرف عالمی سطح پر بھی دنیا بھر کے عوام اور ترقی پسند عناصر کے ساتھ اس کے رشتے جوڑے۔ اس ضمن میں ایک تو بھٹو شہید کی اپنی کتاب "متھ آف انڈی پینڈنس" ایک تاریخ

www.bhutto.org

ساز دستاویز کے طور پر موجود ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم دستاویز ان کا وہ خط ہے جو انہوں نے 1978ء میں جیل سے اپنی سیاسی جانشین محترمہ بے نظیر بھٹو کے نام لکھا اور اس میں جگہ جگہ یہ ذکر کیا کہ 1970ء سے پہلے بھی وہ کیا سوچتے تھے اور اس کے بعد اب تک کیا سوچتے ہیں؟

1989ء میں 71 کلفٹن کراچی سے شاہنواز بھٹو ٹرسٹ سے شائع ہونے والی یہ کتاب "مائی ڈیریسٹ ڈاٹر" شہید بھٹو کے اسی خط پر مشتمل ہے جو شہید نے ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی سے 21 جون 1978ء کو اپنی صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر ان کے نام لکھا تھا۔ (اس کتاب کا کوئی حصہ ہم پبلشرز کی پیشگی اجازت کے بغیر شائع نہیں کر سکتے تاہم اس کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ جان سکتے ہیں کہ) 1965ء میں ایوبی وزیر خارجہ کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے بھی شہید بھٹو اس حقیقت سے واقف تھے کہ مسترد ہونے اور تمسخر کا شکار بننے والا چین آئندہ بیس سال تک دنیا کی مرکزی حیثیت اختیار کرے گا۔ علاوہ ازیں اس کتاب سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ امریکی تجزیہ نگار سلیگ ہیریسن نے کہا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے تو 1962ء میں اپنی قومی اسمبلی کی تقریر میں ہی پاکستان کو چین دشمنی کی کارکردگی سے باہر نکال دیا تھا اور چین امریکہ رقابت کا تصور بھی پیش کر دیا تھا اور 20 دسمبر 1962ء کو سلیگ ہیریسن کو ہی انٹرویو دیتے ہوئے یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ پاک چین تعلقات سے پاکستان اور امریکہ کے باہمی تعلقات کو نقصان پہنچے گا اور پھر شہید نے یہ پیش گوئی بھی کر دی تھی کہ 1970ء کی دہائی کے پہلے برسوں میں چین اور امریکہ اپنے اختلافات ختم کر دیں گے اور پھر 1968ء میں شہید بھٹو نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ "یورپ کی نوجوان نسل سرمایہ داری نظام اور کمیونزم کو مسترد کر دے گی" واضح رہے کہ شہید بھٹو کی یہ باتیں سائنسی حقائق بن کر درست ثابت ہو رہی ہیں اور یہ ان کی دوربینی کا عظیم ثبوت ہے کہ انہوں نے 1967ء میں اپنی پارٹی قائم کرتے ہوئے اپنا منشور ان حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے بنایا تھا جو آج سامنے آ رہے ہیں اور وہ پیپلز پارٹی آج پھر ایک عظیم ترین حقیقت کے طور پر قائم ہے جسے ختم کرنے کیلئے مارشل لاء حکومت نے دس سال تک ملک کے تمام تر انتظامی، اقتصادی وسائل اور سیاسی عناصر کو استعمال کیا تھا۔ علاوہ ازیں شہید بھٹو 1967ء سے پانچ سال قبل ہی یہ سوچنے لگ گئے تھے کہ یورو کمیونزم نے کیپٹل ازم کے ساتھ جو سمجھوتے بازی کی ہے اسے نئی نسلوں کی حقیقی رجعت پسندی برباد کر دے گی۔ حتیٰ کہ آں امریکی وزارت خارجہ اور وزارت دفاع کے زبگنیو برزنسکی اور سائرس وانس جیسے بڑے بڑے مہروں کو بھی شہید بھٹو نے پیپلز پارٹی کے وجود میں آنے سے پہلے ہی یہ بات بتادی تھی کہ چین اور روس کے بارے میں امریکی پالیسیاں ناکام ہوں گی اور یہ کہ شہید بھٹو اس وقت بھی یہ سمجھتے تھے کہ امریکہ جو جمہوریت چلا رہا ہے اس کیلئے کوئی اخلاقی مفہوم کسی بھی صورت میں نہیں بنتا اور پھر یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ 1966ء میں شہید بھٹو نے ہی انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو اور جنرل سہارتو کے درمیان ہونے والے تصادم کو روکا تھا اور صدر سوئیکارنو کو لڑائی تیز کرنے سے باز رکھا

www.bhutto.org

تھا۔ شہید بھٹو کی کوششوں کی وجہ سے ہی انڈونیشیا کی ترقی پسند قوتیں مزید چند سال زندہ رہیں ورنہ سہارتو کے اقتدار میں آنے اور سوئیکارنو کے معزول و قید ہونے سے بہت سال پہلے کچل جاتیں۔

بین الاقوامی سطح پر بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر تجزیے سامنے رکھتے ہوئے شہید بھٹو اُدھر ایک طرف ایک پاپولسٹ سوشلسٹ تحریک شروع کر رہے تھے تو دوسری طرف ان کو یہ بھی پورا احساس تھا کہ اگر موجودہ حکمران طبقوں کے اہم افراد خصوصاً سول اور ملٹری بیوروکریسی کے ساتھ انہوں نے شطرنجی چالوں کی حکمتِ عملی نہ اپنائی اور ان عناصر کو شکست نہ دی تو یہ پارٹی ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں اختیار کر سکے گی۔ اس حکمتِ عملی کا تانا بانا تیار کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک برجست لڑائی شروع کر دی تھی۔ ایک طرف وہ محنت کش عوام کو بیدار اور متحرک کرنے جا رہے تھے اور اس کام کیلئے برصغیر کے محنت کشوں کی روحانیت کا نمائندہ کردار بن کر آ رہے تھے کہ لوگ انہیں کبھی ہیر رانجھا کی داستان کا تانا بیرو کہتے تھے' کبھی رانو اور مومل کی سندھی داستان کا تانا بیرو قرار دیتے اور کبھی سستی کو چھوڑ کر جانے والے پنوں کو بھی بھٹو شہید کی صورت میں واپس آتا ہوا دیکھتے۔ بھٹو شہید نے مڈل کلاس کو متحرک کرنے پر بہت زیادہ زور دیا کیونکہ انہیں علم تھا کہ یہ کلاس جاگیرداروں' سرمایہ داروں' سامراجیوں اور تاجروں کے نیٹ ورک کو چلانے والی انگریزوں کی بنائی ہوئی بیوروکریسی کا اوزار بن کر کام کر رہی ہے اور ایوبی آمریت کو استحصالی طبقوں کے ساتھ ساتھ صرف اسی کلاس کی حمایت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے معاہدہ تاشقند کو چیلنج کر کے ایک طرف تو بھارتی بورژوازی کی توسیع پسندی کو للکارا دیا اور دوسری طرف پاکستانی قومیتوں کے اتحاد پر مشتمل اس قوم پرستی کو متحرک کر دیا جو نئی دہلی کے خلاف صدیوں سے جدوجہد کرتی آئی تھی۔ ایوب خان کے پی ڈی سسٹم پر انہوں نے شدید تنقید کی تو عوام الناس کو پہلی بار یہ یقین ہونے لگا کہ اقتدار میں دخل دینے کا اختیار بھی انہیں وہ لیڈر دے سکتا ہے جو امریکی سامراج اور اس کی یورپی حواری قوتوں کو جھٹکا دے سکے اور جو 1965ء کی جنگ کے دوران اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ کو چت کر سکتا ہے اور جس کا نام ذوالفقار علی بھٹو ہے۔

یہ وہ چند باتیں تھیں جن کو لوگوں نے عملی زندگی کی تلخیوں کی یونیورسٹی سے حاصل ہونے والے علم کی شکل اس وقت دی جب انہیں بھٹو جیسا پروفیسر مل گیا جو روحانی حوالے سے خوبصورت بھی تھا' دلیر بھی اور دانشور بھی۔

عوام نے اپنی محبت کا پہلا اظہار 22 جون 1967ء کو کیا جب بھٹو نے گول باغ میں جلسہ عام منعقد کیا۔ اس کے گراؤنڈ میں پانی چھوڑ دیا گیا تھا اور جب بھٹو شہید مائیک پر آئے تھے تو انتظامیہ نے تاریں کاٹ کر لاؤڈ سپیکروں کی آوازیں بند کر دیں اور ان میں کرنٹ چھوڑ دیا تھا اور پھر اسٹیج پر آ کر ان پر حملہ بھی کر دیا تھا۔ اس وقت بھٹو پر فائرنگ کروانے کا منصوبہ بھی بنوایا گیا اور ان کے ساتھیوں نے انہیں ایک رکشا میں بٹھا کر بچایا۔ اس جلسے میں بھٹو تقریر نہ کر سکے لیکن انتظامیہ نے جو حرکت کی' اس کے

www.bhutto.org

خلاف عوام کا ایجی ٹیشن بھٹو کے فلسفے کی اَن کہی 'اَن سُنی تفسیر بن گیا۔ اس عوامی ایجی ٹیشن کے ساتھ ایوبی انتظامیہ نے عوام پر تشدد شروع کر دیا۔ دوسری طرف بھٹو نے لاہور کے بعد پنجاب کے سب سے بڑے صنعتی شہر لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کا سفر شروع کر دیا جہاں انہیں بار روم سے خطاب کرنا تھا لیکن فیصل آباد شہر کے اندر انہیں پانچ میل کا سفر ایک وسیع و عریض جلوس کی وجہ سے پانچ گھنٹے میں طے کرنا پڑا جس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستانی صنعتوں کی پرولتاری قوت کا ہراول دستہ بھی بھٹو کی قیادت میں متحرک ہو گیا تھا۔ اس کے بعد نومبر میں بھٹو نے سرحد کا دورہ کیا تو پتہ چلا کہ غفار خانی سیاست بھی اس رومانویت پسند سوشلزم کے سامنے نہیں ٹھہر سکی اور نیشنل عوامی پارٹی اسکے بہاؤ میں تحلیل ہونے لگ گئی کیونکہ اجتماعِ عام میں اسلامی سوشلزم کی پہلی وضاحت جو شہید بھٹو نے پشاور کے جلسے میں کی تھی اس سے جاگیردار سوشلسٹوں اور میکانکی سوشلسٹوں کا اسٹالن ازم بے معنی ہو کر رہ گیا۔

فیصل آباد سے لاہور اور پھر پشاور سے کراچی تک کے جلسوں کا پہلا مقصد دراصل یہ تھا کہ 30 نومبر 1967ء کا وہ کنونشن منعقد ہو (جس میں پیپلز پارٹی قائم کی گئی اور جس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے) دوسرا مقصد تھا کہ اس تجزیے کو پرکھا جائے جو پارٹی کے منشور کی بنیاد تھا اور جو 30 نومبر 1967ء کے کنونشن میں پیش ہونا تھا۔ اس تجزیے کے تین پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ شہید بھٹو نے اس دور کے بین الاقوامی 'سیاسی اور ثقافتی معاملات کو کس طرح سمجھا تھا؟ دوسرا یہ کہ اس صورتحال میں پاکستان کے سماجی اور اقتصادی ڈھانچے میں وہ کیا تبدیلیاں لانا چاہتے تھے اور تیسرا یہ کہ تبدیلیاں لانے کا طریقِ کار کس حد تک درست ہے؟ بھٹو نے کلاسیکل اور میکانکی طبقاتی جدوجہد اور ٹریڈ یونین ازم کا راستہ اختیار کر کے اپنے آپ کو محدود نہیں کیا۔ انہوں نے رومانوی پاپولسٹ طریقہ اختیار کیا اور پچاس ساٹھ سال سے برِصغیر میں ترقی پسند سیاست کرنے والی پارٹیوں کو خیرباد کہہ دیا۔ اسی وجہ سے پاکستان پیپلز پارٹی ایک ملٹی کلاس پارٹی کی صورت میں قائم ہوئی اور اس میں مڈل کلاس کو پُرزور طریقے سے متحرک کیا گیا۔ کلاسیکل میکانکی لیفٹ لیڈرشپ شہید بھٹو پر اس حوالے سے الزام لگاتی تھی کہ بھٹو نے امیر طبقوں کو پارٹی میں شامل کر کے دولت مندوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا ہے لیکن بھٹو شہید کا نقطہء نظر دراصل یہ تھا کہ جب تک محنت کش عوام کی اکثریت سیاسی شعور اور انقلابی تنظیم کے تمام مرحلوں سے گذر نہ جائے تب تک امیر طبقوں کے اندرونی تضادات کو یوں استعمال کرنا چاہئے کہ ان میں سے جو عناصر اپنے ساتھ شامل ہو جائیں ان کو اس وقت تک ساتھ رکھا جائے جب تک یہ استعمال ہو سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ شہید بھٹو یہ کہا کرتے تھے کہ معراج محمد خان اور غلام مصطفیٰ کھر دونوں میرے بیٹے ہیں۔ دونوں کو وہ ساتھ ساتھ چلانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پارٹی میں ایک طرف ماؤزے تنگ تھاٹ کا نظریہ رکھنے والے شیخ رشید پارٹی میں وائس چیئرمین تھے اور دوسری طرف جے اے رحیم جیسے ارسٹوکریٹ سوشلسٹ بھی جنرل سیکرٹری کے عہدہ پر فائز تھے اور ساتھ ہی ڈاکٹر مبشر حسن جیسے ٹیکنوکریٹ بھی موجود

www.bhutto.org

تھے۔ حفیظ پیرزادہ جیسے بورژوا لبرل بھی تھے اور رسول بخش تالپور اور غلام مصطفیٰ جتوئی جیسے جاگیردار بھی تھے ان سب سے پیپلز پارٹی کے اس منشور پر دستخط کروائے گئے جو اسلامی سوشلزم کو پاکستان میں رائج کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ شہید بھٹو کے تجزیئے کے مطابق عالمی سامراج دنیا بھر کے عوام کا دشمن نمبر ایک تھا۔ جنوبی ایشیا میں بھارتی بورژوا طبقے کو وہ ابھرتی ہوئی نئی سامراجی قوت سمجھتے تھے جو امریکہ اور یورپ کے خلاف صرف اس لئے لڑتا تھا کہ خود سامراجی طاقتوں کا حصہ دار بننا چاہتا تھا اور سوشلسٹ قوم پرستی کا قطعاً حامی نہیں تھا۔ سوویت یونین کا اسٹالن ازم بھٹو شہید کی نظر میں قطعی طور پر انسان دوست نہیں تھا بلکہ وہ لینن ازم اور ماؤزے تنگ کی فکر کے امتزاج میں برصغیر کے محنت کشوں کی وہ رہنمائی شامل کر رہے تھے جو صوفیاء کی تحریک سے پھوٹتی ہے۔

شہید بھٹو کی نظر میں یورپی سامراج عالمی سامراج کا کل پرزہ بن چکا تھا اور تیسری دنیا میں افریقہ اور مشرقِ اوسط کی سامراج دشمن تحریکیں ایک نئی طاقت کے طور پر ابھر رہی تھیں اس لئے انہوں نے پاکستان کو برِصغیر کا حصہ بنائے رکھنے کی بجائے اسے شرقِ اوسط اور برِاعظم افریقہ کے ساتھ منسلک کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ چین کے مابین تضاد کو سمجھتے ہوئے چین کو اپنا عظیم ترین اتحادی بنایا اور ویت نام کی تحریکِ آزادی کی بھرپور حمایت کی۔

اپنی کتاب "متھ آف انڈی پینڈنس" میں بھٹو نے عالمی سیاسی' اقتصادی اور سماجی پس منظر کا جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ ان کی سیاسی راہِ عمل کی ایک ایسی بنیاد ہے کہ جس سے دنیا بھر کے عظیم قوم پرست سیاستدان بھی مستقبل کی راہوں کیلئے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں تیسری دنیا کے سیاسی اقتصادی اور ثقافتی مستقبل کو جن دلائل سے بھٹو نے منور کیا ہے وہ تاریخ کا ایک روشن باب بن چکے ہیں۔ 1967ء سے 1971ء تک جو باتیں انہوں نے کہیں' وہی 1978ء میں موت کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر سپریم کورٹ کے لئے اپنا بیان لکھتے ہوئے بھی کہیں۔ اس بیان میں اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ لکھتے ہوئے انہوں نے بتایا ہے کہ "1935ء میں جب میں سات برس کا تھا میرے والد جو ان دنوں بمبئی حکومت میں وزیر تھے تو انہیں بمبئی کے انگریز گورنر نے تینوں بیٹوں کے ہمراہ ایک دعوت میں بلایا۔ میرے بڑے بھائی امداد علی اس وقت 21 برس کے تھے ان کا جب گورنر سے تعارف کرایا گیا تو گورنر نے کہا "کتنا خوبصورت نوجوان ہے" میرا بھائی چونکہ ایک منجھا ہوا اور سلجھا ہوا اشرافیہ کا رکن تھا اس لئے اس نے جواباً کہا "جناب والا مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے کیونکہ یہ بات ہمارے خوبصورت گورنر کے منہ سے نکلی ہے۔" لیکن میں نے اپنی کمزور سی آواز میں کہا "ہز ایکسی لینسی گورنر صاحب اس لئے خوبصورت ہیں کہ ان کی پرورش ہمارے حسین ملک کے خون سے ہوئی ہے۔" جس پر گورنر نے میرے والد سے کہا کہ آپ کا یہ بیٹا تو شاعر ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ میں ایک شاعر انقلابی ہوں۔"

سپریم کورٹ میں اپنے بیان میں شہید بھٹو نے یہ نہیں کہا کہ وہ انقلابی شاعر ہیں بلکہ یہ کہا کہ وہ شاعر

www.bhutto.org

انقلابی ہیں "شاعر" اور "انقلابی" کے دو لفظوں کے درمیان "اور" کا لفظ بھی نہیں لگایا بلکہ یہ کہا کہ وہ انقلاب کو شاعرانہ بنیادوں پر ذہن میں رکھتے ہیں "اس لئے شاعر انقلابی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تیسری دنیا کے محنت کش عوام کی رومانویت صدیوں کے تجربات سے پھوٹنے والی سوشیالوجی کی وہ سائنسی حقیقت ہے جس کے بارے میں شہید بھٹو نے تحریر بے نظیر بھٹو کے نام اپنے خط پر مشتمل کتاب "مائی ڈیئریسٹ ڈاٹر" میں لکھا ہے کہ "میں نے سیاست اپنے باپ سے بھی اور غربت کا درس اپنی ماں سے حاصل کیا تھا" شہید بھٹو کی یہ باتیں سپریم کورٹ کے بیان اور بے نظیر بھٹو کے نام اپنے خطوط میں تو 1977ء کے بعد سامنے آئی ہیں لیکن رومانوی یا سوشلسٹ پارٹی والے نعرہ اور اس کے جلسوں میں "ہے جمہور" کی دھن پر دھمال ڈالنے والے بھٹو کے تاریخی عمل میں اسی وقت نظر آگئی تھیں جب وہ پاکستان پیپلز پارٹی کو وجود میں لا کر الیکشن کی سیاست کو انقلابی سیاست کا ایک اہم ترین جزو قرار دیتے ہوئے تحریک چلا رہے تھے۔ الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان انہوں نے پارٹی کی اس کانفرنس میں کیا تھا جو 1970ء میں منعقد ہوئی۔ شہید بھٹو کی اس راہ عمل میں ایک طرف یہ حقیقت بھی سامنے تھی کہ جب وہ برکلے یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو امریکی گوروں کے خلاف کالے گوروں کی جو تحریک چل رہی تھی اس کی بھٹو نے بھرپور حمایت کی تھی۔ ایسے سینکڑوں دیگر تجربات اور سیاسی تاریخ کا گہرا اور وسیع مطالعہ تھا جو شہید بھٹو کو ان کی والدہ سے ملی ہوئی غربت کی سوشیالوجی کے حوالے سے نیا راستہ دکھا رہا تھا اور اس راستے پر چلنے والا قافلہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کی صورت میں لے کر چل رہے تھے۔

تیسری دنیا اور سامراج کے تضادات کی عمومی اور طویل المدت صورتحال میں ایک اہم سوال یہ تھا کہ عمومی صورتحال کے ساتھ داخلی طور پر وہ کون سے خصوصی امور ہیں جنہیں ٹیکنیکلی استعمال کر کے پیپلز پارٹی کو ایک فوری تحریک کی صورت دی جا سکے؟ اس سوال کا جواب صرف اس تجزیئے میں ہے کہ بین الاقوامی پس منظر میں پاکستانی عوام کے تضادات کیا ہیں؟ شہید بھٹو باقی سب سیاستدانوں کی نسبت اس بات کو زیادہ جانتے تھے کہ پاکستانی عوام کا قومی سطح پر سب سے بڑا اختلاف بھارت کے ساتھ ہے جس کی مرکزی حکومت کے خلاف برصغیر کی مظلوم قومیتوں اور طبقوں نے ایک طویل جدوجہد کی تھی اور وہاں کے برہمن حکمران طبقوں کی سماجی و معاشی بالادستی سے بغاوت کر کے اسلام قبول کیا تھا اور اسی جدوجہد نے دہلی کی مرکزیت کو توڑنے کیلئے پاکستان بنایا تھا۔ برصغیر کے مظلوم طبقوں اور قومیتوں کا برہمنوں سے ساتھ یہ تضاد اسی وقت سے چل رہا تھا جب مظلوم طبقوں اور قوموں نے ذات پات کے نظام کی نفی کرنے کیلئے بدھ مت کو قبول کیا تھا اور اس سے پہلے موہنجو داڑو کی تہذیب کے وہ حقیقی لوگ برہمن ازم کے خلاف تک لڑتے رہے تھے۔ یہ "کرشن" ہی دانشور اور مرشد کو دیوتا کہتے تھے اور خود اپنے فیصلے کو پابند کہتے تھے۔ آریاؤں (برہمنوں) کے خلاف برسر جنگ کالے پانڈوؤں کی پانچ سو سال پر محیط جنگ سے پھوٹنے اور صدیوں تک چلنے والی ثقافتی تحریکیں بالآخر بھگتی تحریک میں ڈھل گئی تھیں۔ تاریخ کی یہ لڑی

www.bhutto.org

شاہ لطیف بھٹائیؒ اور شہباز قلندرؒ جیسے صوفیاء کی فکر سے مالا مال ہوتے ہوئے پاکستانی عوام کی ثقافت میں رچ بس گئیں۔ شہید بھٹو نے ان تحریکوں کا ورثہ سندھ کی ثقافت اور اپنی ماں کی غربت سے حاصل کیا۔ یہی سبب ہے کہ بھٹو کو اس تہذیبی ارتقاء پر مکمل عبور حاصل تھا جو آج بھی دہلی کی مرکزیت پسندی کے مقابلے میں پاکستانی عوام کی خود مختاری کی آرزو اور آبرو بنا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہید ذوالفقار علی بھٹو نے 1965ء کی جنگ میں سلامتی کونسل سے لے کر معاہدہ تاشقند تک بھارت کے خلاف وہ کردار ادا کیا جو کسی بھی دوسرے لیڈر یا مجاہد نے ادا نہیں کیا تھا۔ بھٹو اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ امریکہ نے لیاقت علی خان کے ساتھ میوچل اسسٹنس کے نام پر پہلا معاہدہ کیا تھا۔ اس میں یہ شرط عائد کر دی تھی کہ پاکستان کمیونسٹوں کے خلاف تو لڑ تا رہے لیکن بھارت کے خلاف کبھی کوئی قدم نہ اٹھائے اور بھٹو یہ بھی جانتے تھے کہ لیاقت علی خان نے بھارت کے خلاف سخت موقف اختیار کیا تو ان پر امریکہ اور مغربی ممالک نے یہ زبردست دباؤ ڈالا تھا کہ وہ کشمیر کے مسئلے کو اٹھانا چھوڑ دیں اور بھارت کو ناراض نہ کریں پھر اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ جب لیاقت علی خان نے جلسہء عام میں مغربی ملکوں کے اس دباؤ کے بے نقاب کرنے کا پروگرام بنا لیا تو اس جلسہ میں تقریر سے پہلے ہی انہیں شہید کر دیا گیا۔ سیاسی تاریخ بار بار یہ بتاتی ہے کہ دشمنوں کی سخت کار روائیاں یہ سبق دیتی ہیں کہ جس سوال پر دشمن سخت ترین رویہ اختیار کرے، وہی درحقیقت ہمارے عوام کا سب سے بڑا مفاد ہوتا ہے لہٰذا بھٹو انڈیا کے خلاف سب سے بہادر وکیل اور لیڈر بن کر کھڑے ہو گئے۔

1965ء کی جنگ اور اس کے بعد پاکستان کے حالات کیا تھے؟ ایک طرف سوویت یونین امریکہ نوازی کی وجہ سے ناراض تھا اور بھارت سے دوستی کو ترجیح دے رہا تھا تاکہ مستقبل میں بھارت کو امریکہ دوستی سے ہٹا کر اپنے تھانیدار کے طور پر برت سکے۔ دوسری طرف امریکہ نے اگرچہ 1965ء کی جنگ کو پاک بھارت مصالحت میں بدلنے پر زور دیا اور یہ بات بھی مان لی کہ یہ مصالحت روسی اثر و نفوذ کے تحت کروائی جائے کیونکہ امریکہ اور روس کے درمیان طے ہونے والے معاہدے "سالٹ" میں یہ بات مان لی گئی تھی کہ جنوبی ایشیا میں روس کا اثر و نفوذ عارضی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ اس صورتحال میں بھٹو ایک طرف روس کے ساتھ مذاکرات کر کے اسے پاکستان کا دوست بنا رہے تھے اور دوسری طرف امریکہ اور روس دونوں کی بھارت نوازی کی مخالفت بھی کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے معاہدہء تاشقند کی شدید ترین مخالفت کی۔ اسی مسئلے پر وہ پاکستانی عوام کے مقبول ترین سیاسی لیڈر بھی بن گئے۔

پاکستان کے عوام کے طبقاتی مفادات کے ساتھ قومی مفادات کو شامل کر کے پیپلز پارٹی ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ اس مسئلہ پر اگرچہ چین نواز سوشلسٹ پارٹیوں اور مولانا بھاشانی جیسے لیڈروں کا موقف ان سے ملتا جلتا تھا لیکن یہ سوشلسٹ پارٹیاں رومانوی پاپولسٹ طریق کار سے بے خبر تھیں اور کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ ملکی انتخابات میں بھی حصہ لینا چاہئے۔ بھٹو شہید ہالہ کانفرنس میں الیکشن میں

www.bhutto.org

حصہ لینے کا فیصلہ کر کے سیاسی جنگ کے میدان میں اتر گئے اور مغربی پاکستان میں یہ میدان بھی مار لیا۔ اس صورتحال میں انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کو نیچا دکھانے کیلئے مولانا بھاشانی سے متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن خصوصی طور پر روس نواز لیفٹ اور عمومی طور پر آئسولیشن پالیسی کے مارے ہوئے چین نواز لیفٹسٹ نے اس اتحاد پر دستخط نہ ہونے دیئے اور مولانا بھاشانی نے بھی واپس جا کر پاکستان کو وعلیکم سلام کہہ دیا۔ یحییٰ خان نے خود ہی انہیں بتا دیا کہ وہ مشرقی پاکستان کو ساتھ نہیں رکھنا چاہتے۔

فوجی آمروں اور دائیں بازو والوں نے بھٹو کی سیاسی جدوجہد میں قدم قدم پر رکاوٹیں ڈال کے اور بائیں بازو نے بھٹو کے ساتھ انتخابی اتحاد سے انکار کر کے مشرقی پاکستان میں انہیں عوامی لیگ کے ساتھ مقابلے کی مہلت نہ دی۔ اگر یہ دونوں قوتیں بحران کی شدت کا اندازہ کر کے ملک کو بچانے کی کوشش کرتیں اور دونوں بھٹو کا ساتھ دیتیں تو عوامی لیگ کو فیصلہ کن کامیابی کا ڈرامہ رچانے سے روکا جا سکتا تھا۔ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ ان دونوں نے بھٹو دشمنی میں 'مجیب مخالف اکثریتی ووٹ' ضائع یا تقسیم کر دیا اور اقلیتی ووٹ لینے والی پارٹی کو ملک توڑنے کا موقع فراہم کیا اور اس کے بعد بھی مجیب کو راہِ راست پر لانے کی کوشش میں بھٹو کا ساتھ دینے کی بجائے مجیب کو شہ دیتے رہے۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں مجیب کی ہٹ دھرمی حد سے بڑھ گئی اور یحییٰ خان نے فوجی اقدام کا فیصلہ کر لیا تو پھر بھی دائیں بازو کے سیاستدانوں نے یحییٰ کا ساتھ دے کر مسئلے کے سیاسی حل کے راستے بند کر دیئے حالانکہ فوجی اقدام کے بعد بھی بھٹو سے تعاون کیا جاتا تو اکثریتی حکومت بنا کر ملک بچا سکتے تھے مگر ان لوگوں نے بھٹو کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پہلے خود ملک توڑا اور پھر انہی پر الزام لگا دیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد شہید بھٹو نے جو پاپولسٹ حکمتِ عملی اختیار کی اس میں ایک طریقِ کار یہ بنایا کہ نوجوان نسل خصوصاً طالبعلموں کو جمہوریت کی تحریک میں آگے بڑھایا جائے اور مزدوروں اور کسانوں کو ان کے ساتھ شامل کیا جائے۔ اس طریقِ کار کی خصوصیت یہ تھی کہ سب سے پہلے فوری اور سلگتے ہوئے مسائل کو اٹھایا جائے۔ اس حوالے سے انہوں نے پاکستان کی سیاست و معاشرت کو مکمل طور پر کھنگالا تھا اور سب سے پہلے اس بات کا احساس بھی انہی کو ہوا تھا کہ ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں طالبعلموں نے ایوب خان کی نافذ کی ہوئی پابندیوں کے خلاف جو جلسے شروع کر رکھے ہیں ان کو پیپلز پارٹی کی تحریک میں بدلا جا سکتا ہے۔ اس کے خلاف یہ بھی طے ہوا کہ مڈل کلاس کے اجتماعی مسائل پر توجہ رکھی جائے اور عبوری نعروں اور پروگرام کے ساتھ ساتھ طویل المدت منشور بھی مرتب ہو۔ یہ کام پیپلز پارٹی کی بنیادی دستاویزات میں درج کئے گئے۔

مخصوص سیاسی صورتحال کے فوری مسائل میں سے شہید بھٹو نے ایک تو 1965ء کی جنگ کے نتیجے میں کئے گئے پاک بھارت معاہدہ تاشقند کے خلاف احتجاج کیا لیکن اس کے ساتھ ہی 22 سرمایہ دار

www.bhutto.org

خاندانوں کے پاس جمع ہو جانے والے ملکی اور بین الاقوامی سرمائے کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ ایوب خان کے بالواسطہ الیکشن میں بی ڈی ممبروں پر مشتمل انتخابی ادارے کو بھی اپنے احتجاج کا نشانہ بنایا۔ جاگیرداروں کے مظالم میں پسے ہوئے کسانوں کے حقوق کیلئے بھی آواز بلند کی' مزدوروں کے ٹریڈ یونین حقوق کا نعرہ بھی بلند کیا۔ صحافت پر عائد پابندیوں کے خلاف بھی شدید احتجاج کیا۔ دیگر لیڈروں کی نسبت زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ طالبعلموں کے حقوق کی جدوجہد شروع کر دی۔ واضح رہے کہ 1968ء کے ماہ مئی میں دائیں بازو کی جماعتوں نے ایک اتحاد قائم کیا تھا جس کا نام پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (پی ڈی ایم) رکھا گیا تھا یہ تمام پارٹیاں مغربی پاکستان میں صرف ایک پیپلز پارٹی کو شکست دینے کیلئے بنائی گئی تھیں جبکہ مشرقی پاکستان میں یہ عوامی لیگ کو شکست دینا چاہتی تھیں اور وہی عوامی نیشنل پارٹی جو خان عبدالولی خان کی قیادت میں ترقی پسندی کا دعویٰ کیا کرتی تھی اسی پی ڈی ایم میں شامل ہو گئی تھی۔

ایوب خان کے خلاف تحریک کے آغاز کا وقت شہید بھٹو نے وہ چنا تھا جب بیرونی طور سے معاہدہء تاشقند پر دستخط کرنا ایک طعنہ بن چکا تھا اور اندرونی طور پر وہ اپنے دورِ اقتدار کا دس سالہ جشنِ ترقی منا رہا تھا اور عوام کی آواز میں آواز ملا کر شہید بھٹو اسے 22 سرمایہ دار خاندانوں کی ترقی کا جشن قرار دے رہے تھے اور جنوری 1965ء میں صدر ایوب کے بیٹے گوہر ایوب اور اختر ایوب انہی سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر کراچی میں انتخابات کے بعد جشن فتح مناتے ہوئے لالو کھیت میں خون خرابہ کر چکے تھے اور یہ خون خرابہ ایوب کیلئے بدنامی بلکہ روگ بن گیا تھا۔ طالبعلموں اور مڈل کلاس کے دیگر حلقوں نے ایوب خان کے خلاف خود رو جلسوں اور جلوسوں کا آغاز 1966ء میں کر دیا تھا اور یہ آغاز معاہدہء تاشقند کے خلاف احتجاج کے طور پر ہی ہوا تھا لیکن ایوب خان کے گورنر نے تعلیمی اداروں کے اندر بھی پولیس داخل کر کے طالبعلموں پر تشدد کرنا شروع کر دیا جبکہ ان اداروں میں پولیس کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ آزادیٔ صحافت کی تحریک میں بھی شدت آ گئی جس میں صحافیوں کی تنظیموں نے حصہ لینا شروع کر دیا۔ بھٹو شہید ان دونوں تحریکوں کے سرگرم کارکن بن کر آتے لیکن لوگ انہیں اپنا لیڈر بنا لیتے تھے۔ اس دوران بھٹو شہید کے خلاف کئی مقدمات درج کئے گئے جو اتنے گھٹیا درجے کے تھے کہ ان سے ان کی مقبولیت میں اور بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مثال کے طور پر ایک مقدمہ یہ بنا کہ انہوں نے لائسنس کے بغیر بندوق رکھی ہوئی ہے اور یہ کہ وہ دفعہ 144 کی خلاف ورزی کر کے جلسے کرتے ہیں۔ انہی حوالوں سے ان کے جلسے روکے گئے اور گول باغ لاہور (موجودہ ناصر باغ) میں ان کے جلسے میں پہلے پانی چھوڑا گیا اور پھر اس میں بجلی کا کرنٹ چھوڑ دیا گیا۔

ایوب خان نے بھٹو کی احتجاجی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے اسی قاضی فضل اللہ کو وزیر داخلہ بنایا تھا جو بھٹو کے ضلع سے ہی تعلق رکھتے تھے اور خاندانی طور پر بھی بھٹو کے پرانے دشمن تھے اکتوبر 1966ء کے بعد اخباری اداریوں اور اسکینڈلز سے بھری خبروں کے ذریعے بھٹو کو بدنام کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی

www.bhutto.org

لیکن حکومتی پریس بھی اس سلسلے میں ناکام ہو گیا اور دائیں بازوں کا پریس بھی جبکہ عوام نے اپنے رابطوں اپنے سینوں اور اپنی زبانوں کو سب سے بڑا میڈیا بنا لیا اور پھر 1968ء میں بھٹو کی تحریک مغربی پاکستان میں اس طرح سے ایک سمندر بن گئی جس طرح مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی تحریک بن چکی تھی حالانکہ عوامی لیگ کی عمر پاکستان کی عمر کے قریب تھی جبکہ پیپلز پارٹی نے ابھی ایک سال پہلے جنم لیا تھا اور یہ پہلی پارٹی تھی جو مغربی پاکستان میں قائم ہونے کے بعد مقبولیت حاصل کر چکی تھی حالانکہ مسلم لیگ بھی بنگال میں قائم ہوئی تھی انڈین نیشنل کانگریس دہلی کی پیداوار تھی اور دیگر جماعتوں میں سے بھی کوئی ایسی نہیں تھی جو مغربی پاکستان کے پسماندہ خطے میں جنم لے کر مقبول ہوئی ہو۔

مئی 1968ء میں کوئٹہ میں مقامی اور غیر مقامی طالب علموں کے گروپوں میں خون ریز تصادم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈھاکہ یونیورسٹی میں طالب علموں نے اتنا ایجی ٹیشن شروع کیا کہ اکتوبر 1968ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی بند کر دی گئی۔ کراچی میں بھی طالب علموں کی تحریک میں شدت پیدا ہوئی، اس تحریک میں میرا بھی ایک اہم کردار تھا جس پر دوسرے کئی طالب علموں کے ہمراہ مجھے بھی کراچی بدر کر دیا گیا وہ اہم واقعہ جس نے بھٹو شہید کو طالب علم تحریک کا لیڈر بنایا وہ پولی ٹیکنیک کالج پنڈی میں ہوا جہاں نومبر 1968ء میں طالب علموں کے احتجاجی جلوس پر پولیس نے گولی چلائی اور ایک طالب علم ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے۔ بھٹو شہید نے ہلاک ہونے والے اس لڑکے کو اپنا بیٹا کہہ کر طالب علموں کے احتجاج کا نعرہ خود بلند کر دیا اور پوری نوجوان نسل ان کے ساتھ جمہوریت کے اس ترقی پسند قافلے میں شامل ہو گئی جس کا نام پاکستان پیپلز پارٹی رکھا گیا تھا۔ دوسری طرف کوٹ لکھپت میں مسیحی برادری سے تعلق رکھنے والا ایک مزدور پولیس کی گولی سے شہید ہوا تو بھٹو شہید نے اسے بھی اپنا بیٹا کہا اور مزدوروں کے جلوسوں کی قیادت شروع کر دی طالب علموں کی اس تحریک نے ایوب خان کے دس سالہ جشنِ ترقی کی تقریبات کو جشنِ زوالِ ایوب کی تحریک میں بدل دیا۔ اس تحریک نے پی ڈی ایم میں شامل دائیں بازوں کی پارٹیوں کو عوامی مقبولیت کے منظر میں غیر اہم کردار بنا کر رکھ دیا۔ یہی تحریک آگے بھٹو کی انتخابی مہم کا رنگ اختیار کر گئی۔

7 نومبر 1968ء کو طالب علموں کا جو ایجی ٹیشن چلا وہ 13 نومبر کو اس وقت مکمل سیاسی شکل اختیار کر گیا جب ایوب حکومت نے تیرہ بڑے بڑے سیاستدانوں کو گرفتار کر کے جلسے جلوسوں پر مکمل پابندی عائد کر دی وکلاء کے جلوس نکلنا شروع ہو گئے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشنوں نے اپنے پلیٹ فارم پر سیاستدانوں سے تقریریں شروع کروا دیں۔ اگرچہ پی ڈی ایم نے 25 نومبر 1968ء کے لئے ملک بھر میں احتجاج کی کال دے کر پہل حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن 28 نومبر کو پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے کارکنوں نے مل کر جو جلوس نکالا اس میں زیادہ مقبولیت ولی خان کے بجائے شہید بھٹو کو حاصل ہوئی جو اس وقت جیل میں تھے اس سے پہلے 20 نومبر کو علماء نے اپنے جلوس نکال کر کوشش کی تھی کہ

www.bhutto.org

طالب علموں کی قیادت مذہبی نعروں کی بنیاد پر ان کے ہاتھوں میں آجائے لیکن بھٹو کے ترقی پسند نعروں نے علماء کی مقبولیت قائم نہیں رہنے دی۔ دوسری طرف نچلے طبقے کے سرکاری ملازموں اور مزدور یونینوں نے جلوس نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ ان طبقوں کے لوگوں نے بھی مذہب کے نام پر سیاست کرنے والوں کو برسوں تک آزمار کھاتھا للذا عوامی مقبولیت صرف بھٹو شہید کا ہی مقدر بنی۔

کلرکوں سے لے ڈاکٹروں 'انجینئروں 'اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ اور صنعتی مزدوروں تک تمام طبقے جن میں کچھ جسمانی محنت اور کچھ ذہنی مزدوری کرنے والے تھے اس تحریک کا حصہ بن گئے اور ایوب خان کے خلاف چلنے والی تحریک مکمل طور پر محنت کش طبقوں کی تحریک میں ڈھلتی چلی گئی اور پھر مارچ 1969ء کا مہینہ ایک نعرے کا امین بنا اس میں ایوب خان کی شخصیت کو تبدیل کرنے کے بجائے پورے نظام کو تبدیل کرنے والے محنت کشوں کے جلوس کے جلوس سامنے آنے لگے۔ اب پی ڈی ایم کی دائیں بازو کی جماعتوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں کھیل ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے کیونکہ مطالبہ کرنے والوں کی تقریریں اور نعرے وہی تھے جو پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کا حصہ تھے اس صورتحال کے پیش نظر پی ڈی ایم نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا نام ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی رکھا گیا۔ اس کمیٹی نے مطالبات کا ایک چارٹر تیار کیا جس میں وفاقی پارلیمانی نظام براہ راست' الیکشن بالغ رائے دہی اور ہنگامی حالات کو ختم کرنے کے مطالبات کئے گئے۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو' شیخ مجیب الرحمٰن اور خان عبدالولی خان اور دیگر لیڈروں کی رہائی کے مطالبات بھی کیے گئے۔ شہری اور صحافتی آزادیوں کے نعرے بھی لگائے گئے یونیورسٹی آرڈیننس کا خاتمہ اور بحالی جمہوریت کا مطالبہ بھی کیا گیا لیکن یہ سب مطالبے سوشلزم کے اس لفظ کے آگے نہیں ٹھہرتے تھے جسے شہید بھٹو نے ایک ایک گھر اور ایک ایک زبان تک پہنچا دیا تھا اور گلی گلی میں طالب علم مزدور کسان اتحاد کا نعرہ گونج اٹھا تھا اگرچہ کسان ان جلوسوں میں شامل نہیں تھے لیکن بھٹو شہید کے لئے جو ووٹ تیار ہو رہے تھے ان میں سب سے زیادہ تعداد کسانوں کی تھی۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں اس وقت موجودہ نظام کے خلاف تحریک کئی برس پہلے سے چل رہی تھی لیکن 19 نومبر 1968ء کو جب ڈھاکہ کے طالب علموں نے پورے شہر میں طوفان مچا دیا تو یہ پتہ چلا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی تحریکیں آپس میں مل گئی ہیں اور جنوری فروری 1969ء تک مشرقی پاکستان کی تحریک باقاعدہ ایک ایسی تحریک بن گئی تھی جسے علیحدگی پسند تحریک کا نام دیا جانے لگا تھا جبکہ حقیقت میں وہ قومی خود مختاری کی تحریک تھی۔

مغربی پاکستان میں دائیں بازو کی جماعتوں کی یہ کوشش تھی کہ وہ نعرے تو جمہوریت اور سیاسی مسائل کے لگائیں لیکن طالب علموں کی تحریکوں سے شروع ہونے والے جلوسوں کو مذہبی فرقہ واریت میں ڈھال کر بے جان کر دیں جبکہ شہید ذوالفقار علی بھٹو کی کوشش یہ تھی کہ طالب علموں 'صنعتی مزدوروں اور سرکاری اداروں کے ملازمین کی ٹریڈ یونین ازم پر مبنی تحریکوں کو جمہوریت کی سیاسی تحریک میں تبدیل

کر دیں۔

بھٹو شہید کی اس پالیسی سے قدامت پسند بیورو کریسی سخت گیری پر اتر آئی تھی جبکہ بھٹو نے احتجاجی صدارت سے چند جرنیلوں اور سول افسروں کو بھی عوامی تحریک کا ہمنوا دیکھ لیا تھا جو یہ سوچتے تھے کہ عوامی ایجی ٹیشن کے نتیجے میں نئے مارشل لاء کے ذریعے وہ حکومت اپنے قبضے میں لے کر آئندہ دس بیس سال تک چلاتے رہیں گے۔ مارشل لاء لگانے کا یہ منصوبہ اگرچہ دو سال تک کامیاب رہا لیکن مارشل لاء کی حکومت بھی بھٹو کی عطا کردہ طبقاتی جدوجہد کے رنگ میں رنگی اور مشرقی پاکستان کی قومی اور طبقاتی رنگ سے رچی ہوئی تحریک کے ہاتھوں مجبور ہو کر 1970ء میں انتخابات کرانے پر راضی ہو گئی حالانکہ قبل ازیں بیورو کریسی نے تنظیمی اداروں، بند اور جلسے جلوسوں پر تشدد کر کے عوامی تحریکوں کو ختم کرنے کی تمام تر کوشش کر ڈالی تھی اور ڈیفنس آف پاکستان رولز جیسے قوانین بھی پورے زور سے استعمال ہوئے تھے۔ ترقی پسند صحافیوں کی تنظیم پاکستان یونین آف جرنلسٹس نے بھی 25 نومبر 1968ء سے مغربی اور مشرقی پاکستان پر مشتمل پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی صورت میں موجود تنظیم سے اپیل کر کے ملک کے دونوں حصوں کے صحافیوں کی ایک بڑی تعداد کو اس عوامی تحریک میں شامل کر دیا تھا جو ایوبی حکومت کی موت کا سامان بن رہی تھی۔ ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کی وہ تمام اپیلیں ختم ہوتی جا رہی تھیں جو اس نے اپنے ورکروں سے کی تھیں کہ وہ ملکی نظام کے خلاف چلنے والی تحریکوں کا مقابلہ کریں اگرچہ ایوب خان کے مرکزی سیکرٹری وزارت اطلاعات عبدالغفور خان ہوتی نومبر 1968ء میں یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ حکمران مسلم لیگ کے ارکان کی تعداد آٹھ لاکھ ہے جو حزب مخالف کو شکست دے سکتی ہے لیکن حکمران مسلم لیگ کے 13 نومبر 1968ء سے لیکر 30 نومبر 1968ء تک کیے ہوئے تمام جلسے ناکارہ ثابت ہوئے اور پھر جنوری 1969ء میں ایوب خان نے قومی اسمبلیوں کے اجلاس منعقد کروائے جو بگڑی ہوئی سیاسی صورتحال پر بحث کرتے رہے لیکن ان کی بحثوں سے نتیجہ نہ نکلا اور اسمبلی کے مسلم لیگیوں نے بھی پارٹی چھوڑ چھوڑ کر حزب اختلاف میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ کالجوں کے اساتذہ اور بعض افسران نے بھی سخت ترین تحریک شروع کر دی۔ ان تمام عوامی تحریکوں میں سے شاید کوئی ایک بھی ایسی نہ تھی جسے شہید بھٹو نے آگے نہ بڑھایا ہو اور جس میں شامل افراد کی اکثریت نے پیپلز پارٹی کا ساتھ نہ دیا ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایوبی اسمبلیوں کے ممبران اسمبلیوں میں کھڑے ہو کر بیورو کریسی پر یہ الزام لگانے لگے تھے کہ حزب مخالف کی تحریکیں افسر شاہی کی غلطیوں کی وجہ سے زور پکڑ گئی ہیں لیکن یہ بات آدھی درست تھی کیونکہ بیورو کریسی کی جن بد عنوانیوں کے خلاف عوامی ایجی ٹیشن میں نعرے لگ رہے تھے وہ بیورو کریسی تک محدود نہیں تھیں بلکہ ارکان اسمبلی بھی ان کے حصہ دار تھے دوسری طرف ڈاکٹروں، انجینئروں اور دیگر پیشہ وروں نے بھی بیورو کریسی اور حکمران پارٹی کے خلاف شدید ایجی ٹیشن شروع کر دیا تھا اور وہ پیپلز پارٹی کے جلسوں میں آنے لگے تھے کیونکہ اس کا منشور ہی ایسا تھا جو ملک کے

www.bhutto.org

تمام تر محکوم اور مظلوم طبقات اور افراد کیلئے ایک اجتماعی راستہ پیدا کر رہا تھا اور بھٹو شہید واحد لیڈر تھے جو مؤثر طریقے اختیار کر کے محکوم طبقات کے تمام عناصر کو متحرک کر رہے تھے

صدر ایوب خان کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ تمام تر سختیوں کو آزمانے کے بعد یکم نومبر 1969ء کو اس نے حزبِ اختلاف کی تمام پارٹیوں کو دعوت دیدی تھی کہ وہ ان کے ساتھ گول میز کانفرنس میں بیٹھ کر مذاکرات کریں۔

سیاسی حکمت عملی کی آزمائش کا یہ اہم ترین لمحہ تھا جس پر شہید بھٹو نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک غیر منظم تحریک کو سودے بازی سے نکال کر اگلے مرحلے میں داخل کر سکتے ہیں۔ اس مرحلے پر بھٹو اگر ایوب خان کے ساتھ مذاکرات کرنے چلے جاتے تو عوامی تحریک محض سودے بازی کا شکار ہو کر رہ جاتی اور اگر پورے نظام کو بدلنے کی جنگ کا راستہ اختیار کرتے تو یہ انتہائی تباہ کن مہم پسندی ہوتی اسلئے انہوں نے فیصلہ یہ کیا کہ وہ ایوب خان کی گول میز کانفرنس میں بھی نہیں جائیں گے اور مہم پسندی بھی نہیں کریں گے بلکہ نئے انتخابات کے انعقاد پر زور دیں گے تاہم اسی لمحے بھٹو کو یہ بھی خیال تھا کہ جب دائیں بازو کی تمام پارٹیوں کی بنائی ہوئی ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی (ڈیک) کے ساتھ مل کر شیخ مجیب الرحمٰن اور ولی خان صدر ایوب کے ساتھ مذاکرات کرنے جا رہے ہیں تو صدر ایوب کا حوصلہ بڑھ سکتا ہے اور وہ سیاسی سودے بازی کر کے حزبِ مخالف کے کچھ لیڈروں کو اپنے ساتھ بھی ملا سکتے ہیں۔ اسلئے بھٹو نے فیصلہ کیا کہ متحدہ محاذ کا طریقہ اختیار کریں اور ترقی پسند رنگ رکھنے والی کسی بڑی پارٹی کو ایوبی مذاکرات میں جانے سے روک لیں۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما مولانا بھاشانی کو اتحاد کی دعوت دیدی اور ان کے ساتھ مذاکرات بھی شروع کر دیئے۔ بھٹو شہید کے اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا بھاشانی نے بھی گول میز کانفرنس میں جانے سے انکار کر دیا اور وہ لمحہ بھی آ گیا جب ایوب خان نے 21 فروری 1969ء کو یہ اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ انتخابات میں صدارتی امیدوار نہیں ہوں گے۔ بھٹو کی تحریک آگے بڑھتی رہی اور ایک دن وہ بھی آیا جب ڈیک اور ایوب خان کی گول میز کانفرنس بے معنی ثابت ہو گئی اور ایوب خان نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے حکومت یحییٰ خان کے سپرد کر دی۔

بھٹو اگر گول میز کانفرنس میں بیٹھ کر کوئی مصالحت کرتے تو دائیں بازو کی خواہش پوری ہو جاتی۔ ان پارٹیوں کا خیال تھا کہ یا تو ایوب کی موجودگی ہی میں کوئی ایسی حکومت بنائی جائے جس میں ان کا بھی حصہ ہو اور بھٹو بھی اس میں شامل ہوں یا پھر ایوب کی چھٹی کروا دی جائے اور حکومت ایسی بنائی جائے جس میں بھٹو تو اکیلے ہوں جبکہ ان کے سامنے مغربی پاکستان کی درجن بھر دوسری پارٹیاں بیٹھی ہوں جن میں شامل افراد کی تعداد تو بھٹو کی نسبت ایک فیصد بھی نہیں تھی لیکن حکومتی عہدے وہ بھٹو کی نسبت بارہ گنا زیادہ حاصل کر لیتے جبکہ بھٹو کو پتہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں صرف شیخ مجیب الرحمٰن کی فتح ہوئی اور مغربی پاکستان کی اسٹیج پر صرف پیپلز پارٹی چھائی ہوئی ہے۔ پاکستان کی سیاست میں کسی دوسرے کیلئے موقع بھی نہیں رہ گیا تھا کہ وہ

www.bhutto.org

جوڑ توڑ کے ذریعے حکومت میں شامل ہو جائے انہیں ان کے انجام تک پہنچانے کا طریقہ صرف ایک تھا کہ سب گھسے پٹے سیاستدانوں کو عوام کی ترقی پسند تحریک کے ذریعہ الیکشن میں کھڑا کر دیا جائے تاکہ یہ سب عملاً مسترد ہو جائیں۔ بھٹو کا یہ طریقہ کامیاب رہا اور بالآخر 1970ء میں مغربی پاکستان کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی زبردست اکثریت لے کر جیت گئی۔

سامراج، جاگیرداری اور سرمایہ داری کو ختم کرنے کیلئے تمام طبقوں پر مشتمل ایک مڈل کلاس پارٹی بنانا اور پاپولسٹ تحریک چلانا ایک ایسا طریق کار تھا جس سے ہمارے ملک کے دوسرے ترقی پسند لیڈر واقف ہی نہ تھے۔ اس لئے وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کے بجائے اپنی الگ الگ فرقہ بازی کرتے چلے گئے اور انہوں نے خود کو تنہائی میں دھکیلنے کی پالیسی اختیار کرلی جبکہ شہید بھٹو نے جو راہِ عمل اختیار کی وہ تنہائی پسندی کی نفی کرکے چلنے کی راہِ عمل تھی۔ اس راہِ عمل میں شہید نے ایک حربہ تو یہ استعمال کیا کہ حکمران طبقوں کے اندرونی تضادات کو استعمال کیا جائے۔ دوسرے بائیں بازو کا مختلف نظریہ تھا کہ کمپریڈار بورژوازی کے مقابلہ میں نیشنل بورژوازی کے ساتھ متحدہ محاذ بنا کر تحریک چلائی جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوامی جمہوریہ چین اور دیگر سوشلسٹ ممالک میں قومی سرمایہ دار طبقے کے سوشلسٹوں کے ساتھ شامل ہو جانے کے بعد سامراج نے پاکستان جیسے ملکوں میں قومی سرمایہ دار طبقے کو رہنے ہی نہیں دیا تھا اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں بنکوں کے ذریعے سامراجی رقومات داخل کرکے اسے ختم کر دیا تھا۔ اس لئے شہید بھٹو کی راہِ عمل یہ تھی کہ قوم پرست کا کردار صرف سرکاری شعبہ کی صنعت کے ذریعے ہی مؤثر بنایا جاسکتا ہے جبکہ دولت مند طبقوں کے اندرونی تضادات چند دولت مند افراد کو ساتھ ملا کر اپنے حق میں استعمال کئے جاسکتے ہیں، ان طبقوں میں سے کوئی بھی پورا طبقہ عوامی تحریک کی حمایت نہیں کر سکتا۔ بھٹو شہید نے دولت مند طبقات میں سے ایسے افراد کو اکیلے اکیلے کرکے اپنے ساتھ ملانا شروع کر دیا جو سرمایہ دارانہ نظام کی نفسانفسی میں دوسرے سرمایہ داروں کے مقابلے میں بڑے بننا چاہتے تھے۔ اس صورت حال میں ضرورت اس بات کی تھی کہ ان امیرزادوں کے سر پر قیادت سوشلسٹوں کی رکھی جائے۔ اس لئے شہید بھٹو نے جاگیرداروں کی نمائندگی کرنے والے غلام مصطفیٰ جتوئی، غلام مصطفیٰ کھر اور میر رسول بخش تالپور کے ساتھ شیخ رشید، جے اے رحیم، معراج محمد خان اور ڈاکٹر مبشر حسن جیسے لوگوں کو بھی پارٹی کے اہم عہدوں پر فائز کر دیا۔ ان حالات میں اگر یہ سوال چھیڑا جائے کہ کیا پیپلز پارٹی ایک انقلابی پارٹی تھی یا ایک انتخابی پارٹی تھی تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ پیپلز پارٹی ایک طرف تو ایک مڈل کلاس پارٹی تھی اور ہے جو انتخابی طریقے سے آگے بڑھ رہی تھی لیکن اس کے ساتھ دوسری طرف یہ پارٹی ایک ایسی زمین تھی جس کے اندر سے ابھری ہوئی انقلابی پارٹی بھی نشوونما پا سکتی تھی۔ بھٹو شہید اس نو عمر اور زرخیز زمین جیسی پارٹی کو مسلح انقلابی پارٹی سمجھنے کی غلطی کرنے پر تیار نہ تھے بلکہ الیکشن کے ذریعے حکومت میں آکر مڈل کلاس اور نچلے طبقوں کے فعال افراد کو ریاستی اور سیاسی امور کی ٹریننگ دینے کا راستہ اختیار کر رہے تھے اور سب سے

زیادہ تبدیلی ثقافتی بنیاد پر لا رہے تھے کیونکہ ثقافتی تبدیلی کے عمل کو اگر معاشی اور سیاسی تبدیلی کے عمل سے علیحدہ رکھا جائے تو پھر سوشلسٹ انقلاب اسی طرح ادھورے رہتے ہیں جس طرح روس' چین اور مشرقی یورپ کے سوشلسٹ انقلاب ادھورے رہے ہیں اور آج ان تمام ملکوں کے عوام اپنی بیوروکریٹک قیادت کے خلاف بغاوتیں کر رہے ہیں۔

سوال یہ کیا جاتا ہے کہ بھٹو نے اپنی پارٹی کے اندر الیکشن کرا کے اسے ایک جمہوری ادارہ کیوں نہیں بنایا؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ تین چار سال کے مختصر عرصے میں ایک طوفانی ہجوم کی طرح ابھرنے والی پارٹی کو فوری طور پر ایک جمہوری ادارے کی تنظیم میں بدل دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اس میں کیڈر فارمیشن کیلئے مزید برسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور عین اس دور میں جبکہ پاکستان کے دو ٹکڑے بھی ہو گئے ہوں۔ اس کا لیفٹ پچھلے پچیس تیس سال سے میکانکی طریقے اختیار کر کے تنگ نظر ہو چکا ہو اور اس کی سیاست پر روایت پرست جاگیرداروں کا قبضہ ہو۔ جہاں قائداعظمؒ کے جمہوریت سے متعلق نظریات کو مسترد کیا جا چکا ہو۔ جہاں بیوروکریسی بار بار مارشل لاء لگائے اور پاکستان کو ایسٹ انڈیا کمپنی بنا کر چلائے' جہاں مُلّا ازم نے تصوف کی ملامتی تحریک سے وابستہ کروڑوں افراد کو بیوروکریسی کی مدد سے دبا کر رکھنے میں ایک مُہرے کا کردار ادا کیا ہو۔ جہاں پیر پرستی نے ملامتی تحریک کو تباہ کرایا ہو اور جو ملک مجموعی طور پر جدید نو آبادیت کی امریکی سامراجیت کے پنجگل میں آ گیا ہو' وہاں شہید بھٹو جیسا لیڈر ایک پاپولسٹ ملٹی کلاس پارٹی بنا کر ایک انقلابی تنظیم کی زمین ہی ہموار کر سکتا ہے لہٰذا شہید بھٹو پر یہ تنقید نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے انقلاب کیوں برپا نہیں کیا؟ یہ زمانہ انقلابی پارٹی کیلئے زمین تیار کرنے کا نہیں تھا۔ 1967ء سے 1977ء تک کے حالات کو اسی حوالے سے دیکھنا چاہئے کہ بھٹو شہید جس نظام کو بدلنا چاہتے تھے اس کیلئے وہ ایک راستہ ہموار کر رہے تھے اور عوام کو تربیت اور تعلیم دے رہے تھے تاکہ اس کے ذریعے انقلابی کیڈر پیدا کیا جا سکے۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے کچھ ایسے طریقے بھی استعمال کئے جن کو بورژوا کہہ دیا جاتا ہے لیکن دراصل بھٹو نے بورژوا سماج کا یورپ اور امریکہ کے اندر رہ کر جائزہ لے رکھا تھا اس لئے انہیں پتہ تھا کہ سامراج کا نیا دور ایڈورٹائزنگ کمپنیوں کی پھیلائی ہوئی کمرشل اور پریگ میٹک ثقافت کے ہتھکنڈوں سے چل رہا ہے۔ اس لئے انہوں نے ریڈیو' ٹیلی ویژن اور پریس میڈیا کو استعمال کرنے کے بورژوا طریقوں میں پاکستانی عوامی روحانیت اور تصوف کی ملامتی فکر کو جدید انداز میں شامل کر دیا۔ "ہے جمالو" کے گیت بھی گائے' جلسوں میں دھمال بھی ڈالی' رقص کے انداز میں تالی بھی بجائی اور گہرے رنگوں کے شلوار قمیص کو بھی مردوں کے جسموں کی زینت بنایا جبکہ اس سے پہلے مرد صرف سفید یا کریم رنگ کے شلوار قمیص پہنتے تھے۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

بھٹو کے تصوراتی اُفق

یہ بات کسی بحث میں پڑے بغیر مان لینی چاہئے کہ 1969ء سے 1971ء تک مشرقی پاکستان اپنی جس عوامی تحریک کو لے کر سیاسی تناظر میں ابھرا تھا اس کا فہم وادراک مغربی پاکستان میں صرف بھٹو کو ہوا تھا اور وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ اس مشرقی پاکستان سے آئندہ مغربی پاکستان کے مقدر پر کیا اثرات پیدا ہوں گے اور مغربی پاکستان کی نا اہل لیڈر شپ' بد عنوان انتظامیہ اور محنت کش طبقوں کی نو عمر تحریک کوئی بھی ایسی ذمہ داری پوری کرنے کے قابل نہیں ہوگی جس کے نتیجے میں بنگالی عوام اور مغربی پاکستانی عوام کی جدوجہد کے رشتے کو جوڑا جاسکے۔ مولانا بھاشانی کا یہ خواب بھی ادھورا ثابت ہو گیا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے محنت کش اکٹھے چل کر استحصالی طبقوں کے خلاف جدوجہد کریں گے۔ عوامی جمہوریہ چین جو بھارت کی مخالفت کر کے پاکستان میں مقبولیت حاصل کر گیا تھا' وہ ایوب خان کی حمایت بھی کر تا رہا اور پھر جب مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی گئی تو یحییٰ خان کی بھی حمایت کی۔ حقیقت یہ تھی قیام پاکستان سے قبل قائداعظمؒ کو ڈھاکہ اور لیاقت علی خان کو چٹاگانگ سے منتخب کرنے والے بنگال نے 1968ء سے 1971ء تک کے عرصے میں قومی تحریک کی جو صورت اختیار کر لی تھی اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی جاگیردارانہ عادات رکھنے والی پاکستانی بیوروکریسی پہچان ہی نہیں سکتی تھی۔

اس وقت بھٹو پر مغربی پاکستان کے استحصالی طبقوں کی طرف سے زبردست دباؤ ڈالا جارہا تھا کہ وہ بیوروکریسی کی پالیسیوں کے سامنے جھک جائیں لیکن بھٹو یہ سوچ رہے تھے کہ چونکہ فوجی کارروائی پر اتری

www.bhutto.org

ہوئی بیوروکریسی کے خلاف مزید ایجی ٹیشن کرنے کی طاقت پیپلز پارٹی کی تحریک میں بھی نہیں ہے اس لئے فوری طور پر بیوروکریسی کے خلاف کوئی ایجی ٹیشن کرنا ایک انتہاپسندی ہوگی لہٰذا مغربی پاکستان کو پہلے تو بھارت سے بچایا جائے اس کے بعد اس بیوروکریسی سے نجات حاصل کرنے کیلئے عوام کو نئے سرے سے تربیت دی جائے اور شیخ مجیب الرحمٰن اگر فیڈریشن کا اصول مان کر اقتدار میں ہمیں حصہ دینے پر تیار ہو جائیں تو یہ حصہ بھی لے لیا جائے لیکن پاکستان بنانے میں سب سے زیادہ اور اولیں کردار ادا کرنے والا بنگال اب اس پاکستان میں فٹ نہیں ہو رہا تھا۔ جزو "کُل" کو از سرِ نو متعین کرنے پر اتر آئے تو "کُل" میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ پاکستانی بیوروکریسی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مشرقی پاکستان جو شیخ مجیب الرحمٰن کے ہاتھوں سے نکل کر کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ لیننسٹ) کے ہاتھوں میں جا رہا ہے اسے فوجی کارروائی کے ذریعے کچل دیا جائے۔ اس صورتحال میں شہید بھٹو نے "گریٹ ٹریجڈی" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ وہ پوری صورتحال کے ساتھ شہید کی حکمتِ عملی کو واضح کر دیتی ہے کہ وہ یہ حقیقت جان گئے تھے کہ برِ صغیر پاک و ہند میں آج تک جو قوتیں استحصالی مرکزوں کے جبر میں جکڑی ہوئی ہیں آخر کار وہ ان مرکزوں کو جھٹک کر چیونٹیوں میں بکھیر سکتی ہیں۔ پھانسی کی کوٹھڑی سے بے نظیر بھٹو کے نام لکھے ہوئے خط پر مشتمل کتاب "مائی ڈیئریسٹ ڈاٹر" میں بھٹو شہید نے یہی بات لکھی ہے کہ بھارت اپنی قومیتوں کے اتحاد کو قائم نہیں رکھ سکے گا اور یہی وہ بات ہے جسے تفصیل کے ساتھ انہوں نے 1960ء کی دہائی کے آخری اور 1970ء کی دہائی کے ابتدائی دنوں میں بھی لکھا تھا۔ "مائی ڈیئریسٹ ڈاٹر" میں انہوں نے 1970ء سے 1972ء تک کے حالات کا آخری تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شیخ مجیب الرحمٰن چھ نکات کی بنیاد پر کنفیڈریشن قائم کرنے کے راستے پر چل رہے تھے اور مشرقی پاکستان میں ایک جنگی مار دھاڑ کر کے الیکشن میں مکمل فتح حاصل کر لی تھی جبکہ سندھ اور پنجاب میں ہماری پارٹی نے اکثریت حاصل کی تھی اور ہم چاہتے تھے کہ پاکستان کو فیڈرل صورت میں قائم رکھا جائے اور کنفیڈریشن کی شکل دینی ہو تو ہمیں اقتدار میں شامل کیا جائے۔ شیخ مجیب الرحمٰن اگر فیڈرل سسٹم اختیار کرتے تو ہم انہیں حکمران سمجھتے ہوئے ان کا خیر مقدم کرتے لیکن اگر وہ کنفیڈریشن بناتے تو پھر دوسرے بازو سے اکثریت حاصل کرنے والی ہماری پارٹی کو اقتدار میں شامل کرنا ضروری تھا لیکن شیخ مجیب الرحمٰن نے "حاصل کرو یا چھوڑ دو" کا رویہ اختیار کر لیا اور ایک مستقل ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا۔ اس وقت جنرل یحییٰ خان نے سوچا کہ اس ڈیڈ لاک میں وہ فوجی کارروائی کر کے عمر بھر کیلئے حکمران بن جائے گا لیکن اس کا فوجی اقدام کسی معقول سیاسی غلاف کے بغیر ہوا اور بھارت کو مشرقی پاکستان میں مداخلت کا بہانہ مل گیا اور آخر 16 دسمبر 1971ء کو ڈھاکہ کا سقوط ہو گیا اور نوے ہزار پاکستانی فوجی بھارت کے قبضے میں چلے گئے۔ اس وقت میں اقوام متحدہ میں تھا اور یحییٰ خان نے پورا سروے کرنے کے بعد یہ سمجھ لیا کہ اب وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتا اس لئے خصوصی طیارہ بھیج کر مجھے واپس بلا لیا گیا۔ اس نے خون آمیز آنکھوں کے ساتھ برانڈی کی بوتل اپنے پہلو میں لے کر

www.bhutto.org

20 دسمبر 1971ء کی صبح ساڑھے دس بجے مجھے کہا "میں تو سب کچھ ہار چکا اور بُری طرح ناکام ہو چکا ہوں۔ اب صرف ایک تم ہو جو اس ٹوٹے ہوئے پاکستان کو بچانے کے قابل ہو۔" اور ان بدشگون حالات میں اسی روز دن کے ساڑھے بارہ بجے میں نے ملک کے صدر کا حلف اٹھالیا۔"

یہ پہلا موقع تھا جب مشرقی پاکستان کے عوام نے پاکستانی فوج اور بیوروکریسی کی مکمل نفی کر دی یہ اور بات ہے کہ انہوں نے بھارتی فوج کی بالادستی کی صورت میں ایک اور بدنصیبی کو قبول کر لیا تاہم پاکستانی فوج اور بیوروکریسی ملک کے دونوں حصوں میں بے آبرو ہو گئی جبکہ 1948ء میں قائداعظمؒ کو خود موت کے جبڑوں میں دھکیلنے والی یہ بیوروکریسی آج تک کبھی بھی سیاسی قیادت کو اقتدار دینے پر تیار نہ ہوئی تھی اور اس کا یہ رویہ دائیں بازو کے سیاستدانوں نے ہمیشہ قبول کیا تھا۔ بائیں بازو میں بھٹو شہید واحد لیڈر تھے جنھوں نے بیوروکریسی کو شکست دینے والی تحریک چلائی تھی جو اگرچہ ابتدائی دور میں تھی لیکن یہ پہلے راؤنڈ کی کامیاب ترین تحریک تھی ورنہ 1954ء سے لے کر آج تک بار بار اسمبلیاں توڑنے والی اس سول اور فوجی بیوروکریسی کو کوئی بھی شکست نہیں دے سکا تھا اور پہلی تین اسمبلیوں میں پاکستان کے جاگیردار زیادہ نشستوں پر بیٹھ کر افسر شاہی کے قانونی مسودوں اور پالیسی دستاویزات کے سامنے ہاتھ کھڑے کرتے رہے تھے۔ شہری آزادیوں کی کامیاب تحریک کا سہرا صرف بھٹو کے ماتھے پر ہی سجتا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ یہاں مزدوروں اور کسانوں کو وسیع پیمانے پر صرف اسی شہید نے متحرک کیا تھا۔

1970ء کے الیکشن کے بعد مغربی پاکستان کی بیوروکریسی اس وقت تک بھٹو کو اقتدار دینے پر تیار نہ ہوئی جب تک کہ مشرقی پاکستان کے عوام نے اس کی کمر نہ توڑ دی اور ان کے جرنیل نیازی نے ڈھاکہ میں گھٹنے ٹیک کر بھارتی جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط نہ کر دیئے۔ مغربی پاکستان کے جرنیل ایک سال تک بھٹو کو اقتدار دینے پر تیار نہ تھے بلکہ انہیں اپنا سپاہی بنا کر بنگال کے خلاف لڑنے پر مجبور کرتے رہے تھے جبکہ قائد عوام 'جو بالآخر شہید جمہوریت بن گئے' بھارت کے خلاف لڑنے پر تو تیار تھے لیکن بنگالی عوام کے خلاف کوئی جابرانہ ایکشن لینے پر آمادہ نہیں تھے۔ فروری 1971ء میں جب شہید بھٹو نے مینار پاکستان لاہور کے زیر سایہ اپنے ارکان اسمبلی سے کہا تھا کہ اگر وہ شیخ مجیب الرحمٰن کی سربراہی میں ہونے والے اسمبلی کے اجلاس میں گئے تو میں ان کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ ان کے اس بیان کا مطلب ان کے مخالفین آج تک یہ نکالتے ہیں کہ بھٹو نے مجیب کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بھٹو صرف اس حکومت کے اجلاس میں شرکت سے انکار کر رہے تھے جو کنفیڈریشن کے نتیجے میں بن رہی تھی اگر شیخ مجیب الرحمٰن فیڈریشن کے تحت حکومت بناتے تو بھٹو کبھی بھی اس اجلاس میں جانے سے انکار نہ کرتے اور حزب اختلاف میں بیٹھنے پر بخوشی تیار ہوتے لیکن شیخ مجیب الرحمٰن نے یحییٰ خان کو یہ لالچ دیا تھا کہ بھٹو سے اختلاف کے باوجود وہ اسمبلی کا اجلاس بلالیں تو وہ اقتدار میں حصہ دار ہوں گے۔ بھٹو نے یہ جان لیا تھا کہ یحییٰ مجیب گٹھ جوڑ ہو رہا ہے جو بالآخر کنفیڈریشن کی صورت اختیار کرے گا۔

www.bhutto.org

اس لئے انہوں نے کراچی کے جلسے میں یہ کہا تھا کہ یحییٰ خان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ آئین کا معاملہ طے کرنا ہے تو میرے ساتھ کرو لیکن شہید کے اس بیان کا سراسر غلط مطلب نکالا گیا اور جماعت اسلامی نے یہ الزام لگانا شروع کر دیا کہ "ادھر تم ادھر ہم" کا بیان دے کر بھٹو شیخ مجیب کی علیحدہ اور اپنی علیحدہ حکومت بنانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان میں مارکسسٹ لیننسٹ کمیونسٹ پارٹی کے رہنما ڈاکٹر محمد طٰہٰ شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف لڑ رہے تھے اور چھ نکات کے بجائے انہیں گیارہ نکات پر مجبور کر رہے تھے جو سوشلزم رائج کرنے کا چارٹر تھا۔ ان کے ساتھ مل کر چلنا بھٹو کیلئے ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر طٰہٰ کی پارٹی نے مشرقی پاکستان کے چھ اضلاع کے دیہات پر تو قبضہ کر رکھا تھا لیکن اسمبلی میں اس پارٹی کا کوئی بھی رکن نہیں تھا۔ علاوہ ازیں مغربی پاکستان کی عوامی تحریک ابھی اس قابل نہیں تھی کہ مکمل سوشلزم رائج کر سکے اور مشرقی پاکستان کے کمیونسٹوں کو چین کی حمایت بھی حاصل نہیں رہی تھی کیونکہ چین نے بھی فروری 1971ء سے ستمبر 1971ء تک خالص اور وحشیانہ ملٹری ایکشن کی حمایت کرنے کی غلطی کر دی تھی۔ اس صورتحال میں بھٹو کیلئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مغربی پاکستان کی عوامی تحریک کو اس تیز رفتاری سے چلا لیں جس سے کہ مشرقی پاکستان میں بائیں بازو کی تحریک چل رہی تھی اگرچہ ستمبر 1971ء میں شہید بھٹو نے قائداعظمؒ کے مقبرہ پر تقریر کرتے ہوئے یہ بیان دیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں قتل تو ترقی پسندوں کا ہو رہا ہے اور اس حقیقت کا پتہ جنرل نیازی کے اس انٹرویو سے بھی چلتا ہے جو انہوں نے بھارت کی قید سے رہا ہونے کے بعد جریدہ الفتح کو دیا تھا اور جس میں کہا تھا کہ "اگر ہم ملٹری ایکشن نہ کرتے تو کمیونسٹ مشرقی پاکستان پر قبضہ کر لیتے اور شیخ مجیب الرحمٰن کا بھی خاتمہ کر دیتے" جنرل نیازی کے اس بیان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بھارتی جنرل اروڑا جو شیخ مجیب الرحمٰن کی حمایت میں لڑنے آیا تھا وہ بھی دراصل ان کمیونسٹوں کے خلاف لڑ رہا تھا جو ایک طرف شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ برسرپیکار تھے اور دوسری طرف جنرل یحییٰ اور اندرا گاندھی کے خلاف بھی لڑ رہے تھے کیونکہ ان کے کسی رکن نے مکتی باہنی کا ساتھ نہیں دیا اور نہ ہی بھارت میں پناہ لی جبکہ پاکستان کی سالمیت کی ٹھیکیداری کا دعویٰ کرنے والی جماعت اسلامی کی تنظیم الشمس اور البدر بھی مشرقی پاکستان میں انقلابی جدوجہد کرنے والی اسی تنظیم کے اراکین کو قتل کرتی رہیں جس کی حمایت میں مزار قائداعظمؒ پر شہید بھٹو نے مذکورہ بالا بیان دیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چین نے بھی چین نواز کمیونسٹ تنظیم کی یحییٰ خان کے ساتھ مل کر مخالفت کی جبکہ روس نے جنرل مجیب الرحمٰن اور اندرا گاندھی کے ساتھ مل کر انہیں کچلا۔

مغربی پاکستان کے بڑے لیڈروں میں سے صرف بھٹو نے انتقابیوں کا قتل عام رکوانے کیلئے بیان دیا۔ روس نے فوجی کارروائی کی مخالفت کی تو ساتھ مطالبہ کر دیا کہ سیاسی حل کر کے شیخ مجیب الرحمٰن کی کنفیڈریشن والا نظریہ قبول کیا جائے۔ چین نے شیخ مجیب الرحمٰن اور اندرا گاندھی کی مخالفت تو کی لیکن ستمبر تک مشرقی پاکستانی کمیونسٹوں کی مدد نہیں کی۔ چواین لائی نے ان کمیونسٹوں کی تحریک کو جائز قوم پرست

www.bhutto.org

تحریک قرار دیا تو مزار قائداعظمؒ پر بھٹو شہید کے مذکورہ بیان کے بعد جس سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ چین نے بھی شہید بھٹو کے نظریے کو قبول کر لیا تھا لیکن مشرقی پاکستان میں سی پی ایم ایل کی قیادت نے انتہا پسندانہ پالیسی اختیار کر لی اگر وہ اس موقع پر رک جاتی اور مغربی پاکستان کی تحریک کو آگے بڑھ لینے دیتی یا پھر بھارت کے اندر اپنی حامی تحریک کو اندرا حکومت کے خلاف ایک وسیع قوت بنا کر کارروائی کراتی تو مشرقی پاکستان میں ہی نہیں پورے برصغیر میں انقلاب کی فضا تیار ہو جاتی۔ واضح رہے کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد کمیونسٹ پارٹی مارکسسٹ لیننسٹ اور نکسل باڑی کمیونسٹوں نے اپنے خود تنقیدی میں یہ بات تسلیم کی تھی کہ انہوں نے اپنی جائز جدوجہد میں دو غلطیاں کی ہیں جن میں ایک یہ تھی کہ انہوں نے مڈل کلاس سے کٹ کر اپنی جدوجہد کو صرف مزدوروں اور کسانوں تک محدود کر دیا۔ دوسری یہ کہ انہوں نے انڈیا اور مغربی پاکستان میں اپنی حامی تحریکوں کو اس سطح پر تیار ہونے کا موقع نہیں دیا جس کی انہیں ضرورت تھی اگر وہ یہ دونوں غلطیاں نہ کرتے تو انہیں مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کی مکمل حمایت حاصل ہوتی۔ علاوہ ازیں کشمیر میں بھی بھٹو کا نعرہ لگانے والے حریت پسندان کے ساتھ مل جاتے اور مشرقی پنجاب کے علاوہ تلنگانہ سے دکن اور سری لنکا تک ان کمیونسٹوں کی حمایت بھی انہیں حاصل ہوتی جو روسی چینی اسٹالن ازم کی نفی کر رہے تھے لیکن اسٹالن ازم کی بیوروکریٹک پالیسیوں نے اپنے ریاستی مفادات کو عالمی کمیونسٹ تحریک کے مفاد پر ترجیح دی جس سے عالمی انقلابی تحریکیں کچلی گئیں۔ اسٹالن ازم کی پالیسیاں جس طرح روس اور مشرقی یورپ میں آج 90-1989ء میں ناکام ہوتی نظر آتی ہیں ان کے بارے میں شہید بھٹو نے بہت پہلے پیش گوئی کر دی تھی۔ بے نظیر بھٹو کے نام اپنے ایک خط میں وہ اس پر بحث کرتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ بھٹو 1977ء کے آگے پیچھے جو راہِ عمل اختیار کر رہے تھے اس کی بنیاد ایسے تجزیے پر قائم تھی جسے مشرقی پاکستان کے عوام کی قومی تحریک کے حوالے سے چواین لائی نے تو تسلیم کر لیا تھا لیکن روس کی بیوروکریسی انڈین نیشنل کانگریس کو ترجیح دے رہی تھی اور امریکہ یحییٰ خان اور دائیں بازو کی جماعتوں کو شہہ دے رہا ہے۔ مئی 1971ء میں امریکی سینٹ کی امور خارجہ کی کمیٹی نے اپنی حکومت سے یہ مطالبہ بھی کر دیا تھا کہ پاکستان کی فوجی امداد اس وقت تک بند کر دی جائے جب تک مشرقی پاکستان میں چلنے والا تنازعہ ختم نہ ہو جائے اس پر چین نے پاکستان کو 88 ملین ڈالر بلا سود قرضہ دے دیا۔ پاکستانی فوج نے فروری 1971ء میں بنگالی مظاہرین کے خلاف ملٹری ایکشن شروع کیا تھا جس کے ساتھ ہی مکتی باہنی کا ہیڈ کوارٹر بھی کلکتہ میں قائم ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے مہاجرین بھارت میں منتقل ہونے لگے۔ جون 1971ء میں یحییٰ خان ایک طرف تو یہ کہہ رہا تھا کہ بنگالی مہاجرین بھارت سے واپس آ جائیں لیکن دوسری طرف شہید بھٹو کی پالیسی کی حمایت کرنے والے جنرل ٹکا خان کو مشرقی پاکستان سے واپس بلا کر ستمبر 1971ء میں جنرل نیازی کو ملٹری ایکشن جاری رکھنے کیلئے مشرقی پاکستان بھیج دیا۔ ٹکا خان کی جگہ ایک بنگالی سویلین اے ایم مالک کو گورنر مشرقی پاکستان بنا دیا اور یحییٰ خان نے ستمبر 1971ء میں ایران

www.bhutto.org

جاکر شاہ ایران سے ملاقات کی۔ یہیں پر روسی صدر پوڈ گورنی اور بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے بھی ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔ یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان میں ضمنی الیکشن کا منصوبہ بنا کر اس سے پہلے ایک عبوری سویلین کابینہ بنادی تھی لیکن یحییٰ خان کے یہ سارے منصوبے ناکام ہو گئے اور عوامی لیگ کے انتخابات کو منسوخ کرنے کی اسکیم بھی نہ چل سکی کیونکہ مغربی پاکستان کے ہیڈ کوارٹر سے حکم جاری کرنے والے مارشل لاء حکام مشرقی پاکستان کے ترقی پسندوں سے ساتھ اتحاد کرنے کا راستہ اختیار نہیں کر رہے تھے بلکہ ان ترقی پسندوں کو ہی قتل کر رہے تھے اور اس قتل عام کے باوجود بنگالی عوام کی تحریک ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور پاکستان نے باقاعدہ یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ پاکستانی فوج جن لوگوں پر فائرنگ کر رہی ہے وہ بھارتی گوریلے ہیں۔ نومبر 1971ء میں بات یہاں تک پہنچی کہ سوئٹزرلینڈ، جاپان اور بھارت میں قائم پاکستانی سفارتخانوں میں جتنے بنگالی ملازمین کام کر رہے تھے وہ نوکریاں چھوڑ کر مشرقی پاکستان روانہ ہو گئے اور چٹا گانگ میں مکتی باہنی کے گوریلوں نے آئل ٹینکر بھی سمندر میں ڈبو دیئے۔ اس وقت شہید ذوالفقار علی بھٹو نے چین جا کر چینی وزیر اعظم چو این لائی سے ملاقات کی کیونکہ انہیں مکمل طور پر علم تھا کہ مشرقی پاکستان کے قریب آکر کھڑا ہونے والا امریکی نیوی کا ساتواں بحری بیڑا پاکستان اور بھارت کی جنگ میں پاکستان کی مدد نہیں کرے گا جبکہ امریکہ نے اسی نومبر کے مہینے میں 3ء6 ملین ڈالر کے وہ اسپیئر پارٹس بھی پاکستان کو دینے سے انکار کر دیا جو ہتھیاروں کیلئے ضروری تھے۔ بھٹو شہید نے اس صورتحال میں ایک بار پھر چینی امداد کا سلسلہ اسی طرح شروع کرا دیا جس طرح انہوں نے 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں کروایا تھا اور مغربی پاکستان بھارتی حملے سے بچ گیا ورنہ مشرقی پاکستان میں فوجیں داخل کرنے والا بھارت مغربی پاکستان کو بھی قطعاً معاف نہ کرتا۔ اسی نومبر 1971ء کے مہینے میں مشرقی پاکستان کے سرحدی علاقے میں پاکستانی اور بھارتی طیاروں کی جنگ شروع ہوئی۔ بھارت میں بنگلہ دیش کی حکومت قائم کر دی گئی اور دسمبر میں باقاعدہ پاک بھارت جنگ چھڑ گئی۔ بھارت نے بنگلہ دیش کی حکومت کو تسلیم بھی کر لیا اور ایک مرتبہ پھر اقوام متحدہ کے اجلاس میں پاکستان کی نمائندگی کیلئے بھٹو کو بھیجا گیا لیکن پاک فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیدیا گیا تو بھٹو کیا کرتے؟

یہ وہ حالات تھے جن میں مارشل لاء حکام نے بھٹو کو واپس لانے کیلئے ایک خصوصی طیارہ روانہ کیا اور حکومت ان کے سپرد کر دی ورنہ دسمبر 1970ء سے لیکر 1971ء تک مارشل لاء حکام ایک دن بھی بھٹو کو حکومت دینے پر تیار نہ ہوئے۔ ایوب خان نے حکومت چھوڑی تو نئے الیکشن کرانے کے بجائے مارشل لاء ہی لگوایا اور یحییٰ خان کو چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر بنا کر رخصت ہو گئے۔ یحییٰ خان بھی یہ سوچ کر آیا کہ زندگی بھر وہ حکمران رہے گا اور دسمبر 1970ء میں منتخب ہونے والی اسمبلیوں کو اپنے ماتحت رکھ کر چلائے گا۔ بھٹو کو اگر حکومت دینی پڑی تو اس حال میں جب مارشل لاء حکام آدھا ملک توڑ چکے تھے اور باقی بچے ہوئے ملک میں عوام نے یحییٰ حکومت کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن شروع کر دیا تھا بورژوا

حکمرانوں کا مقدر یہی ہوتا ہے کہ اپنی حکومتوں کو دوام دینے کیلئے وہ جنگیں چھیڑتے ہیں اور جب جنگیں ختم ہوتی ہیں تو پھر عوام ان کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر دیتے ہیں اور وہ اقتدار کی کرسیاں چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ان کرسیوں پر اگر بھٹو شہید جیسے ترقی پسند لوگ آ جائیں تو ملک کے اندر کام کرنے والی سامراج کی پیدا کردہ بیوروکریسی ان ترقی پسند رہنماؤں کو اپنی فاکوں کے بندھنوں میں باندھ کر رکھ دیتی ہے۔ تیسری دنیا کے تمام ممالک کے ریاستی ڈھانچے انہی بندھنوں کے تانوں بانوں میں جکڑے ہوئے ہیں ان میں سے کچھ کو امریکی اور یورپی طاقتوں اور عالمی مالیاتی اداروں نے جکڑ رکھا ہے اور کچھ کو سوشلسٹ بیوروکریسی نے باندھ رکھا ہے۔ بھٹو شہید نے حکومت سنبھال کر بھی یہ بات ذہن میں رکھی تھی کہ محض حکومتی کرسی پر بیٹھنے سے ان کا مشن پورا نہیں ہو گا جس کو لے کر وہ چلے ہیں بلکہ اس کیلئے تیسری دنیا کو متحرک کرنا ہو گا۔ اس حوالے سے انہوں نے تیسری دنیا کے ممالک کے عوام میں جو جدوجہد کی وہ ان کی تحریروں اور تقریروں سے کھل کر سامنے آئی ہے اور سب سے پہلے ان کی کتاب "متھ آف انڈی پینڈنس" کو پڑھنا ضروری ہے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ ایوبی حکومت چھوڑنے سے لے کر پیپلز پارٹی بنانے اور پھر حکومت میں آنے کے بعد تک انہوں نے عالمی سیاست میں اتنا زیادہ کام کیوں کیا اور کس مقصد کیلئے کیا؟

متھ آف انڈی پنڈنس کے چند حوالے میں اس لئے دے رہا ہوں کہ شہید بھٹو کی جدوجہد کا تجزیہ کر کے اسے آگے بڑھانے کی ذمہ داری پوری کی جا سکے اور یہ راستہ بنایا جا سکے کہ آج جب امریکہ اور یورپ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی آئندہ سرمایہ کاری اور امداد کا مرکز مشرقی یورپ کو بنائیں گے تو تیسری دنیا کے ممالک کو وہ قرضے نہیں ملیں گے جن کی بنیاد پر ان کے حکمران طبقے ماضی میں چلتے رہے اور اپنے عوام کو جھانسے دیتے ہوئے کھلتے چلے گئے۔ دوسری طرف ڈرگ مافیا نے تیسری دنیا میں اپنی حکمرانیاں قائم کرنے کا جال بھی بُن لیا ہے۔ یہ ڈرگ مافیا اور ہیروئن بھٹو شہید کی زندگی تک پاکستان میں موجود ہی نہیں تھی۔ تیسری دنیا کو اب یورپ اور امریکہ نے اس حال پر چھوڑ دیا ہے کہ یہ ان کی ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا فالتو مال خرید لیا کریں جبکہ ان کارپوریشنوں کا زیادہ مال بھی وہ مشرقی یورپ میں بیچیں گے۔ دوسری طرف روس نے تیسری دنیا کی طرف اپنی تجارت و صنعت جاپان کے راستے پھیلانے کا راستہ اختیار کر لیا ہے یہ جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں ان میں پاکستان کے عوام کو تیسری دنیا کے اتحاد کی اسی راہ پر چلانا پڑے گا جس کی نشاندہی شہید بھٹو بار بار کرتے رہے اور یہ بات خصوصی طور پر بتاتے رہے کہ اگرچہ بھارت نے روس کے ساتھ زیادہ دوستی کر رکھی ہے لیکن حقیقت میں امریکہ بھارت کو اپنا اتحادی بنائے گا۔ روس کے خلاف استعمال کرنے کیلئے چین کو بھی ساتھ ملائے گا اور بھارت کو جنوبی ایشیا پر بالادستی قائم کرنے میں مدد دے گا تاکہ روس کے خلاف بڑے پیمانے پر ایک جال بُن سکے۔ اس حوالے سے متھ آف انڈیپنڈنس میں طویل حقائق کی تفصیل اور ٹھوس دلائل دے کر شہید بھٹو نے یہ ثابت کیا ہے کہ بھارت اور

www.bhutto.org

امریکہ کے درمیان تعلقات کتنے گہرے ہیں اور کیسے ایک بڑی مادی قوت بن رہے ہیں؟۔ ان دلائل اور حقائق کو سمجھنے کیلئے سب سے پہلے متھ آف انڈی پنڈنس سے مدد لینا پڑتی ہے جس کے پہلے باب میں بھٹو یہ کہتے ہیں کہ "ایوب خان نے 1961ء میں امریکی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا کہ پاکستان وہ واحد ملک ہے جہاں امریکہ کی فوجیں اپنی آزاد دنیا کے دفاع کیلئے چاہیں تو کسی بھی لمحے اُتر سکتی ہیں۔" لیکن اسی ایوب کی کابینہ سے بغاوت کرنے والے خوبصورت نوجوان ذوالفقار علی بھٹو اپنی مذکورہ کتاب کے پہلے باب میں ملکوں کی مساوات کی جدوجہد کا انکشاف بھی طبقاتی مساوات کی جدوجہد کے ساتھ کرتے ہیں اور دوسرے باب میں بتاتے ہیں کہ امریکہ' برطانیہ' فرانس' جرمنی' روس' جاپان اور اٹلی دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی طاقتیں بن کر اُبھرے ہیں اور چھوٹی قوموں کو انہوں نے اپنے پنجوں میں یوں جکڑ لیا ہے کہ ملکوں کے علاقائی اتحاد جو عالمی طاقتوں کے بیلنس آف پاور کے حوالے سے بن رہے ہیں' ان میں چھوٹی قومیں ان بڑی طاقتوں کی معاون بنی ہوئی ہیں۔ یہ بیلنس کسی بھی ایک بڑی طاقت کے حق میں جھک جائے تو عالمی امن ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے تیسری دنیا کے ممالک کو اپنا اتحاد قائم کر کے اپنی اندرونی ترقی اور مساوات کی بنیاد پر عالمی طاقتوں سے بھی مساوی مقام حاصل کرنا چاہئے۔ بھٹو کی ان باتوں کو اگر مشرقی یورپ کی موجودہ پالیسیوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو پہلا خیال یہ آتا ہے کہ اسٹالن نے روز ویلٹ کے ساتھ سمجھوتہ کر کے لینن کی بنائی ہوئی جس تھرڈ انٹرنیشنل کو توڑ دیا تھا اور دنیا بھر کی سوشلسٹ تحریک کی اجتماعی شکل ختم کر دی تھی اس کو شہید بھٹو اپنے پاپولسٹ رومانوی انداز میں سائنسی بنیاد کو شامل کر کے تیسری دنیا میں دوبارہ پھیلانا چاہتے تھے اور پاکستان پیپلز پارٹی کو ایک بین الاقوامی تحریک کی شکل دینے کے خواہش مند تھے۔ اسی کتاب کے دوسرے باب میں بھٹو کہتے ہیں کہ عالمی طاقتوں کے طور پر آج صرف تین ملک گنے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک امریکہ' دوسرا روس اور تیسرا چین ہے۔ یورپ صرف اس وقت عالمی طاقت بن سکتا ہے جب مشرقی یورپ اور مغربی یورپ ایک ہو جائیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ آج مشرقی یورپ میں سوشلزم کو ٹرانسفارم کرنے والے عوام بھی یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ مشرقی اور مغربی یورپ کو متحد کر کے ایک کامن یورپ بنایا جائے اور مغربی یورپ بھی یہ کہہ رہا ہے کہ اس کی انوسٹمنٹ اور امداد اب مشرقی یورپ میں جائیگی۔ بھٹو کے الفاظ میں اس طرح ایک "یورپین یورپ" بن جائے گا اور عالمی طاقت ہو گا۔ دوسری طرف ہمیں تیسری دنیا کو ایک عالمی طاقت بنانا ہو گا۔ بھٹو کی یہ بات ایک حقیقت ہے کیونکہ عالمی طاقتوں کی اصل قوت جس بنیاد پر قائم ہوتی ہے وہ تیسری دنیا کے عوام کے پاس موجود ہے اور جدید ٹیکنالوجی بھی اپنی وسیع مارکیٹ اور آٹومیشن' کمپیوٹرائزیشن اور روبوٹائزیشن کی وجہ سے پوری دنیا میں پھیل جائے گی۔ ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا مال بیچ گا تو اس کی نمبر 2 (نقول) بھی کمپیوٹر کے دور میں ہر چھوٹے ملک کے چھوٹے بڑے شہر میں اسی طرح بننے لگ جائے گی جس طرح ہانگ کانگ اور تائیوان میں بن رہی ہے۔ یہ کام چلے گا تو پھر اجارہ داریاں نقلی سامان کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ جائیں گی۔

www.bhutto.org

سپر عالمی طاقتوں کی صرف بیوی مشینری بنانے کی اجارہ داری قائم رہ سکے گی۔ اشیائے صرف کی اجارہ داری ان کے پاس قطعاً نہیں رہے گی۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ بھٹو محض خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کا مشن اگر کسی رکاوٹ کی نذر ہوا تو مارشل لاء کے جبر اور اپنی پارٹی کی تنظیمی کمزوریوں کی وجہ سے ہوا۔ ان کا تجزیہ غلط قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن ان کے تجزیوں کی گرفت میں لینے کیلئے ان کی سینکڑوں تقریروں' بیانات اور انٹرویوز کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان میں یہ بحث پچھلے 42 سال سے جاری ہے کہ اس کے حکومتی ڈھانچے پر قبضہ رکھنے والا سب سے امیر طبقہ کون سا ہے؟ اس حوالے سے عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے اقتدار پر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا قبضہ رہا ہے اور ریاستی مشینری ان طبقوں کی خدمت گزار ہے۔ میرا نقطہ نظر اس سلسلے میں یہ ہے کہ پاکستان کے اقتدار پر قابض طبقوں میں سب سے زیادہ طاقتور' با اختیار اور امیر قوت بیوروکریسی کی ہے جو از خود ایک طبقہ ہے اور عالمی سامراج کے مفادات پورے کر کے خود بھی فائدہ اٹھاتی ہے۔ پاکستان کے سرمایہ دار اور جاگیردار اس پالتو بیوروکریسی کے زیر سایہ رہ کر کام چلاتے ہیں اور یہ ریاستی ڈھانچہ وہی ہے جس کی بنیاد ایسٹ انڈیا کمپنی نے رکھی تھی۔ میری اس بات کی تصدیق بھٹو شہید کے نقطہ نظر سے بھی ہوتی ہے۔ اس کا سب سے پہلا ثبوت یہ ملتا ہے کہ شہید نے 1972ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا کام ہی یہ کیا تھا کہ اپریل 1972ء میں ایڈمنسٹریٹو ریفارمز کمیٹی قائم کر دی تھی اور 1973ء میں اس کمیٹی کی تجویز کردہ اصلاحات پر بھی عمل شروع کر دیا تھا اگرچہ یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ بھٹو نے تمام بڑی صنعتیں سرمایہ داروں سے لے کر بیوروکریسی کے سپرد کر دی تھیں اور بیوروکریسی کو طاقتور بنا دیا تھا لیکن 1972ء میں جب مشرقی پاکستان ٹوٹ کر علیحدہ ہو چکا تھا تو بھٹو شہید کے پاس اپنی پارٹی کی کوئی ایسی انقلابی تنظیم موجود نہیں تھی جو ریاستی مشینری کی ایک متوازی ماہر تنظیم ثابت ہو سکتی۔ علاوہ ازیں بھٹو شہید کو یہ بھی احساس تھا کہ اس ملک میں نیشنل بورژوازی موجود ہی نہیں ہے اس لئے سامراجی ملکوں کی صنعت کے سامنے قومی صنعت کھڑی کرنے کا کردار حکومت کو ہی ادا کرنا پڑے گا لہٰذا انہوں نے برطانوی سامراج کے بنائے ہوئے بیوروکریٹک ڈھانچے میں اصلاح کرنے کا راستہ اپنایا کیونکہ اس ڈھانچے کو توڑنے اور متوازی ڈھانچہ بنانے کی طاقت پیپلز پارٹی نے اپنی نوعمری کے باعث ابھی پیدا نہیں کی تھی۔

ایڈمنسٹریٹو ریفارمز کمیٹی (اپریل 1972ء) کا چیئرمین خورشید حسن میر کو بنایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مواصلات اور سیاسی امور کے وزیر غلام مصطفیٰ جتوئی' فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) فیض اللہ کنڈی اور سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ وقار احمد کو اس کمیٹی کا ممبر بنا دیا گیا۔ اس کمیٹی کو جو فرائض سونپے گئے وہ مندرجہ ذیل تھے۔

(1) سروس اسٹرکچر کو از سر نو مربوط اور متحد کیا جائے۔

(2) رشوت اور بدعنوانی کو ختم کیا جائے اور ڈسپلن کے طریق کار کو ربط اور تسلسل دیا جائے۔

www.bhutto.org

(3) بھرتی، تربیت اور ترقی کے سسٹم کو از سر نو منظم کیا جائے۔

اس کمیٹی کی سفارشات پر مشتمل اصلاحات کا اعلان 20 اگست 1973ء کو شہید بھٹو نے خود کیا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

(1) تمام افسران اور ملازمین کے کیڈروں کا ایک ڈھانچہ بنایا گیا جس میں تمام ملازمین کو ہر عہدے کیلئے پیشہ ورانہ اور تخصیصی اہلیت کی بنیاد پر مساوی مواقع دیئے جائیں گے۔

(2) سرکاری ملازمین کے اندر موجود تمام کلاسوں کو ختم کر دیا گیا اور ان کی جگہ گریڈوں کا ڈھانچہ بنا دیا گیا اور کلاس نمبر 1 سے کلاس نمبر 4 کو بالکل ختم کر دیا گیا۔

(3) سروس لیبل کا استعمال ختم کر دیا گیا۔

(4) نئے یونائیٹڈ اسٹرکچر میں تمام شعبوں کے اندر عمومی سطح پر سارے افسران کو ترقی کے مواقع مل گئے۔

(5) مناسب منصب کا تعین کرنے کیلئے کام کی تشخیص کو بنیاد بنایا گیا۔

(6) نجی بنکوں، بیمہ کمپنیوں، صنعتوں اور تجارتی اداروں میں کام کرنے والے ذہین لوگوں کو سرکاری ملازمتوں میں داخل کرنے کی شق رکھ لی گئی۔

(7) تنخواہوں کے 600 اسکیلوں کی جگہ 23 نیشنل پے اسکیل گریڈ مقرر کر دیئے گئے۔

(8) بیوروکریسی کی سروس کے قواعد اور شرائط کو آئین کے تحت رکھنے کی بجائے عام قانون کے تحت رکھ کر چلانے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔

ان تبدیلیوں کے ساتھ ہی وفاقی حکومت کے 34 سروس کیڈر 25 فنکشنل گروپوں میں تبدیل کر دیئے گئے جو 23 نئے اسکیل تنخواہوں کیلئے رکھے گئے ان میں سب سے چھوٹے یعنی اسکیل نمبر 1 کی بنیادی تنخواہ ایک سو روپیہ ماہانہ رکھی گئی جبکہ سب سے اوپر والے یعنی اسکیل نمبر 23 کی بنیادی تنخواہ 3000 روپے ماہانہ رکھی گئی۔ ان اسکیلوں میں سے پہلے پندرہ اسکیلوں کو نان گزیٹڈ کر دیا گیا جبکہ گریڈ 16 سے 23 تک کے افسروں کو گزیٹڈ آفیسر قرار دیا گیا۔ بیوروکریسی کے ڈھانچے میں جو اصلاحات شہید بھٹو نے کیں ان میں افسروں کی ترقی کیلئے سینیارٹی کی بنیاد ختم کر دی گئی اور نیا ضابطہ یہ بنایا گیا کہ آئندہ افسران کی ترقی صرف پرفارمنس کی بنیاد پر ہوگی۔ ٹیکنیکی اور سائنسی علم رکھنے والوں کو انتظامی درجہ رکھنے والوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی کے مواقع دیئے جائیں گے۔ لیٹرل انٹری کے ضابطے سے غیر سرکاری اداروں میں سے ذہین افسروں کو سرکاری عہدوں پر لایا جائے گا۔

ان اصلاحات کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بیوروکریسی اور سیاستدانوں کے درمیان توازن سیاستدانوں کے حق میں چلا گیا اور بیوروکریسی کے اندر بھی سی ایس ایس افسران نان سی ایس ایس افسران سے نیچے چلے گئے۔ افسران میں جو تبدیلیاں اور تقرریاں لیٹرل انٹری کے ذریعے کی گئیں ان کی ایک مثال تو

www.bhutto.org

یہ ہے کہ 1973ء میں صرف وزارت خارجہ میں 121 افراد رکھے گئے۔ ان میں 51 غیر سرکاری تھے ان میں 14 وکیلوں میں سے 12 عام شہریوں میں سے' 8 خود مختار کارپوریشنوں میں سے' 6 مقامی یونیورسٹیوں میں سے' 6 بیرونی یونیورسٹیوں میں سے اور باقی 5 مختلف شعبوں میں سے۔ دیگر متعلقہ محکموں میں سائنسی اور ٹیکنیکی افراد کو ترجیح دی گئی اور اصول یہ اختیار کیا گیا کہ افسر کی خوبی کیلئے "پاور" کا لفظ ہٹا کر "سروس" کا لفظ معیار بنایا جائے۔

اگر تمام بیوروکریسی میں لائی جانے والی تبدیلیوں اور نئی تقرریوں کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایوب خان کے خلاف شہید بھٹو کی تحریک کا ایک اہم پہلو ریاستی طاقت کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ یہ تحریک صرف ایک آمر کو ہی ختم نہیں کر رہی تھی بلکہ پوری بیوروکریسی کو چھانٹ کر درست راستے پر چلانے کیلئے عملی قدم اٹھا رہی تھی۔ حکومت میں آنے کے بعد بھی بھٹو شہید صرف حکمران نہیں بنے تھے بلکہ ایک تحریک کے سربراہ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور جو اصلاحات انہوں نے کی تھیں وہ آخری اصلاحات نہیں تھیں بلکہ پہلا قدم تھیں اور بیوروکریسی اس پہلے قدم سے ہی لرز گئی تھی کیونکہ اس سے پہلے وہ 1962ء میں بننے والی کارنیلیئس رپورٹ کو ہی تسلیم نہیں کرتی تھی جس میں افسروں کے سروں پر عوامی تحریک کے کارکن سوار ہو گئے تھے۔ واضح رہے کہ 1970ء میں مولانا بھاشانی نے بھی بیوروکریسی کے خلاف بدعنوانی ختم کرو' کے نعرے کے تحت تحریک شروع کی تھی لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہو سکی اور بیوروکریسی یہ سمجھتی رہی کہ اسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا مگر بھٹو شہید نے اس جناتی قوت رکھنے والی بیوروکریسی کو یک لخت ایسا جھٹکا دیا کہ یہ لرز گئی اور اس نے غیض و غضب میں آکر رجعت پسند گروپوں کی مدد سے بھٹو حکومت بننے کے چند ہفتے بعد ہی پولیس ہڑتال کروا دی جو پورے پنجاب میں پھیل گئی۔ اس ہڑتال کا سامنا پنجاب میں ہی کرنا پڑا کیونکہ بیوروکریسی کی پیداوار اسی صوبے سے ہوتی تھی۔ ہڑتال کے وقت پنجاب کا نوجوان گورنر غلام مصطفیٰ کھر شہید بھٹو سے ہدایات لے رہا تھا کہ اس صورتحال کا مقابلہ وہ کیسے کرے؟ کوئی آمرانہ نظام چلانے والا حکمران ہوتا تو بیوروکریسی کے خلاف اقدام بھی بیوروکریٹک طریقے سے کرتا لیکن شہید بھٹو نے غلام مصطفیٰ کھر کو ہدایت کی کہ پولیس ہڑتال کا توڑ کرنے کے لئے شہروں' گلیوں' بازاروں اور تھانوں کا انتظام اجتماعی طور پر نوجوان نسل کے سپرد کر دیں اور محنت کش طبقوں سے اپیل کریں کہ وہ پولیس کے بغیر ہی صوبے کو چلائیں اور پھر یہی ہوا۔ موچی دروازے کے سیاسی میدان میں کھر نے پنجاب کے شہریوں سے خطاب کیا تو عوام نے پورے پنجاب کے تحفظ کی ذمہ داری لے کر امن و امان کا بندوبست اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا ریکارڈ ہے کہ 1972ء میں جتنے دن پولیس کی ہڑتال جاری رہی اتنے دن کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا' کوئی چوری ڈاکہ' قتل یا زنا جیسی واردات سامنے نہیں آئی۔ بھٹو شہید درحقیقت ریاستی مشینری کے موجودہ ڈھانچے کو فوری طور پر اکھاڑ پھینکنے کے طریقے کو غلط سمجھتے تھے جبکہ اس ڈھانچے کو قائم بھی نہیں رکھنا چاہتے تھے اور ہر قدم مناسب وقت پر اٹھاتے تھے اور

www.bhutto.org

عوام کو متحرک کر کے سماجی اور ریاستی تبدیلیاں لانے اور ان کی تربیت اور تعلیم پر یقین رکھتے تھے تاکہ ایسا وقت بھی آئے جب پورے کا پورا نظام بتدریج ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا تبدیل ہو جائے۔

حکومت میں آنے سے پہلے ایوبی حکومت کے خلاف تحریک کے دوران ترقی پسند حکمتِ عملی اختیار کر کے شہید بھٹو نے لوگوں کے شعور کو بدلنے کا عمل شروع کیا تو ساتھ ہی دیہی آبادی میں جاگیردارانہ رسوم و رواج اور جبر کے ہاتھوں پسنے والے عوام کے اس موضوعی باطنی وجود کو بھی متحرک کر دیا جو محنت کش طبقوں کی رومانویت پر قائم سیرت ( ) کی شکل میں صدیوں سے چلا آرہا تھا لیکن اس کو جاگیردار، تاجر، سرمایہ دار، بیوروکریٹ اور مُلّا نے دبا کر رکھا ہوا تھا ایوب خان نے دیہی آبادی کے حق خود اختیاری کا جعلی نعرہ دے کر بنیادی جمہوریت کا فریب دیا تھا اور لوگوں کو چودھریوں کے لئے ووٹ ڈالنے کا حق دیکر عوام کا ایک عبوری کتھارسس کروایا تھا لیکن اس کتھارسس کے ذریعے منتخب ہونے والے بی۔ ڈی ممبروں کو صدارتی نظام کے لئے الیکٹورل کالج بنا دیا تھا۔ اس سسٹم کے ذریعے جتنے بھی بی ڈی ممبر منتخب ہوتے تھے وہ بیوروکریسی کے پرزے بن کر تھانے اور کچہری کا جبر دیہات میں پھیلاتے جا رہے تھے اس صورتحال میں پاکستانی دیہات میں اتھارٹی ٹیرن ازم، میل شاونزم، میٹری آرکل سسٹم (پدرسری نظام) رائج تھا جبکہ عوام اس سے نجات چاہتے تھے لیکن کسی لیڈر نے اس نجات کے لئے حکمتِ عملی اور نئے نظام کا کوئی عبوری خاکہ پیش نہیں کیا تھا یہ درست ہے کہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں نے کسان کمیٹیوں اور مزدور یونینوں کے ذریعے سوشلسٹ انقلاب کے نظریئے کے کچھ ٹوٹے پھوٹے سے نعرے عوام کے کچھ حصوں تک پہنچائے تھے لیکن یہ کمیونسٹ پارٹیاں خود سوویت یونین کے ریاستی مفادات کی ایجنٹ اور اسٹالن ازم کی میکانکی حکمت عملی کی مشینری بن کر رہ گئی تھیں علاوہ ازیں ان کے پاس سوشلسٹ انقلاب کا جو نعرہ تھا اس کے ساتھ فوری ضروریات پوری کرنے کا کوئی عبوری پروگرام نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں عوام کی فوری اور طویل المدت ثقافتی ضروریات کا علم ہی نہیں تھا ان کمزوریوں کو دُور کرنے کے لئے بھٹو شہید نے طویل المدت منشور پیش کرنے کے علاوہ فوری اور عبوری دور کے پروگراموں کو نعروں کی شکل میں پھیلا دیا اور بار بار اس بات پر زور دیا کہ عوام خود اپنے اختیار اور پیش عملی کے ذریعے نیا ایتھاس، نیا نظام اور نئے راستے بنانے کی راہِ عمل پر چل پڑیں کیونکہ حکومت کے ذریعے اوپر سے بھیجی ہوئی جمہوریت خود ہی ناکام ہو جایا کرتی ہے۔ اصل ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ جمہوریت کو عوام کے ذہنوں، ضمیروں اور جسموں کی زمین سے اُگایا جائے۔ جمہوریت سخاوت میں نہ دی جائے بلکہ ان کے مساویانہ اشتراک کے ذریعے اگائی جائے جو سخاوت کی بجائے محبت کی بنیاد پر کھڑی ہو۔ اس جمہوریت کے لئے ذات برادری کی بنیاد پر ہونے والے قدامت پرستانہ طرزِ انتخاب کو ختم کرنا ضروری تھا اور جس وجودی شناخت کے لئے ذات برادری کا تانا بانا قائم ہوتا ہے اس شناخت کو طبقاتی اور انفرادی خود مختاری، انسان دوستی، نئی مہارت، نئے علم اور نئی ثقافت کے ذریعے قائم کرنا ضروری تھا۔

www.bhutto.org

یہ وہ کام تھا جو شہید بھٹو مختلف طریقوں سے کر رہے تھے علاوہ ازیں ہمارے دیہات میں پرانی ذات برادری کی ساخت میں سامراجی اور سرمایہ دارانہ معیشت نے جو تبدیلیاں پیدا کی تھیں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پیدا کردہ چودھریوں کی دھڑے بندیوں کی ہی نئی شکل تھیں اور اب یوں نظر آتی تھیں کہ ایک ایک برادری کے اندر ہی مختلف چودھریوں کے دھڑے بن چکے تھے جو ایک دوسرے کے خلاف تھانوں کچہریوں میں مقدمے بازی کرتے رہتے تھے اور ایک دوسرے پر بندوقیں بھی چلاتے رہتے تھے اور اس دھڑے بندی میں شامل جاگیردار اور پولیس افسر خود رسہ گیری کر کے چوریاں بھی کرواتے رہتے تھے اور ڈاکوؤں کی سرپرستی بھی کرتے اس صورتحال کو بدلنے اور عوام کو انصاف دینے کے لئے اگر یہ سوچا جاتا کہ اوپر سے کوئی نیک افسر مسلط کر کے یہ خرابیاں دور کر دی جائیں گی تو یہ بات ممکن نہیں تھی۔ بھٹو شہید اس آئیڈیلزم میں بھی نہیں پڑنا چاہتے تھے لیکن وہ ریاستی مشینری اور امیر طبقوں کے اندرونی دھڑوں کے باہمی تضادات کو استعمال کرنے کی غرض سے ریاستی مشینری کے اندر بیٹھ کر حکومت چلانا چاہتے تھے خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو؟ ان کا مقصد ایک طرف تو یہ تھا کہ عوامی تحریک کو آگے بڑھایا جائے' دوسری طرف اسمبلیٹ اپریٹس کے اندر دراڑیں ڈالی جائیں نیز بی۔ ڈی نظام کے تحت بننے والے نمائندگان کو ذات برادری کی بجائے نظریاتی بنیاد پر الیکشن لڑنے پر مجبور کیا جائے اس غرض سے عوام کو طبقاتی اور نظریاتی حوالے سے متحرک کیا جائے کیونکہ بی ڈی سسٹم میں غیر سیاسی اور غیر جماعتی حیثیت سے الیکشن جیتنے والے نمائندگان خود بیوروکریسی کے ساتھ رشوت اور سفارش کے دھندے میں شامل ہو جاتے تھے اور ووٹر کو خیرات لینے والا محتاج بنا کر اپنی سخاوت کا پرچار کرتے رہتے تھے جبکہ بھٹو شہید نے غریب عوام کو محتاجی کی زندگی سے نکال کر "تخلیق کار" کی زندگی کے راستے پر چلانے کا عہد کر رکھا تھا۔ اس لئے وہ الیکشن میں برادریوں کے ساتھ جوڑ توڑ کرنے کی بجائے عوامی تحریک کو پھیلاتے جا رہے تھے کیونکہ انہیں علم تھا کہ ذات برادری کی وجہ سے جو چودھری یونین کونسل' تحصیل کونسل' ڈسٹرکٹ کونسل یا اسمبلی کے رکن بنتے ہیں انہی کے رشتے دار' سالے' بہنوئی' چاچے اور ماموں دوسری طرف بیوروکریسی میں بھی کرسیاں سنبھال کر بیٹھے ہیں اور ان سب کو پارٹی کی نگاہیں پکڑا دیں تو پھر پیپلز پارٹی بھی مسلم لیگ بن کر ختم ہو جائے گی۔

یہی وجہ تھی کہ 1970ء کے الیکشن کے وقت بھٹو شہید نے پیپلز پارٹی کا جو انتخابی منشور پیش کیا تھا اس میں بلدیاتی اداروں کے ممبروں کی چودھراہٹ کو عام لوگوں کی تحریک کے ذریعے پسپا کیا تھا اور عوام کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ بلدیاتی اداروں کے ممبروں سے لے کر اسمبلی ممبران تک کا احتساب کر سکیں اور ان افسروں پر بھی دباؤ ڈال سکیں جو منتخب نمائندگان کو رشوت اور سفارش کے دھندے میں ٹاؤٹ بنا کر استعمال کرتے ہیں اور یہ ممبران بھی بڑے شوق سے ان کے دلال بن جاتے ہیں۔ ایوب خان نے بلدیاتی اداروں کو افسر شاہی کے ماتحت ہی رکھا تھا لیکن 1973ء کے آئین اور اپنے انتخابی پروگرام میں

www.bhutto.org

شہید بھٹو نے ایک طرف تو منتخب ممبران کو عوام کے سامنے جوابدہ کر دیا دوسری طرف ملک کے صدر سے لیکر ڈپٹی کمشنر تک کو منتخب نمائندوں کی نسبت کسی حد تک نیچے گرا دیا اور تیسری طرف منتخب بلدیاتی ممبروں کے ذریعے حکومتی انتخاب کرانے کا نظام ختم کر دیا اور بالواسطہ انتخاب کی جگہ براہِ راست بالغ رائے دہی کا نظام رائج کیا۔ بی ڈی ممبروں اور حکمران طبقوں کے پیشوار ارکان اسمبلی کو عوام کے سامنے جوابدہ بنانے کے لئے شہید بھٹو نے نہ صرف حکومت میں آنے سے پہلے ایک طبقاتی تحریک کو پہلے مرحلے میں کامیاب بنایا بلکہ حکومت میں آنے کے بعد بھی اپنی اس تحریک کو جاری رکھتے ہوئے کھلی کچہریاں لگانے کا رواج ڈالا۔ یہ کچہریاں لوگوں کے تمام مسائل حل کرنے کی گارنٹی نہیں تھیں بلکہ نئے نظام کی نئی تحریک چلانے کے لئے ایک تربیتی سلسلے کی کڑیاں تھیں بیوروکریسی میں سے جو سینکڑوں افسران برطرف کئے گئے ان کی بات تو ہم بعد میں کریں گے سب سے پہلے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ بھٹو حکومت کے باہر بھی ایک تحریک چلاتے رہے تھے اور حکومت کے اندر بھی ایک تحریک ہی چلاتے رہے۔ وہ کوئی نظام نہیں چلا رہے تھے انہوں نے اگر غلام مصطفیٰ کھر اور میر رسول بخش تالپور جیسے گورنروں سے ڈاکوؤں اور چوروں کے خلاف سخت کارروائیاں کرائیں تو یہ ایک نئی تحریک کے اقدامات ہی تھے جو صرف اصلاحات تک محدود نہیں تھے یہ کام وہ اس وقت کر رہے تھے جب ایک طرف دشمنوں نے سندھ اور کراچی میں لسانی فسادات بھی برپا کر دیئے تھے۔

بھٹو عجیب حکمران تھے ' سندھ میں لسانی فسادات ہوئے تو جولائی 1972ء میں وہ خود کراچی ' لاڑکانہ ' جیکب آباد ' سکھر ' خیرپور ' نواب شاہ ' دادو ' حیدر آباد اور ٹنڈو آدم کی گلیوں اور بازاروں میں جاکر لسانی فسادات کو طبقاتی جدوجہد کی پرامن تحریک میں تبدیل کرنے کے لئے تقریریں کرنے لگے۔ 1972ء میں جو اقتدار شہید بھٹو کو ملا وہ اقتدار نہیں بلکہ حکمران طبقوں کی چال یہ تھی کہ پہلے تو بھٹو کو حکومت میں بٹھا دیا جائے ؟ اسکے بعد انہیں بری طرح ناکام بنا کے نکال دیا جائے اس سے قبل امریکی حکومت بھی یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ جس بھٹو کو اس نے خود ایوبی وزارت سے نکلوایا ' وہی بھٹو اب ان سے ساتھ کچھ لو اور کچھ دو کی بات کرتا ہوا ایک عظیم عوامی تحریک کا لیڈر بن کر سامنے کھڑا ہے۔ مشرقی پاکستان میں شکست نے ہر قسم کی بیوروکریسی کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں رہ گئی تھی ' پورے ملک کو چلانا تو بہت دور کی بات تھی۔ اس وقت شہید بھٹو بڑی آسانی سے یہ بات سوچ سکتے تھے کہ وہ انتہا پسندانہ راستہ اختیار کریں اور عوامی ایجی ٹیشن شروع کر کے پورے نظام کو بدلنے کی یک لخت دوڑ لگا دیں لیکن بھٹو شہید کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب اسٹالن نے تھرڈ انٹرنیشنل کو توڑ کر دنیا بھر کی سوشلسٹ تحریکوں کو تنہائی میں دھکیل دیا تو اس وقت پاکستان کی عوامی تحریک کو بھی تنہائی میں دھکیلنے کا نتیجہ وہی ہوگا جو مشرقی پاکستان کی اس تحریک کا ہوا ہے جو کیمونسٹ پارٹی (مارکسسٹ لیننسٹ) کی قیادت میں چلتی ہوئی پہلے یحییٰ خان کے فوجی اقدام اور اس کے بعد

www.bhutto.org

شیخ مجیب الرحمٰن اور بھارت کی فوج کے ہاتھوں نقصان اٹھاتی رہی۔ اس کمیونسٹ تحریک پر حملہ ہوا تو دونوں مرتبہ روس چین جیسے سوشلسٹ ملکوں نے اپنے ریاستی مفاد کو انقلابی پارٹیوں کے مفاد سے بالاتر رکھا اور مشرقی پاکستان کی انقلابی تحریک کا ساتھ نہ دیا۔ اسی طرح اب اگر پاکستان کے اندر بھٹو اپنی سوشلسٹ تحریک کو تنہائی میں آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تو بھارت یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اسکی سرحد پر موجود ایک سوشلسٹ مملکت بن جائے اس لئے یہ خطرہ موجود تھا کہ جس طرح بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تھا اسی طرح وہ مغربی پاکستان پر بھی حملہ کر سکتا ہے۔ دوسری طرف امریکہ بھی بھٹو کی تحریک کو کچلنے کے اقدامات کرے گا۔ شاہ کا ایران اور عرب ممالک بھی فوری طور پر اس ٹوٹے پھوٹے پاکستان کے ساتھ محبت کرنا چھوڑ دیں گے۔ اس وقت کا روس پاکستان کو بھارت کی بالادستی میں رکھنا چاہتا تھا اور امریکہ کو یہ بات اس لئے پسند ہوتی کہ بھارت اور اس کے درمیان اختلافات کم ہو جاتے۔ بھٹو شہید کو یہ بھی احساس تھا کہ ان کی پارٹی میں ریڈیکل تنظیم تو موجود ہی نہیں ہے جو اس وقت کی ابتدائی تحریک کو انقلاب کی اگلی منزل تک لے جائے لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ انقلاب کا خواب جلد بازی میں دیکھ کر پاکستان کی سالمیت کو خطرے میں ڈالنا اور لاکھوں عوام کو خون کے دریا میں ڈبونے کے مترادف ہے اس پس منظر میں انہوں نے حکومت قبول کی اور جب اقتدار سنبھالنے کے لئے امریکہ سے واپس آئے تو امریکی صدر نکسن اور وزیر خارجہ ولیم راجرز سے مذاکرات بھی کئے تاکہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر ان کے ساتھ افہام و تفہیم بھی پیدا کر لی جائے جو اگرچہ عارضی ہو لیکن فوری مسائل حل کرنے میں بھی کوئی مدد دے اور پاکستانی بیوروکریسی جو اندر سے تلملائی ہوئی ہے اسے بھی ساتھ چلایا جا سکے یہ کام بھٹو نے نہایت مشاقی اور جرأت کے ساتھ کئے لیکن دوسری طرف لسانی فسادات، فرقہ وارانہ جھگڑے اور پولیس کی ہڑتال کے ذریعے حکمران طبقے یہ کوشش کر رہے تھے کہ بھٹو کامیاب نہ ہو سکیں۔ حکمران طبقات نے غلیظ ترین چال یہ چلی تھی کہ اپنے زر پرست ایجنٹوں کو پیپلز پارٹی میں شامل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ان ایجنٹوں کو کس طرح قابو میں رکھا جائے؟ شہید بھٹو کے پاس وقت کم تھا اور مصائب و مسائل زیادہ تھے سرمایہ دار طبقے نے صنعتکاری میں سرمایہ لگانے کی بجائے اپنا سرمایہ بیرون ملک بھیجنا شروع کر دیا تھا ملک کی صنعتیں ڈانواں ڈول ہو رہی تھی سامراج اور اس کے اتحادی ملکوں کے سرمایہ داروں نے بھٹو کے لئے غیر ملکی امداد اور قرضے بند کر دیئے تھے۔ ملک میں گندم موجود نہیں تھی اور بھٹو کوشش کر رہے تھے کہ گندم سے بھرے ہوئے جہازوں کا رخ پاکستان کی طرف موڑ لیں۔ ملک کی ڈوبتی ہوئی صنعت چلانے کیلئے انہوں نے نیشنلائزیشن کی پالیسی اختیار کی تھی ان کے سوشلزم کو امریکہ اور یورپ اگر برداشت نہیں کرتے تھے تو روس اور انڈیا بھی پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ روس کا اسٹالن ازم اور ابھرتی ہوئی بھارتی سپر پاور کی شکل اختیار کرنے والی بھارتی بورژوازی بھی اسی طرح بھٹو کی مخالفت کر رہی تھی جس طرح پاکستان میں جماعت اسلامی اور پی این اے کی دوسری جماعتیں کر رہی تھیں۔ بھٹو کا سوشلزم اور ان کے تصوراتی افق

www.bhutto.org

رائج الوقت نظریات سے بالکل مختلف تھے اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ اس کا نتیجہ انارکی ہو سکتا ہے' انقلاب نہیں۔

www.bhutto.org

اقتصادی پالیسیاں

شہید بھٹو کے خلاف سرمایہ داروں اور تاجروں نے بیس سال سے بے بنیاد پروپیگنڈہ کی ایک مہم چلا رکھی ہے جس میں الزامات لگائے جاتے ہیں کہ انہوں نے صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کی پالیسی پر عمل کر کے صنعتی ترقی کو نقصان پہنچایا۔ پروپیگنڈہ کرنے والے جان بوجھ کر اس حقیقت کو چھپاتے ہیں کہ شہید بھٹو نے کراچی میں اسٹیل مل کیوں لگائی؟ جنگی طیارے اسمبل کرنے کا عظیم ترین پلانٹ کیوں تیار کیا؟ ٹیکسلا ہیوی مکینیکل کمپلیکس کی کارکردگی میں زیادہ استعداد پیدا کر کے شوگر ملوں اور دیگر صنعتی اجزاء کی مشینری ملک میں بنانے کی ابتداء کیوں کی؟ ان سب پالیسیوں کو دیکھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں لانا ضروری ہے کہ جب شہید بھٹو نے حکومت سنبھالی تو خود پاکستان کا سرمایہ دار طبقہ کیا کر رہا تھا؟ اس سوال کا جواب 1972ء کے اخبارات میں جگہ جگہ شائع ہونے والے شہید بھٹو کے ان بیانات سے مل جاتا ہے جن میں انہوں نے بار بار صنعتکاروں سے اپیلیں کیں کہ وہ اس سرمائے کو واپس لے آئیں جو انہوں نے پاکستان سے باہر منتقل کر دیا ہے لیکن کسی بھی صنعتکار نے ان کی اس اپیل پر توجہ نہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ 1971ء کی جنگ اور خصوصاً مشرقی پاکستان کے عوام کے خلاف کئے جانے والے ملٹری ایکشن کے دوران پاکستان کے سرمایہ داروں نے ایک طرف تو وطن دوستی کے نعرے لگانے شروع کر دیئے تھے لیکن دوسری طرف اپنے سرمائے کو دھڑا دھڑ پاکستان سے باہر منتقل کرتے جا رہے تھے اگر وسیع تناظر میں بات کی جائے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کے سرمایہ داروں نے بھی سرمایہ کاری

www.bhutto.org

چھوڑ دی تھی اور برطانوی حکومت کو بے شمار بڑی بڑی صنعتیں نیشنلائز کر کے چلانی پڑی تھیں۔ اسی طرح پاکستان کے وہ سرمایہ دار جو امریکہ اور یورپ کے پالتو تھے 72 - 1971ء میں وہ خود بھی پاکستان میں سرمایہ کاری کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ علاوہ ازیں ایک اور بڑا مسئلہ تھا کہ ایوبی دور میں تو امریکہ اور یورپ نے یہ پالیسی بنائی تھی کہ پاکستان جیسے ملکوں میں بنیادی بھاری صنعت کے علاوہ باقی صنعتیں لگانے کیلئے اپنے ملکوں کی مشین ساز صنعتوں کی مشینری قرض پر فروخت کی جائے لیکن 1960ء کی دہائی کے ساتھ ہی امریکہ اور یورپ نے یہ پالیسی ترک کر دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مشینری پاکستان جیسے ملکوں میں لگ گئی تو یہاں کے مزدوروں کی مہارت میں اضافہ ہو جائے گا اور آخر کار یہ ممالک خود اپنی مشینیں بنانے لگ جائیں گے۔ جس کی وجہ سے ان ملکوں میں ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا مال بیچنے کی گنجائش نہیں رہے گی کیونکہ پاکستانی ماہرین کی بدولت یہاں اپنی مشینیں ہر قسم کا مال بنانا شروع کر دیں گی۔ مغربی ممالک کا ایک دوسرا مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہاں بیروزگاری بڑھنے لگی تھی اور ان کی صنعتوں سے بننے والی اشیاء و مال خریدنے والے کم ہوتے جا رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ پالیسی بنالی کہ پاکستان میں ایسی مشینیں بھی نہ بھیجی جائیں جن سے پاکستانی صنعت ترقی کرے۔ اس صورتحال میں توقع یہ تھی کہ پاکستان میں نیشنل بورژوازی (قومی سرمایہ دار) کا طبقہ قومی صنعت کو ترقی دینے کی مہم چلائے گا لیکن پاکستان میں کسی بھی صنعتکار طبقے نے قوم پرستی کا کردار کبھی ادا نہیں کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نیشنل بورژوازی موجود ہی نہیں اور حالت یہ ہو رہی تھی کہ مڈل کلاس کو مکان بنانے سے لے کر دکان چلانے تک کے قرضے مغربی ممالک سے ملنے لگ گئے تھے۔ اس لئے ہماری مڈل کلاس اور چھوٹی صنعت کے مالکان بھی کمپریڈار (گماشتے) بننے کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ سرمایہ دار ملکوں نے ان دنوں پاکستان کی مڈل کلاس اور چھوٹے بڑے تمام صنعتکاروں کو اس راہ پر لگا دیا کہ وہ صنعت کا نام لینا چھوڑ دیں اور تاجر بن جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے خود بھی پرانے برطانوی سامراج والی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ پاکستان کو صرف خام مال کی سپلائی بنا کر مغربی ممالک کی ٹرانس نیشنل کارپوریشنوں نے صنعت کیلئے یہاں سے دھاتیں اور دیگر خام مال اٹھانے کی پالیسی بنائی تھی۔ اسی بناء پر شہید بھٹو بار بار یہ کہتے تھے کہ "مغربی ممالک یہ چاہتے ہیں کہ ہم صرف لکڑہارے اور سقے بن کر رہ جائیں۔" اور ہمارے خام مال کو مغربی ممالک کی صنعتیں استعمال کرتی رہیں۔ یہ وہ حالات تھے جب شہید بھٹو نے پاکستانی صنعتکاروں اور تاجروں سے اپیلیں کرنا شروع کیں کہ وہ بیرونی ممالک سے اپنا سرمایہ واپس لے آئیں لیکن پاکستانی سرمایہ داروں نے ایک اور بہانہ بنانا شروع کر دیا اور یہ کہا کہ پیپلز پارٹی کی تحریک سے مزدور باغی اور بدتمیز ہو گئے ہیں اس لئے وہ سرمایہ داروں کی صنعت میں ہڑتالیں زیادہ کریں گے اور صنعتوں کو نقصان پہنچے گا لہٰذا صنعتیں لگانا ہی نہیں چاہئیں صرف تجارت کرنی چاہئے۔ یوں پاکستان کی دولت مند کلاس نے پاکستانی معیشت کو صنعتی معیشت بنانے کی بجائے مرکنٹائل معیشت بنائے رکھنے کی قدیم پالیسی پر عمل کیا اور یہ بات تو سوشیالوجی

www.bhutto.org

کاہر طالبعلم جانتا ہے کہ مرکنٹائل کلاس غیر تخلیقی کلاس ہوتی ہے جو پیداوار کا راستہ اختیار نہیں کرتی صرف مال بیچنے کا دھندا کرتی ہے اس لئے اس کی سوچ ہمیشہ برہمن جیسی رجعت پسند' انسان دشمن اور آمرانہ سوچ ہوتی ہے اور یہ کلاس ایک طرف تو بنیاد پرستی کا پرچار کرنے والے ملاؤں کو پالتی ہے دوسری طرف انسانی رشتوں کو کمرشل رشتوں میں اسی طرح تبدیل کر دیتی ہے جس طرح طوائفوں کے دلال انسانی رشتوں کو سودے بازی کے رشتے بنا دیتے ہیں۔ ان دلالوں' ملاؤں' کمپریڈار سرمایہ داروں اور کمپریڈار مڈل کلاس سے قطعاً یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ 72-1971ء کے ٹوٹے پھوٹے پاکستان کو یہ انڈسٹریل پیراڈائز بنائیں گی۔

اس اقتصادی اور سماجی پس منظر میں شہید بھٹو کو اس وقت یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ صنعتی ڈھانچے کو حکومتی کنٹرول میں لا کر ترقی دیں۔ اسی بنیاد پر انہوں نے نیشنلائزیشن کا راستہ اختیار کیا۔ شہید بھٹو کی اس پالیسی کی وجوہ ان کی اس تقریر میں کھل کر سامنے آئی ہیں جو انہوں نے 15 ستمبر 1972ء کو کراچی چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری میں کی تھی۔ یہ تقریر ان دنوں میں کی گئی جب مشرقی پاکستان اپنی سرمایہ داروں اور تاجروں کے رویّہ کے نتیجے میں ہم سے جدا ہوا تھا جو انہوں نے بیوروکریسی' جاگیرداروں اور ملاؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے فاشسٹ بنیاد پر اختیار کیا تھا۔ شہید بھٹو کے لئے اب مصیبت یہ تھی کہ یا تو ان سرمایہ داروں اور تاجروں کو کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر آگے چلائیں یا پھر ان کا مکمل خاتمہ کر دیں لیکن پاکستان کے سماجی اور معاشی ڈھانچے میں صرف سرمایہ داروں کا خاتمہ کر دینا کوئی مکمل اقدام نہ ہوتا۔ بیوروکریسی' جاگیرداروں اور بنیاد پرستی کے فاشسٹ کارندے مولویوں کے ہوتے ہوئے اس سے کیا فرق پڑتا؟ اور ان طاقتوں کا بیک وقت خاتمہ کرنے کے لئے پیپلز پارٹی کے پاس کوئی تنظیمی قوت موجود نہیں تھی۔ اس لئے بھٹو ایک طرف تو ان سرمایہ داروں کو یہ دھمکی دیتے تھے کہ بیرونی ممالک میں رکھا ہوا اپنا سرمایہ واپس لے آؤ اور دوسری یہ ترغیب بھی دیتے تھے کہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر سرمایہ کاری کرو تاکہ ملکی معیشت کو سنبھالا دیا جا سکے۔ 15 ستمبر 1972ء کو جو تقریر شہید بھٹو نے کراچی چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری میں کی اس میں کہا تھا۔ "ہمارے سر پر دفاعی اخراجات کا بھاری بوجھ ہے..... پاکستان کے خیر خواہ جو چاہتے ہیں کہ ہم ترقی کریں وہ بھی بڑے بھدے سوال کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ ملکی ترقی اور دفاع کا یک لخت بندوبست کیسے کر لو گے؟ اور ان دونوں امور کے تقاضے پورے کرو گے تو پھر عوام کے مسائل کیسے حل کرو گے؟

اور ہم انہیں یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ایک دہری مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم دفاع کے اخراجات کو کمی کی طرف تولانا چاہتے ہیں اور یقینی وجوہ کی بناء پر یہ اخراجات کم کرنا چاہتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ ایک راستہ پر چل کر ایسا کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ہم ایک قابلِ تسلیم تصفیہ تک پہنچ جائیں تو ان اخراجات کو کم کر سکیں جب ایک نئی صورتحال پیدا ہو جائے گی تو اس کے بعد ہم اپنے دفاعی اخراجات پر از سرِ نو غور بھی

www.bhutto.org

کریں گے لیکن اس وقت جب ہم نئی صورتحال پیدا کرنے کیلئے کوشش کرتے ہیں تو پھر ایک شور مچایا جاتا ہے اور چیخ وپکار کی جاتی ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ ملکی مفاد کے ساتھ دغا کر دیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسی عظیم دغابازی کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہم کیسا بھی تصفیہ کریں خواہ یہ بہترین تجزیہ بھی ہو' ممائدین کے ایک جتھے کی پرانی عادتوں کی بنیاد پر اس تصفیئے کی مخالفت ہونے لگتی ہے۔ میں اس وقت تصفیئے کیلئے باوقار تصفیہ کا لفظ استعمال نہیں کروں گا کیونکہ برصغیر میں یہ لفظ ضرورت سے زیادہ ہی استعمال ہوا ہے اور صرف بے عزتی اور بے وقاری لانے کیلئے استعمال ہوا ہے۔"

اپنی اس تقریر میں شہید بھٹو نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ دفاعی اخراجات کا بوجھ کم کرنے کیلئے بھارت کے ساتھ تصفیہ کرنا پڑتا ہے لیکن جب بھی یہ تصفیہ کرنے لگتا ہوں تو کچھ عناصر روز بروز استعمال ہونے والی لفاظی کا سہارا لے کر لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں تاکہ انہیں اپنے ہی جذبات کے اشتعال کے ذریعے گمراہ کیا جائے۔ اسی تقریر میں انہوں نے صنعتکاروں اور تاجروں کے سامنے شملہ معاہدہ کی تشریح کی تاکہ ان کو یہ سمجھایا جاسکے کہ ملک کے اقتصادی بحران کی نوعیت کیا ہے؟ لیکن اس دولت پرست طبقے کی پالیسی یہ تھی کہ وطن کا نام صرف بھٹو کے خلاف نعرہ بازی کیلئے استعمال کیا جائے جبکہ اندر سے "وطن" کا تصور تک ذہن سے نکال دیا جائے کیونکہ سامراجی صنعتوں کا مال فروخت کرنے والے مڈل کلاس کی کوئی وطن پرستی نہیں ہوتی اور وہ بدلتی ہوئی منڈیوں میں اپنے بنک اکاؤنٹ بھی تبدیل کرتی رہتی ہے۔ مرکنٹائل طبقے کی سوچ کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ اسی اجلاس میں چیمبرز کے سربراہ نے جو استقبالیہ تقریر کی اس میں کبھی تو شملہ معاہدے کے بارے میں صدر بھٹو سے وضاحتیں طلب کیں اور کبھی یہ پوچھا کہ ہاکی کے ٹورنامنٹ میں پاکستانی کھلاڑیوں نے جرمنی کے کھلاڑیوں پر جو حملہ کیا تھا اس میں پاکستانی کھلاڑیوں کو قصوروار کیوں ٹھہرایا گیا ہے؟ جس کے جواب میں شہید بھٹو نے کہا کہ پاکستانی کھلاڑیوں نے تو جرمنی کا جھنڈا بھی پھاڑ دیا تھا جبکہ ملکی جھنڈا ایک مقدس علامت ہوتا ہے اس لئے مجھے جرمنی سے معافی مانگنی پڑی۔ اس حوالے سے شہید بھٹو نے ایک مثال دیتے ہوئے کہا کہ جب چین کے وزیراعظم چواین لائی پاکستان آئے تو ہم ایک ٹیکنیکل مل کی طرف سے منعقدہ تقریب میں گئے تھے جہاں چین اور پاکستان کے کاغذ کے بنے ہوئے جھنڈوں میں سے ایک جھنڈا زمین پر گرا ہوا تھا۔ چواین لائی نے اسے زمین سے اٹھایا اور صاف کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ شہید بھٹو نے کہا کہ سیاست 'اقتصادیات' تعلیم اور کھیلوں کا ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور سوویت یونین نے جہاں اقتصادی ترقی کی وہاں اپنے کھیلوں اور تعلیم کو بھی ترقی دی۔ اس لئے ہمیں بھی یورپی اسٹینڈرڈ میں ڈھلنے کی بجائے ایشیائی اولمپک کو ترقی دینی ہوگی۔ آپ دیکھیں کہ یورپی اولمپک میں چین نے حصہ نہیں لیا۔ ہم اگر اولمپک کے یورپی اسٹینڈرڈ پر چلتے رہے تو ترقی نہیں کر سکیں گے۔

www.bhutto.org

شہید بھٹو کی ان باتوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ پاکستانی سرمایہ دار اور تاجر 1972ء میں کیا سوچ رہے تھے اور صدر بھٹو کن مشکلات سے دوچار تھے۔

استقبالیہ تقریر میں جب مخلوط معیشت اور نیشنلائزیشن کا سوال اٹھایا گیا تو شہید بھٹو نے کہا "ہم نے حال ہی میں پاکستان میں جمہوریت کو متعارف کروایا ہے یا آپ یوں کہہ لیجئے کہ از سر نو متعارف کروایا ہے۔ جمہوریت بڑا نازک پودا ہے اس کی نشوونما ہونی چاہئے۔ اس کی جڑیں پھیلنی چاہئیں اور ہمیں اس کو کامیاب بنانے کیلئے مل کر کام کرنا چاہئے۔ ہم اس مقصد کو ترقی دینے کیلئے مخلصانہ کوششیں کر رہے ہیں لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں نے شروع میں کہہ دیا تھا کہ مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ میں اتنا رجائیت پسند نہیں ہوں جتنا کہ دوسرے لوگ ہوتے ہیں اگر یہ تجربہ کامیاب نہ ہوا تو پھر جو نتائج نکلیں گے میں ان کا بھی پورا شعور رکھتا ہوں۔ مجھے ان نتائج کا یقین ہے' یہ نتائج کیا ہوں گے۔ یہ خوف ناک نتائج ہوں گے۔ اس لئے ہم پورے خلوص سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ جمہوریت کا تجربہ کامیاب ہو جائے اور ہم مل کر آگے بڑھیں۔ اگر جمہوریت کا تجربہ ہماری سرحد کے پار بھارت میں اپنے الٹ پلٹ طریقے سے کامیاب ہو سکتا ہے تو چلو ٹھیک ہے لیکن پھر یہ سرحد کے اس طرف ہمارے ملک میں اسی الٹے پلٹے انداز سے کامیاب کیوں نہیں ہو سکتا؟

ہم برطانوی پارلیمینٹ کو تو ماڈل نہیں بنا سکتے جبکہ برطانوی پارلیمینٹ کا ماڈل وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ گھستا جا رہا ہے اور زوال پذیر ہو رہا ہے۔ ہم امریکی سانچے کو بھی حاصل نہیں کر سکتے...... دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنوں نے بہت ترقی کی ہے اور ایک جمہوری بندوبست کر لیا ہے۔ ہمارے لئے کوئی جمہوری بندوبست کیوں نہیں چل سکتا؟ ہمارا جمہوری نظام ویسٹ منسٹر انداز کا نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ ایسا ہونا چاہئے جو ہمارے حالات کے مطابق ہو۔ ایک ایسا سسٹم ہونا چاہئے جس میں ہم زندہ رہ سکیں اور کامیابی سے آگے بڑھ سکیں۔ اس کے دوسرے نعم البدل میری نظر میں بہت ہی ہیبت ناک ہیں۔ ہاں ہمارے ہاں پارلیمانی نظام ہونا چاہئے۔ میں صدارتی نظام نہیں کہوں گا جو ناکام ہو چکا ہے۔ برصغیر میں پارلیمانی سسٹم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں 'قدم بہ قدم' منٹو مارلے اصلاحات کے دور سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اب یہ جاننے اور سیکھنے کا وقت ہے کہ اس کا انتظام و انصرام کیسے کیا جائے؟"

شہید بھٹو نے اس موقع پر مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا "پاکستان کا جمہوری نظام انڈیا کے جمہوری نظام سے ملتا جلتا ہوگا اور یہی میرے حقیقت پسندانہ انتظامات ہوں گے جو اس نظام کو قائم اور باقی رکھنے کی نوعیت کے ہوں گے ہم ویسٹ منسٹر سسٹم کو اختیار نہیں کر سکتے۔" شہید بھٹو نے کہا کہ "برطانیہ میں کیا آئین موجود ہے؟ اگرچہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 1931ء کا ایکٹ آف ویسٹ منسٹر ایک تحریری قانون ہے لیکن کیا یہ 1931ء کا ویسٹ منسٹر ایکٹ اور برطانوی قانون علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں..... بہر حال یہ برطانوی سسٹم ہے اور برطانوی سسٹم اپنے حالات میں بنایا گیا ہے۔"

www.bhutto.org

شہید بھٹو نے اس تقریر میں وضاحت کرتے ہوئے مثال دے کر کہا "ایشیا ' مشرقی یورپ ' مغربی یورپ کے کچھ حصوں ' افریقہ اور دیگر ممالک میں ' جن کے ساتھ ہم بہت سی نسبتیں اور عزیز داریاں رکھتے ہیں وہ ہم سے زیادہ قریب ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے اقتصادی حالات اور خصوصی طور پر ان کے سماجی حالات اور ان کے مختلف الاوصاف عناصر ملتے جلتے ہیں ' اس حقیقت نے بھی دونوں کو زیادہ برمحل بنایا اور دونوں میں مناسبت پیدا کی ہے کہ ایشیا اور افریقہ دونوں نے کالونیل ازم (نو آبادیت) کے ابتلاء کو برداشت کیا ہے اگر ہم لارڈ ایکٹن کو متن سے کاٹ کر پیش کرنے کی بجائے مذکورہ بالا پہلوؤں کو شمار میں رکھیں تو ہم ایک اپنا نظام بنا سکتے ہیں اگر پاکستان بھی ایک ایسا سامراجی ملک ہوتا جو دوسرے ملکوں کے وسائل پر جی رہا ہوتا تو ہم بھی برطانوی نظام اپنا لیتے..... برطانیہ نے دوسرے ملکوں کے وسائل لوٹ کر اپنا نظام بنانے کی عیاشی کر لی تھی جو ان کے فوائد پر قائم ہوا اور ان مخصوص حالات میں لارڈ ایکٹن نے وہ ماسٹر پیس پیدا کر دیئے تھے جن کے حوالے ہمارے وکلاء اگرچہ بڑے ہی چٹخارے اور ذائقے سے دیتے ہیں لیکن بہت ہی مختلف حالات ' مختلف معاشرے اور مختلف وقت پر۔ ہمیں ان سوچوں کے بارے میں تغافل شعار نہیں ہونا چاہئے۔"

شہید بھٹو نے اس اجلاس میں پاکستانی سرمایہ داروں اور تاجروں کو جو سبق اپنے نظریاتی موقف سے پڑھانا چاہا تھا وہ اگر ان دولت پرستوں نے سیکھنا ہوتا تو وہ اپنے سرمائے کو نکال کر سوئٹزرلینڈ ' انگلینڈ اور امریکہ جیسے ملکوں کے بنکوں میں نہ پھینکتے لیکن پاکستان کے امیر طبقوں میں نیشنل ازم کی کوئی سوچ موجود نہیں تھی اس لئے انہوں نے 1972ء میں ہی یہ سازشیں شروع کر دی تھیں کہ بھٹو حکومت کو ختم کر دیا جائے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ ملتا ہے کہ انہوں نے تھوڑے ہی عرصے بعد کبھی قادیانیوں کے حوالے سے فسادات شروع کروا دیئے ' کبھی شیعہ سنی فسادات کروائے اور بلوچستان کے سرداروں کا قبائلی نظام ختم کرنے کیلئے جب شہید بھٹو نے پہلا قدم اٹھایا تو بلوچستان کے نام نہاد قوم پرست کمیونسٹ بھی سرداری سوچ پر عمل کرنے لگے۔ ایک طرف عطاء اللہ مینگل جیسے لوگوں نے قبائلی لشکر کشی کر کے وفاقی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی تو دوسری طرف خان عبدالولی خان جیسے نام نہاد قوم پرست نے ان کا ساتھ دیا۔ تیسری طرف جنرل ضیاء الحق نے اپنے فوجی اختیارات استعمال کرتے ہوئے بلوچستان پر اس لئے فوج کشی کر دی کہ قبائلی سرداروں نے بھٹو کے ساتھ جو تضاد پیدا کیا ہے وہ حل نہ ہو جائے۔ قومیتوں کے مسئلہ کو مزدور طبقے کی قیادت میں حل کرنے کی بجائے سرداری قیادت میں چلانے کا مقصد دراصل یہ تھا کہ مظلوم قومیتوں کو حقوق دلانے کی بجائے بھٹو حکومت کے خلاف استعمال کیا جائے۔ اس سازش میں دولت مندوں نے ایک طرف تو مظلوم قومیتوں کو گالیاں دیں اور دوسری طرف بھٹو شہید کو گالیاں دیں اور آخر کار یہ حقیقت پوری قوم کے سامنے آ گئی کہ ملاؤں کی قیادت میں جو پی این اے 1977ء کے انتخابات کیلئے بھٹو کے مقابلے میں کھڑی کی گئی اس کو بھی ان دولت مند طبقوں نے بوریاں بھر بھر کے

www.bhutto.org

رقومات پیش کیں اور امریکہ نے ڈالر بھی اتنی تعداد میں پی ایل اے کے سپرد کئے کہ پاکستان میں ڈالر کی قیمت آدھی رہ گئی۔

سرمایہ داروں اور تاجروں نے یہ ملک دشمن پالیسی اس لئے اختیار کی کہ انہوں نے مشرقی پاکستان میں اپنے ملٹری ایکشن سے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا بلکہ باقی پاکستان کے مظلوم طبقوں اور مظلوم قومیتوں کے خلاف بھی ملٹری ایکشن کرنے کا راستہ ہی اختیار کیا اور تب سے اب تک یہ دولت پرست طبقے بیوروکریسی ' مُلّا اور جاگیردار لارڈ ایکٹن کے بنائے ہوئے برطانوی ویسٹ منسٹرا یکٹ کے غلام بن کر ہی چلنا چاہتے ہیں۔ اس جرم میں ان سرمایہ داروں ' جاگیرداروں اور تاجروں کے وہ بیٹے اور بیٹیاں کرائے کے دانشوروں کا کردار ادا کرتے ہیں جو مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں سے پڑھ کر آتے ہیں اور لفظ تو مارکسزم کا بولتے ہیں لیکن عمل سامراجیوں کا دوہراتے ہیں۔ اس لئے ان کو وہ آئیڈیل قطعاً پسند نہیں آتے جن میں شہید بھٹو افریقہ اور پاکستان کے غریب عوام کو ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں۔

سرمایہ داروں اور تاجروں کے مذکورہ اجلاس میں شہید بھٹو نے واضح طور پر کہہ دیا کہ " میں تو موجودہ اسمبلی کو آئین ساز اسمبلی بنانا چاہتا ہوں لیکن حزبِ اختلاف یہ طریقہ نہیں چاہتی اور اسمبلی کو دوغلا کردار دینا چاہتی ہے جبکہ ہم نے 1947ء سے 1954ء تک یہ دوغلا کردار دیکھ لیا تھا جس میں اسمبلی کے اس کردار کو آئین سازی میں تاخیر کرنے کیلئے استعمال کیا گیا تھا۔ میں نے سرِعام لوگوں سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں 23/مارچ تک آئین چاہتا ہوں اور زیادہ سے زیادہ 21 اپریل تک چاہتا ہوں بلکہ میں تو یہ بھی چاہتا ہوں کہ اسے کل تک تشکیل دے دیا جائے کیونکہ ملک کو حقیقی استحکام آئین ہی دے سکتا ہے۔ "

آج 1990ء میں جوان ہونے والی نسلیں اس حقیقت سے تو واقف ہوں گی کہ اپوزیشن نے جب یہ دیکھا کہ بھٹو تو ہر قیمت پر آئین بنا کر نافذ کر دیں گے تو ان مارشل لاء پرست مُلّاؤں اور دولت پرستوں نے آئین کی تشکیل کے دوران ہی ایجی ٹیشن اور بیان بازی شروع کر دی اور سب سے زیادہ مخالفت اس نکتے کی کی کہ آئین میں سوشلزم کو رائج کرنے کا ذکر تک نہیں کیا جائے گا۔

صوبائی خود مختاری کے موضوع پر بات کرتے ہوئے ' اسی تقریر میں شہید بھٹو نے کہا کہ " میں مکمل صوبائی خود مختاری پر ایمان رکھتا ہوں اور میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مضبوط مرکز ایک غاصب مرکز کی صورت میں قائم کیا جائے میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ مضبوط مرکز اس کی طرح قائم کر دیا جائے جس کے نیچے گھاس بھی نہیں اُگ سکتی۔ عوام کو مضبوط مرکز کے اس لفظ سے دھوکہ دیا گیا ہے۔ میں نے یہ بات ہمیشہ کہی ہے کہ ہمیں مضبوط مرکز کی جگہ ایک تاثیر اور استعداد رکھنے والا مرکز چاہیے۔ میں پاکستان کے وسیع تر مفاد کیلئے پوری ایمانداری کے ساتھ اسی موقف پر قائم ہوں۔ "

ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستان کے استحصالی طبقے با تاثیر اور مستعد مرکز کے معانی ہی سمجھنے کو تیار نہیں کیونکہ ان کی اپنی نفسیات " مائٹ از رائٹ " کے اس قانون پر عمل کرتی ہے جسے دنیا بھر کے انسان دوست

www.bhutto.org

ماہرینِ نفسیات اور ماہرینِ سوشیالوجی درندوں کا قانون یا جنگل کا قانون کہتے ہیں اور اس کیلئے "لاء آف نیچر" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جس کا مطلب ہی درندوں کا قانون ہے جس کے تحت بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاجاتی ہے۔ پاکستانی سرمایہ داروں اور تاجروں کی پرورش دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوئی ہے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے تمام بڑے سرمایہ داروں نے ہٹلر کے فاشزم کی ذہنی لائن ہی اپنا رکھی ہے کیونکہ ہٹلر کو خود جرمنی اور اٹلی کے بڑے سرمایہ داروں نے ہی قیادت دی تھی اور انہوں نے ہی باقی دنیا کے سرمایہ داروں کے ساتھ ہٹلر کی قیادت میں عالمی منڈیاں چھیننے کیلئے وہ لڑائیاں لڑی تھیں جسے دوسری جنگِ عظیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگِ عظیم میں برطانیہ اور امریکہ کے جو سرمایہ دار آگے بڑھے اور جنھوں نے پاکستان کے سرمایہ داروں اور تاجروں کو اپنے زیر اثر کیا وہ خود بھی فاشزم کی پالیسیوں پر عمل کرتے رہے اور اپنے ملکوں کو صرف ووٹ تک محدود ادھوری جمہوریت دیتے رہے جس میں ثقافتی جمہوریت اور اقتصادی جمہوریت کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ پاکستانی سرمایہ دار 'تاجر' جاگیردار' افسر اور ملاّ ان برطانوی اور امریکی سرمایہ داروں کے شاگرد تھے اس لئے وہ شہید بھٹو کی جمہوریت کو قبول ہی نہیں کر سکتے تھے۔

دوسری طرف پاکستان کے کیمونسٹ بھی اسٹالن کے نظریات پر عمل کر رہے تھے اور اسٹالن نے بھی سوشلزم کے نام پر پیدا ہونے والے اس نظام کو ریاستی فاشزم بنادیا تھا جو ابھی بچپن کی عمر میں تھا۔ بھٹو شہید کا تہذیبی وثقافتی سوشلزم جو مارکس کی تھیوری آف ایلینیشن (نظریہ ءبیگانگی) سے قریب تھا اسٹالن ازم کے پرچارک پاکستانی کیمونسٹوں کو قطعاً قبول نہیں تھا۔ اسٹالن نے چونکہ امریکی اور یورپی سرمایہ داروں کا ساتھ دیا تھا اس لئے امریکہ اور یورپ نے جب لیمیٹڈ کمپنیوں کے تحت چلنے والی سرمایہ دار کمپنیوں کا فاشزم پھیلایا تو ان کے ساتھی اسٹالن نے امریکی صدر روز ویلٹ کے ساتھ مارکسسٹ لیننسٹ سوشلزم پر عمل کرنے والی تنظیم تھرڈ انٹرنیشنل کو ختم کرنے کا معاہدہ کر لیا اور سوویت یونین میں سٹیٹ فاشزم شروع کر دیا۔ پاکستانی کیمونسٹ اسٹالن کے اس نظریئے کو مقدس فرمان سمجھ کر مانتے رہے اور شہید بھٹو کے ثقافتی سوشلزم کی مخالفت میں پٹھان 'بلوچ سرداروں' پنجابی جاگیرداروں اور مڈل کلاس کے فاشسٹ اشتراکیوں کی لائن پر چلتے رہے اس لئے شہید بھٹو کو دوہری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مشکلات کا اندازہ شہید بھٹو کو پہلے ہی ہو چکا تھا اس لئے وہ ملکی معیشت کو مستحکم کرنے اور محنت کش طبقوں کو خوشحال سیاسی اور ثقافتی لیڈر بنانے کی تحریک چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس مقصد کیلئے 15 ستمبر 1972ء کو کراچی چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری میں اپنی تقریر میں شہید بھٹو نے مزدور اور انتظامیہ کے تعلقات اور زرعی اصلاحات کے بارے میں اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"آج ہر کوئی ایک بینڈ ویگن پر سوار ہو کر اس مارچ میں مصروف ہے جو کسی بھی منزل پر نہیں پہنچے گی بلکہ اس سے قوم کی توانائیاں منتشر ہو کر ضائع ہو جائیں گی۔ مزدور اور انتظامیہ کو بھی پوری ملکی صورتحال کی

www.bhutto.org

روشنی میں سمجھنا چاہئے۔ نفسیاتی اور سیاسی عوامل' ملکی حالات اور عوام کے مزاج کے تناظر میں سمجھنا چاہئے۔ ہمیں مختلف قوتوں کے پیچیدہ باہمی عمل کو ضرورت سے زیادہ سادہ بنا کر نہیں سمجھنا چاہئے۔ جب میں یہ بات کر رہا ہوں تو میں مزدور کے ساتھ بھی کر رہا ہوں اور انتظامیہ کے ساتھ بھی۔ اس وقت ہمارے ملک میں تکلیف یہ ہے کہ لوگ ہاکی کے کھلاڑیوں کی طرح بد سلوکی کر رہے ہیں اور کبھی بیوقوفی سے ایک حرکت کرتے ہیں تو کبھی دوسری کرتے ہیں۔ نہ تو مزدور پوری طرح تاریخی عمل ( ) کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی انتظامیہ سمجھتی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ریڈیو اور ٹیلیویژن پر طبقاتی نفرت کا پرچار کیا جاتا ہے اور اس طبقاتی نفرت کو ختم کرنا چاہئے۔ چلو ٹھیک ہے ہم طبقاتی نفرت کو ملکی ریڈیو اور ٹیلیویژن سے ختم کر دیتے ہیں لیکن کیا بین الاقوامی فضاء آپ پر جھا ڑو نہیں پھیر دے گی؟ کیا آپ دوسرے ملکوں کے ریڈیو نہیں سنیں گے؟ کیا آپ غیر ملکی ریڈیو کا پروپیگنڈہ نہیں سنیں گے؟ کیا آپ غیر ملکی ریڈیو کے اصولوں کی تعلیم نہیں سنیں گے۔"

شہید بھٹو نے سرمایہ داروں کے بارے میں اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"1958ء کی زرعی اصلاحات ہونی چاہئیں اور یہ جھگڑا بھی ڈالا گیا تھا کہ جب تک زرعی اصلاحات نہیں ہوں گی تب تک ملک ترقی نہیں کر سکے گا کیونکہ جاگیردار وہ جونکیں ہیں جو ملک کا خون چوس رہی ہیں۔ ان دنوں سارے جاگیردار مشتعل ہو گئے تھے اور انہوں نے یہی بات کہی تھی کہ ان کے خلاف طبقاتی نفرت پھیلائی جا رہی ہے۔ اس وقت اسی بیچ لگژری ہوٹل میں' میں اسی ترجیحی موضوع پر آپ کے چیمبر کی تقریریں سنا کرتا تھا۔ آپ اپنے کاموں کو بھی دیکھیں کہ آپ زمینداروں اور وڈیروں پر کیا تنقید کرتے تھے اور زرعی اصلاحات کی بات آپ نے ہی شروع کی تھی اس وقت یہ بات آپ کے مفاد کیلئے موزوں تھی لیکن آپ بھی تو طبقاتی نفرت پھیلا رہے تھے۔ اب تاریخ آگے تک بڑھ گئی ہے اور ہم نے پوری طرح تو نہیں کسی حد تک جاگیرداری کے ساتھ بھی نمٹ لیا ہے۔ اب ہم ان نئی قوتوں کی طرف آئے ہیں جو ابھرتی ہوئی سرمایہ داری کے ساتھ نمٹ رہی ہیں۔ جب سرمایہ داری پر دباؤ پڑتا ہے تو آپ اعصابی ہیجان میں آ جاتے ہو اور کہتے ہو ملک میں طبقاتی نفرت پیدا کی جا رہی ہے۔ آپ لوگوں کو یہ بات لازماً محسوس کرنی چاہئے کہ آپ ایشیا میں رہ رہے ہیں جس میں ایک ہولناک شورش اور افراتفری پیدا ہو چکی ہے۔ ایسی شورش آپ کو اپنے راستے اور تسلی کیلئے نہیں مل سکتی۔ ایشیا ہولناک عوامی ابھاروں سے گذر رہا ہے آپ یا تو ان ابھاروں کے اوپر تیرتے چلے جائیں یا پھر یہ آپ کو بہا کر لے جائیں گے۔ ان سے چھٹکارا حاصل کرنا اور بچ کر نکل جانا ممکن نہیں ہے۔ یورپ اس قسم کے دور سے گذر چکا ہے اور اب یہ دور ایشیا میں آ گیا ہے۔

ایشیا میں اس سے بھی بڑا تغیر ابھرے گا۔ ہماری آبادی بہت زیادہ ہے اور وسائل کم ہیں' ٹیکنالوجی گھٹیا ہے۔ ایشیا کو یہ فائدہ نہیں مل سکا کہ وہ یورپ کا استحصال اسی طرح کر لے جس طرح یورپ نے

www.bhutto.org

ایشیا کا کیا ہے لہٰذا آپ کیلئے لازم ہے کہ آپ وقت کا موڈ سمجھ لیں' غیر ضروری طور پر گھبرانا اور چونکنا نہیں چاہئے۔ آپ کوئی مستقل حرم یا درگاہ تو حاصل نہیں کر سکتے کوئی بھی شخص آپ کو ایسی درگاہ مہیا نہیں کر سکتا۔ یہ غلطی میرے پیشرو کر چکے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں تھے کہ تاریخ کے بہاؤ کا احاطہ کر سکتے۔ میں بے تکلفی سے اور کھلم کھلا آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب آپ لوگوں کو نئی جگہ بنانی پڑے گی۔ فرانس میں انقلاب آیا تھا' روس میں انقلاب آیا' چین میں انقلاب آیا' بہت سے انقلاب آئے' میں تخت الٹنے کی بات نہیں کر رہا' معاشرہ اب بھی زندہ ہے بلکہ پہلے سے آگے بڑھ گیا ہے۔ سوویت یونین میں اصل کمیونسٹ انقلاب آیا تھا جب لینن نے اقتدار سنبھالا تو کیا ہوا تھا اگر آپ گہرائی سے مطالعہ کریں تو آپ حقائق کو جان جائیں گے۔ سوویت یونین کے انقلاب کے دنوں میں زار شاہی روس میں ایک امریکی ڈاکٹر بھی رہتا تھا جو زخمیوں اور بیماروں کی مرہم پٹی اور علاج کیلئے وہاں پر ہی موجود رہا۔ وہ لوگوں کو ہسپتال میں لے جاتا اور ان کی نگہداشت کرتا رہا۔ لینن کی توجہ اس ڈاکٹر کے کام کی طرف دلائی گئی تو لینن نے اسے بلایا۔ اس نے لینن سے کہا کہ "میں ایک فری انٹر پرائز قائم کرنا چاہتا ہوں۔" لینن نے اسے کہا کہ "وہ اپنی سکیم بنا کر دے" تو اس نے کہا کہ "میں پنسلوں کی ایک فیکٹری لگانا چاہتا ہوں۔" لینن نے پوچھا "آپ پنسل کی فیکٹری کیوں لگانا چاہتے ہیں؟" تو ڈاکٹر نے جواب دیا کہ "میں سوویت یونین میں پنسلوں کی فیکٹری اس لئے لگانا چاہتا ہوں کہ لینن کو ہر شخص کو تعلیم دینی پڑے گی۔" اور یہ ڈاکٹر لکھ پتی ہو گیا۔ وہ آج بھی زندہ ہے اب اس کا تیل کا بہت بڑا کاروبار ہے لیکن سوویت یونین میں نہیں ہے۔"

انقلابوں کے حوالے سے سرمایہ داروں اور تاجروں کو ایک اور سبق پڑھاتے ہوئے اس تقریر میں شہید بھٹو نے کہا "چین میں انقلاب کے بعد کیا ہوا تھا؟ وہ لوگ جو بڑی بڑی ٹیکسٹائل ملوں کے مالک تھے ان کو انہی ملوں کے منیجر بنا دیا گیا تھا اور انہیں خصوصی مراعات اور حقوق دیئے گئے تھے۔ میں جب 1963ء میں چین گیا تھا تو میری ملاقات شنگھائی میں ٹیکسٹائل مل کے ایک سابق مالک سے کروائی گئی تھی یہ شخص ایک بڑی ٹیکسٹائل مل میں اس وقت بھی ایک مراعات یافتہ منیجر تھا۔ بات یہ ہے کہ آپ اپنی ذہانت اور محنت کے علاوہ سب کچھ نیشنلائز کر سکتے ہیں۔ سوشلزم لانے کیلئے آپ کو ایک سوشلسٹ بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاکستان میں ابھی سوشلسٹ بنیاد موجود نہیں ہے۔ یہ بنیاد بنانے کیلئے پاکستان کو کچھ وقت چاہئے۔ جب تمام ذرائع پیداوار اور تقسیم پیداوار مملکت کی نگرانی میں آ جائیں۔ اس وقت تک میں یہ کام نہیں کر سکوں گا خواہ میں کل بھی اس کی کوشش کروں لیکن وہ لوگ جنہوں نے چند کتابیں پڑھ لی ہیں یا کچھ جریدوں کے جائزے پڑھ لئے ہیں یا اپنے کسی دوست سے کوئی کوٹیشن سن لی ہے وہ جدلیاتی طریقہ کار کے بارے میں باتیں کرنے لگے ہیں۔ ہم جدلیاتی طریق کار جانتے ہیں۔ ہم حقیقت پسند صورت میں سوشلزم کے ساتھ وابستہ ہو کر اس کے پابند ہوئے ہیں اور اس کی عملی شکل میں ہوئے ہیں۔"

پاکستانی سوشلسٹوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اسی تقریر میں شہید بھٹو نے کہا کہ "1969ء میں

www.bhutto.org

جب ایوب خان کی حکومت ختم ہو گئی' ہمارے ان چند دوستوں کا خیال تھا کہ انقلاب تو ساتھ والے گوشے میں آ گیا ہے۔ انہوں نے چاہا کہ صورتحال کے اس ارتقاء کا تصور ہم پر تھوپ دیں جو ان کا اپنا تھا۔ ہم نے انہیں کہا کہ آپ غلطی کر رہے ہو اور وہ خوفناک حد تک غلطی تھی۔ انقلاب ساتھ والے گوشے میں نہیں تھا' انقلاب بہت وقت لے گا۔ آپ تاریخ کے راستے کو مختصر نہیں کر سکتے۔ ہم آخری منزل پر پہنچنے کے پابند ہیں۔ اس معاملے میں قطعاً میں کوئی انکار نہیں کرتا اور یہ بات میں آپ کو بتا رہا ہوں' اگرچہ آپ تاجر ہیں' ہم اس منزل تک جانے کے پابند ہیں لیکن اس کی طرف جانے والی سڑک بہت لمبی ہے۔ جب تک اس لمبی سڑک کا راستہ طے نہیں ہوتا آپ کو ایک ایک موقع اور ایک ایک لمحے کو گرفت میں لینا ہو گا۔

آپ حقیقت پسندانہ صورتحال اور حقیقت پسندانہ عوامل پر غور کریں۔ میں نے صرف سوویت یونین اور چین کا مثالوں کے طور پر حوالہ دیا ہے۔ آپ یوگوسلاویہ' رومانیہ' پولینڈ اور چیکوسلواکیہ پر بھی نظر ڈالیں۔ وہ ابھی سوشلسٹ مملکتیں ہیں اور انتہائی صورت میں سوشلسٹ ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ سوشلزم کو متعارف کرنے سے آسمان گر پڑے گا اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کل کو کوئی قیامت آ رہی ہے تو پھر میں کوئی مدد نہیں کر سکتا' نہ ہی میری تقریریں اور نہ ہی میری ریڈیو پر گفتگو کچھ کر سکتی ہے۔ میں نے آپ کو یقین بھی دلایا ہے کہ جب تک ہماری آخری منزل نہیں آتی' جس پر پہنچنے کا ہم نے تہیہ کر رکھا ہے اور جو انشاءاللہ آئے گی۔ تب تک آپ کے پاس ہمارے ساتھ شامل رہنے کیلئے آئندہ وقت کی کافی وسعت موجود ہے۔ استحکام کی پہلی صورت میں ہم نے کچھ اقدامات کئے ہیں جو وقتی طور پر کافی ہیں اور اس مستقبل کیلئے بھی کافی ہیں جس کی پیش بینی کی جا سکتی ہے۔ اگر ہمیں دوسری باری بھی مل گئی تو صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کی بنیاد کو اور زیادہ وسیع کریں گے۔ میں آپ کو یہ بار بار نہیں بتاتا رہوں گا آپ صرف افواہیں سنتے ہیں' کہانیاں سنتے ہیں اور آپ کا دل ڈوبنے لگ جاتا ہے۔ یہ افواہوں کی دھرتی ہے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہر روز کوئی افواہ سننے کے بغیر پاکستان میں رہا جا سکے۔ آپ افواہوں کے ساتھ نہ جائیں۔ آپ نے یہ افواہ بھی سنی کہ ہم شپنگ' ٹیکسٹائل' پیپر اور شوگر انڈسٹریز کو نیشنلائز کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ بات افواہ سے کچھ زیادہ تھا' اس میں کچھ سچائی بھی تھی اور سچائی یہ ہے کہ حکومت نااہل اور نالائقی کے الزامات لینے نہیں جا رہی۔ یہ نااہل اور نالائق حکومت نہیں ہے' ہم جو کچھ کرنے لگے تھے اس کی کچھ وجوہ تھیں۔ ہمیں کچھ اطلاعات دی گئی تھیں کہ تاجر برادری ہم پر جوابی ضرب لگانا چاہتی ہے اور ضرب یہ تھی کہ پیداوار کی رفتار کم کر دی جائے۔ ہمیں نہیں پتہ کہ یہ اطلاع غلط تھی یا درست تھی اس لئے ہمیں متبادل بندوبست تو کرنا ہی تھا۔

صنعتی سبوتاژ کو روکنے کے لئے ہم نے شوگر' ٹیکسٹائل' شپنگ اور پیپر انڈسٹری کو نیشنلائز کرنے کا حساب لگایا تھا .... اگر آپ لوگ ہمارے ساتھ بدسلوکی کریں گے تو ہم بے خبری میں مارے نہیں جانا چاہتے۔ ہمیں اس کے مقابلے کے لئے تیار رہنا ہو گا۔ اب یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے اگر آپ تعاون کرنا

www.bhutto.org

چاہتے ہیں تو ہم بھی تعاون کریں گے یہ مزدوروں کے مفاد میں ہے یہ ملک کے مفاد میں ہے اور تعاون ہر کسی کے مفاد میں ہے۔ ہم اس کو توڑنے کا ایک لفظ بھی نہیں کہتے لیکن ہم اپنی تیاری کے بغیر بھی نہیں رہیںگے۔ اس بات کا اطلاق "مڈل مین" پر بھی ہوتا ہے اور میں اس مڈل مین کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ خواہ وہ کاٹن جننگ مل کا مالک ہے' فلور مل کا مالک ہے خواہ چاول چھڑنے کی مل کا مالک ہے' اسے اقتصادی ترقی میں مدد دینی چاہئے۔ اگر مڈل مین سست پیداوار (گو سلو) اور بد سلوکی کرتا ہے تو ہم بھی تیار ہیں۔ ... ہم نے کاٹن جننگ ملوں' چاول چھڑنے کی ملوں اور دوسری ملوں کے لئے اپنے مقاصد کو متعین کر رکھا ہے اگر یہ مڈل مین تعاون کریں گے تو ہم ان کے خلاف کارروائی نہیں کریں گے۔ اب آپ لوگ آگے بڑھیں اور اپنا کام کریں اگر آپ صنعتیں لگانے کی منظوریاں لینا چاہتے ہیں تو یہ منظوریاں آپ کو ماضی کی نسبت اب بہت جلد مل جائیں گی۔ کنسور شیم کے ممالک سے قرضوں کا بہاؤ دوبارہ شروع ہو جائے گا ہم سوویت یونین اور چین سے امداد لے رہے ہیں۔ معیشت اپنے آپ کو نئی قوت دلوانے کے لیے تمام معروضی حالات رکھتی ہے۔ اس سال کے ختم ہونے سے پہلے ہی ہم نئے قرضوں کی کومٹ منٹیں حاصل کر لیں گے اور ہمیں امید ہے کہ ہم قرضوں پر یکطرفہ التوائے قرض کو باقاعدہ بنا لیں گے ہمارے ساتھ یہ عہد بھی کیا گیا ہے اور قرض دینے والوں نے یہ وعدے بھی کئے ہیں کہ پاکستانی روپے کی قیمت کم کرنے کے بعد وہ بہت سی نئی پیش قدمیاں کریں گے لہٰذا ہم نے روپے کی قدر کو وسیع سطح پر کم کر دیا ہے۔ ہم نے اپنا کردار ادا کر دیا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ باعزت قوتیں باعزت طریقے سے ہی اپنا کردار ادا کریں گی۔ ہم نے کسی سے تحریری وعدہ نہیں لیا..... ہم خیال بھی نہیں کر سکتے کہ عالمی بینک کے صدر ہمارے ملک میں آکر کچھ اور بات کر جائیں گے اور ہمارے ملک سے واپس جا کر کچھ اور کر دیں گے۔ ہمیں کھاد کی فیکٹری کی بہت شدید ضرورت ہے' ہمیں نیوز پرنٹ پلانٹ کی بھی ضرورت ہے' شوگر ملوں کی ضرورت ہے چمڑے کی صنعت' انجینئرنگ اور دیگر شعبوں میں سرمایہ کاری کی گنجائش موجود ہے اور ان صنعتوں کے لئے ہمیں غیر ملکی قرضوں کی ضرورت ہے۔ ان کاموں میں ہمیں کاروباری لوگوں کا تعاون چاہئے اگر آپ تعاون نہیں کریں گے تو ہم صرف آپ کی توانائیوں کو پرے ہٹا دیں گے۔ جہاں تک لیبر پرابلم کا تعلق ہے تو یہ مسئلہ آہستہ آہستہ حل ہو رہا ہے ہمیں اس مسئلے پر بہت سی مشکلات درپیش تھیں۔ مزدوروں کے ایجی ٹیشن سے تکلیف دہ صورتحال پیدا ہو چکی تھی لیکن ہم مزدوروں کے خلاف سخت رویہ اختیار نہیں کرنا چاہتے۔ یہ پاکستان کی پہلی حکومت ہے جو مزدوروں کی دوست ہے۔ اگر مزدور ایجی ٹیشن وغیرہ کرتے ہیں تو اس سے کوئی تکلیف پیدا نہیں ہوگی کیونکہ اس موقع پر مزدور اور انتظامیہ دونوں کے بنیادی مفادات نامناسب نہیں ہیں۔ میں آپ کو واضح طور پر بتا دوں کہ ہم مزدوروں کا ساتھ دیں گے..... میں چاہتا ہوں کہ آپ مزدوروں کے ساتھ ہم آہنگی کا رشتہ پیدا کریں۔ ہم اپنی طرف سے مزدوروں کے لئے جو بھی زیادہ سے زیادہ ہوا ضرور کریں گے۔ ماضی میں مزدور کے ساتھ بہت برا سلوک ہوتا رہا ہے' اس کا ظالمانہ

www.bhutto.org

استحصال ہوتا رہا ہے ہم ان حقائق سے انکار نہیں کر سکتے لیکن ہم مزدوروں کی خاطر بھی اس وقت تک کچھ زیادہ نہیں کر سکتے جب تک وہ پیداوار نہ بڑھائیں۔ اگر زیادہ دولت پیدا کی جائے گی تو اس کا زیادہ حصہ مزدور کو دیا جائے گا"

مزدوروں کے حقوق کی بات کرتے ہوئے شہید بھٹو نے کہا "ایک زیب تن نامی فیکٹری ہے جس کی انتظامیہ نے مزدوروں کے ساتھ بد سلوکی تو مزدوروں نے فیکٹری پر قبضہ کر لیا۔ انتظامیہ نے اس فیکٹری کو چلانے سے ہی انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فیکٹری بند ہو گئی' مزدور بھی ابتلاء میں آ گئے اور ان کی اجرتیں بند کر دی گئیں۔ ہماری معیشت تو آخری حاشیوں پر چلتی ہے کیونکہ ہمارے وسائل بھی محدود ہیں اور اجاروں کی قوت بھی محدود ہے اس لئے بہت جلد دراڑیں پڑ جاتی ہیں ان حالات میں جو لوگ کسی پلیٹ فارم پر بھڑکی ہوئی تقریریں کرتے ہیں انہیں حقیقی صورت حال ذہن میں رکھنی چاہئے۔ اگر عظیم مقرروں کو نراجیت پیدا کرنی ہے تو پھر انہیں نتائج بھگتنے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ حال ہی میں عظیم لیبر لیڈروں میں سے ایک لیڈر سوات چلا گیا اور اپنے دوستوں کا ساتھ بھی چھوڑ گیا"

مزدوروں کی تنخواہ کے بارے میں اس تقریر میں شہید بھٹو نے کہا "اس وقت مزدوروں کی بنیادی تنخواہ 140،01 روپے ماہانہ ہے جو بہت ہی تھوڑی ہے میں مزدوروں کی تنخواہ تین سو چار سو بلکہ پانچ سو کرنا چاہتا ہوں لیکن ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ آج ہی یہ کام کر سکیں۔ ایک طرف تو ہمارے پاس بہت بڑی فوج ہے' دوسری جانب ہر طرف ترقیاتی کام کی ضرورت ہے۔ اگر ہم دریاؤں کے راستے بدلنا چاہتے ہیں۔ پہاڑوں کی ساخت تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور ہماری سرگرمیوں کا ٹیمپو اتنا اونچا ہے تو پھر مزدوروں کی تنخواہ کیوں نہ بڑھائی جائے لیکن یہ تنخواہ بڑھانے کے لئے باقی عوامل کو بھی نظر میں رکھنا ہو گا۔ ہماری صنعتوں میں کئی قسم کے لیڈر ہیں۔ کچھ ایسے بھی لیڈر ہیں جن کا صنعت کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ پاکستان میں ٹریڈ یونین ازم نے ترقی ہی نہیں کی۔ یہاں جائز اور اصل ٹریڈ یونین ازم موجود ہی نہیں ہے۔ یہاں ٹریڈ یونین ازم سیاست سے بری طرح بھرا ہوا ہے۔ ہم مزدور قوتوں کے ساتھ مذاکرات کرنا چاہتے ہیں"

اقتصادی بحران کے بارے میں بتاتے ہوئے شہید بھٹو نے کہا۔ "ہم ایک دوہری مشکل کے سینگوں میں پروئے ہوئے ہیں ہم گندم کے لئے امریکہ کی محتاجی کیوں کریں؟ دس لاکھ ٹن گندم امریکہ سے آتی ہے۔ امریکہ نے گندم کی ایک ایسی قیمت مقرر کر رکھی ہے لیکن اس کے باوجود یہ کوئی قابل چاہت عمل نہیں ہے کہ ہم گندم جیسی جنس میں بھی خسارہ برداشت کریں کم از کم غلے میں تو ہمیں خود کفیل ہونا چاہیئے۔ آپ افغانستان اور بھارت میں گندم کی قیمت پر غور کریں کہ وہ کم ہے اور ان دونوں ملکوں میں گندم ہمارے ملک سے اسمگل ہو کر جاتی ہے۔

ہم نے کپاس پر بر آمدی ڈیوٹی پانچ فیصد کم کی ہے تاکہ کاشتکاروں کو کچھ فائدہ پہنچنا چاہیے تھا لیکن

کپاس کی قیمت 54 روپے گانٹھ سے کم ہو کر 33 روپے رہ گئی ہے اب ڈیوٹی کم کرنے کا فائدہ بھی صرف برآمد کنندگان کو ملے گا۔ کاشتکار کو نہیں پہنچے گا۔ بے زبان کاشتکار کو تو کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ میں آئندہ کاشتکاروں کی 80 فیصد آبادی کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں۔ ہم استحصال کی بات کرتے ہیں سب سے زیادہ استحصال تو کاشتکار کا ہوتا ہے۔ زرعی برآمدات کو کسان کی محنت سے نچوڑ لیا جاتا ہے ساری معیشت کا بوجھ کسان کے سر پر ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا فرض ہے کہ ہمارے فیصلوں کا فائدہ کسان کو پہنچے۔ میں ان لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو گرمی کا موسم آنے پر لندن اور پیرس چلے جاتے ہیں۔ میں شہر کا رہنے والا بھی ہوں اور دیہات کا رہنے والا بھی' میں تصویر کے دونوں رخ دیکھتا ہوں"

علاوہ ازیں اپنی ذاتی جاگیرداری ختم کرنے کے بارے میں شہید بھٹو نے ستمبر 1968ء میں حیدر آباد میں اپنے پارٹی کنونشن میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے کہہ دیا تھا۔ " آج مجھے کہا جاتا ہے کہ اپنی زمینیں چھوڑ دو۔ آج میں اپنی زمینیں سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے افسروں کے سپرد کیوں کر دوں؟ جب سوشلزم آئے گا تو سب سے پہلے اپنی زمینیں میں چھوڑ دوں گا"

1972ء میں چیمبرز آف کامرس کی اس تقریر سے پہلے حکومت سنبھالتے ہی شہید بھٹو نے بار بار تاجروں اور سرمایہ داروں سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ملک میں صنعتکاری کے لئے اپنا وہ سرمایہ واپس لے آئیں جو یہ مغربی ممالک میں لے گئے ہیں لیکن ان دولت مندوں کا موقف یہ تھا کہ بھٹو کی تحریک نے مزدوروں کو بدتمیز بنا دیا ہے اور مشرقی پاکستان کے عوام کی معاشی حقوق کی تحریک نے بھی ہمارے سرمائے کو شرمیلا بنا دیا ہے اس لئے اب ہم صنعتکاری کی بجائے تجارت میں پیسہ لگائیں گے اور تجارت کے مراکز چونکہ مغربی ممالک میں ہیں اس لئے ہمارے میجر اکاؤنٹ بھی مغربی ممالک میں رہیں گے۔ اس موقع پر تنگ آ کر بھٹو شہید نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر وہ بیرونی سرمایہ واپس نہ لائے تو وہ ان کے خاندانوں کے افراد کو حراست میں لے لیں گے لیکن دوسری طرف سامراجی ممالک یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ پاکستان میں اب کسی بھی قسم کی صنعتکاری نہیں ہونے دیں گے اس لئے پاکستان کے دولت مندوں کو سامراجی قوتوں کی پوری مدد مل چکی تھی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ ملک کے اندر جو بڑی صنعتیں سرمایہ داروں کے پاس موجود تھیں ان کا مالیاتی سرمایہ بھی بیرون ملک بھیجا جا چکا تھا اور تمام صنعتوں کو بیمار صنعتیں قرار دیا جا رہا تھا۔ پاکستانی سرمایہ دار نے چونکہ ماضی میں بھی کبھی جمہوریت کی حمایت نہیں کی تھی اس لئے اب تاجر بننے کے بعد تو وہ جمہوریت کی مکمل مخالفت کر رہا تھا۔

بھٹو حکومت کے پاس ایک ہی راستہ باقی تھا کہ ملک کی بڑی صنعت کو ترقی دینے کے لئے اسے سرکاری تحویل میں لے لے اور سرمایہ داروں کے کاروبار کی ٹرانزیکشن کرنے والے بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کو بھی سرکاری تحویل میں لے لے اور اس طرح ملکی صنعت کو ترقی دے اور ملک میں فولاد' تیل' شوگر اور کپڑا پیدا کرنے کے لئے بھی ایک تحریک شروع کی جائے لیکن اس راستے میں بھی ایک رکاوٹ تھی

www.bhutto.org

کہ ملک کا مزدور طبقہ کوئی ایسی تنظیم قائم نہیں کر سکا تھا جو ان صنعتوں کو چلا سکتی۔ بیوروکریسی مملکت کے ہر شعبے پر غالب آئی ہوئی تھی۔ اس لئے سرکاری تحویل میں جانے والی صنعتیں بھی اس بیوروکریسی کے ہاتھوں میں جا رہی تھیں لیکن کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا شہید بھٹو نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ بیوروکریسی کو وقتی طور پر استعمال کیا جائے اور سروسز میں اصلاحات کر کے اس بیوروکریسی کا کنٹرول بتدریج ختم کر دیا جائے اور آہستہ آہستہ کاریگروں' دانشوروں اور مزدوروں کو سروس سیکیورٹی' ٹریڈ یونین شہید بھٹو نے بڑی صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا اور اس کے ساتھ ہی زرعی اصلاحات کے لئے کمیشن قائم کر دیا جس کا سربراہ سب سے پہلے غلام مصطفیٰ جتوئی کو بنایا گیا لیکن جب ان سے تسلی بخش کام نہ چل سکا تو پھر شیخ محمد رشید کو اس کا سربراہ بنایا گیا۔

اس لینڈ کمیشن نے زرعی اصلاحات کر کے جتنی زمین جاگیرداروں سے چھینی اور کسانوں کے سپرد کی اس کی تفصیلات شیخ رشید کی طرف سے شائع ہونے والے زرعی اصلاحات پر مشتمل مضامین اور کتابوں میں پیش کی جا چکی ہیں۔

پاکستانی صنعتکاروں اور تاجروں کی طرف سے جمہوریت کی مخالفت اور آمریت کی حمایت کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بتانا ضروری ہے کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہی اٹلی' جرمنی اور جاپان کے بڑے سرمایہ داروں نے جمہوریت کی بجائے فاشزم کا جھنڈا بلند کر دیا تھا جس میں مذہبی جنون اور ذات برادری کے کلچر کو بھی شامل کیا گیا تھا جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور یورپ نے اپنی تمام نو آبادیوں میں یہ پالیسی نافذ کر دی تھی اس لئے پاکستانی سرمایہ دار اور تاجر بھٹو شہید کو ناکام بنانے کے لئے اپنی انسان دشمن روش پر ڈٹے ہوئے تھے۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

بھٹو اور تیسری دنیا

تیسری دنیا کو آج اگر 1990ء میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بھٹو شہید 1960ء کی دہائی کے دوران جو کچھ کہہ رہے تھے وہ آج بھی درست ہے۔ 1960ء کی دہائی میں تیسری دنیا امریکی سرمایہ داروں کی قیادت میں چلنے والے یورپی ملکوں کو خام مال بھی فراہم کر رہی تھی اور سامراجی صنعتوں کے فالتو مال کی منڈی بھی بنی ہوئی تھی۔ اس عرصے میں سامراجی ملکوں کی ہیوی انڈسٹری نے بھی خوب ترقی کی تھی اور ایوبی دور میں ان ملکوں نے اپنی ہیوی انڈسٹری میں بنی ہوئی مشینیں پاکستان جیسے ملکوں میں لگائی بھی تھیں اور انہوں نے پاکستانی بیوروکریسی کو اپنے زیر اثر کر لیا تھا اور پاکستانی سرمایہ داروں کو اپنے کمیشن ایجنٹوں اور تقسیم کاروں میں بدل دیا تھا لیکن 1970ء کے اوائل میں ترقی یافتہ ملکوں نے فیصلہ کر لیا کہ تیسری دنیا کے ملکوں کو صنعتیں اور مشینری نہ دی جائے بلکہ ان سے خام مال لیا جائے اور ان کو صرف فالتو صنعتی مال فراہم کیا جائے۔ یہ فیصلہ اس لئے کیا گیا کہ اشیائے صرف بنانے والی جو صنعت سامراجی ملکوں میں لگی ہوئی تھی وہ زیادہ سے زیادہ آٹومیٹک ہوتی چلی گئی اور اس کی پیداوار بڑھتی چلی گئی ان ملکوں نے سوچا کہ پاکستان جیسے ملکوں میں انہی کی لگائی ہوئی صنعت سے جو اشیائے صرف پیدا ہوں گی وہ منڈی میں آنے کی وجہ سے وہاں باہر کا مال زیادہ فروخت نہیں ہو گا۔ ترقی یافتہ ملکوں کی یہ پالیسی 1960ء سے پہلے بھی ہوتی تھی لیکن اسی عرصہ میں سامراجی ملکوں میں خود کار ٹیکنالوجی کا عہد شروع ہو گیا اور ان کی اشیائے صرف بیچنے کے لئے انہوں نے پاکستان جیسے ملکوں کو ماضی کی طرح منڈی بنائے رکھنے کے لئے صنعتیں لگانا بند کر دیں

www.bhutto.org

پھر مسئلہ یہ تھا کہ ہیوی انڈسٹری کی مشینری کی پیداوار کو وہ کہاں کھپاتے؟ یہ مسئلہ تو موجود تھا اور آج بھی موجود ہے۔ انڈیا جیسے ملکوں نے اپنی مشینری بنانے کے لئے خود ہی ہیوی انڈسٹری لگائی اور اس مقصد کے لئے روس سے مدد لی۔ آج انڈیا کا یہی مسئلہ ہے کہ اپنی ہیوی انڈسٹری کی بنائی ہوئی مشینوں کو کہاں بیچے؟ مغربی ملکوں نے اس عرصہ میں پالیسی یہ بنالی تھی کہ زیادہ سے زیادہ اسلحہ بنا کر دوسرے ملکوں میں بیچا جائے۔ ان تینوں باتوں کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ سرمایہ داری نظام کے تحت چلنے والے حکمران طبقے منصوبہ بندی میں کورے ہوتے ہیں۔ وہ اندھا دھند صنعتیں لگائے چلے جاتے ہیں لیکن آخر ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ ان کی لگائی ہوئی ہیوی انڈسٹری کی مشینیں خریدنے والے گاہک خود انہی کی مشینوں سے اشیائے صرف بنانے لگتے ہیں اور پسماندہ ملکوں میں ان کی اشیائے صرف بنانے والی صنعت کی پیداوار کی فروخت کم ہونے لگتی ہے۔ وہ اپنی اشیائے صرف بیچنے کیلئے انہیں اپنی مشینیں دینا بند کر دیتے ہیں اس کے نتیجے میں ان کی ہیوی انڈسٹری میں بنی ہوئی مشینیں گاہکوں سے محروم ہو جاتی ہیں۔ بھٹو شہید کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ترقی یافتہ ملک اپنے ہی نظام کی پیدا کی ہوئی پیچیدہ مشکلات میں پھنستے جاتے ہیں تو زیادہ جبر اور زیادہ اندھے پن کی پالیسی اختیار کرنے لگتے ہیں۔ شہید بھٹو نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ایک طرف تو ان ملکوں کے جبر و ستم کے خلاف تحریک چلائی جائے دوسری طرف تیسری دنیا کے ملکوں کو متحد کر کے ان میں ترقی کیلئے لازمی ڈھانچہ تیار کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ بجلی پیدا کی جائے' زیادہ سے زیادہ تیل حاصل کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ انڈسٹری لگائی جائے اور اپنی اشیائے صرف بنانے والی انڈسٹری کو مشینری مہیا کرنے کیلئے فولاد کی صنعت بھی لگائی جائے۔ بجلی حاصل کرنے کیلئے ایٹمی بجلی گھر بنائے جائیں اور ان تمام مقاصد کیلئے تیسری دنیا کے تمام ممالک کو متحد کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے اپنی کتاب "متھ آف انڈی پینڈنس" کے صفحات میں یہ تجزیہ پیش کیا کہ تیسری دنیا کی حالت کیا ہے؟ اور سامراجی ممالک کیا کر رہے ہیں اور خصوصی طور پر افریقہ کی حریت پسند تحریکیں کیا رخ اختیار کر رہی ہیں۔ "اپنے اس عظیم الشان سائنسی تجزیئے کی بنیاد پر شہید بھٹو کے متعین کردہ مقاصد کا پتہ ان کی پالیسیوں سے چلتا ہے جو انہوں نے 1972ء میں حکومت حاصل کرنے کے بعد انتہائی تیز رفتاری سے بنانا شروع کر دی تھیں اور واضح طور پر یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ جس طرح ملک کے اندر اصل تضاد غریب اور امیر کا ہے اسی طرح دنیا بھر کے ملکوں کے درمیان اصل تضاد غریب اور امیر ملک کا ہے۔ امیر ملکوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے شہید بھٹو بار بار یہ کہا کرتے تھے کہ "سپر طاقتیں تو یہ چاہتی ہیں کہ ہم لکڑہارے اور ماشکی بنے رہیں اور یہ طاقتیں زمین کھلانے والے سیارے کے تمام وسائل پر قبضہ حاصل کر لیں" شہید بھٹو امیر اور غریب ملکوں کے درمیان تضاد کو بین الاقوامی سوشل سائنس دانوں کی زبان میں شمال اور جنوب کا تضاد ہی کہتے تھے اور یہ نظریہ بھی پیش کرتے تھے کہ امارت اور غربت کے عالمی تضاد کو ختم کرنے کیلئے ایک تیسرا اقتصادی اور سیاسی نظام بنانا چاہئے جو آپس میں لڑ لڑ کر مرنے کی بجائے ایک توازن پیدا کر دے۔ بھٹو شہید کی یہ بات اندھے اور

www.bhutto.org

سرمایہ دار ملکوں کے حکمرانوں کی سمجھ میں اس وقت نہیں آتی تھی' آج ضرور آتی ہے۔ 1990ء کی دہائی شروع ہونے سے پہلے ہی روس کی حکومت نے صدر گورباچوف کی قیادت میں وہ بے شمار تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں جو پہلے تو خود روس کے اندر ہوئیں پھر مشرقی اور اب مغربی یورپ کو مجبور کر رہی ہیں کہ وہ اپنے نظام کو تبدیل کریں ۔ شہید بھٹو نے 1970ء کی دہائی میں بار بار اس بات پر زور دیا کہ شمال اور جنوب اور پھر مشرق و مغرب کے ملکوں کی قیادتیں جو خواہ مخواہ اپنے اندرونی جھگڑوں میں الجھی رہتی ہیں ان کو چاہئے کہ وہ آپس میں ایک پلیٹ فارم بنا کر مکالمہ شروع کر دیں جو تضادات کے ہاتھوں انسانیت کے تباہ ہونے سے پہلے پُرامن طور پر کسی نتیجے تک پہنچا دے لیکن اس مکالمے کو گڈمڈ اور ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ ضابطہ سازیوں کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ اب یہ خطرہ لاحق ہے کہ محض لفاظی میں اس مکالمے کا گلا ہی نہ گھونٹ دیا جائے۔ شہید بھٹو کو اس بات سے بڑا دکھ ہوتا تھا کہ تضادات حل کرنے کی بجائے باہمی ڈائیلاگ کے ہر ایک پلیٹ فارم کو فوجی چالوں کے اڈے بنا بنا کر تباہ کیا جا رہا ہے اور باہمی تعاون کے تاریخی مسئلے کی مرکزیت کو پارہ پارہ کیا جا رہا ہے۔ جس مکالمے کو ترقی دینے پر شہید بھٹو زور دیتے تھے وہ اقوام متحدہ میں شامل 77 غریب ملکوں کے گروپ کے زیر اہتمام جاری ہوا تھا اور اس کی عکاسی الجیرس کے منشور میں ہو چکی تھی۔ پیرو میں ہونے والے اعلانِ لیما میں ہو چکی تھی اور سینی گال کے ایکشن پروگرام کیلئے کئے جانے والے اعلانِ ڈاکار میں ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ یہی مکالمہ غیر جانبدار ملکوں نے قاہرہ' جارج ٹاؤن' الجیرس' لیما اور کولمبو میں اقتصادی مسائل کے بارے میں کیا تھا۔ نیا عالمی اقتصادی نظام رائج کرنے کے حق میں قراردادیں منظور کی تھیں۔ شہید بھٹو کا نظریہ تھا کہ سپر طاقتوں نے جس ترقی کی دوڑ لگائی ہے اس کی وجہ سے انسانیت تباہ ہو گئی ہے اور صرف اس لئے رہ گئی ہے کہ تیسری دنیا کی جانب سے اس کیلئے اب تک کوئی منظم تحریک نہیں چلائی جا سکی۔ اس امر سے شہید بھٹو کو سخت دکھ ہوتا تھا کہ سپر طاقتوں سے ہتھیار خرید خرید کر چلانے کیلئے تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک محض علاقائی بنیادوں پر ایک نفاق انگیز حالت میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں۔ بھٹو شہید دن رات اس مقصد کیلئے جدوجہد کرتے رہے کہ اسلامی کانفرنس' عرب لیگ' افریقی اتحاد کی تنظیم اور لاطینی امریکی ممالک کی اقتصادی تنظیمیں اپنے محدود منشوروں سے آگے بڑھ کر عالمی سطح پر اتحاد قائم کریں لیکن سرمایہ دار ملکوں اور مالیاتی اداروں کے ایجنٹوں پر مشتمل بیوروکریسی نے اپنے پالے ہوئے مُلاؤں' جاگیرداروں اور خصوصی طور پر تاجروں کو اس کام پر لگا دیا کہ موقع پرست ذہنیت کی ماری ہوئی مڈل کلاس کو بھٹو کے خلاف استعمال کر سکیں۔ اس صورتحال میں شہید بھٹو کو دو مشکلات تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ ان کی اپنی پارٹی جو انتہائی کم عمر تھی اس کے اندر موجود لیفٹ مکینیکل عقیدہ پرستی کا شکار تھا' صورتحال کی ٹرانسفارمیشن کرنے والا کیڈر پارٹی کے اندر پیدا ہی نہیں ہو سکا تھا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ تیسری دنیا کے دیگر ممالک کی حکومتیں بھی اس قوم پرستی کے سر پر چل رہی تھیں جو سپر طاقتوں سے اختلاف تو کرتی تھیں لیکن اپنے ملکوں کے اندر محنت کش طبقوں کی

www.bhutto.org

قیادت بھی نہیں آنے دیتی تھیں۔ بھٹو یہ سوچتے تھے کہ غیر جانبدار ملکوں کی تعداد تو 80 تک پہنچ گئی ہے لیکن اس کے بنیادی اصول پر عمل نہیں ہو سکا اور خود ترقی پذیر ملک جو اس میں شامل ہیں ان کا بھی ایک گروپ دوسرے گروپ کے خلاف چلتا ہے لہٰذا یہ ملک سپر طاقتوں پر اقتصادی انحصار کو ختم نہیں کر سکتے۔ اس بات کو یوں پر کھا جا سکتا ہے کہ تیسری دنیا کے اتحاد پر 1976ء میں تقریر کرتے ہوئے شہید بھٹو ایک طرف افریقہ کے قحط کا دکھ محسوس کرتے ہیں' دوسری طرف عرب ملکوں کے اس مطالبے کا تجزیہ بھی کرتے ہیں جو وہ اپنے تیل کی قیمت بڑھانے کیلئے کر رہے تھے اور ساتھ ہی اس پر افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ تیسری دنیا کی طرف سے بر آمد ہونے والے خام مال اور دیگر بنیادی پیداواروں کی قیمتیں بھی سپر طاقتیں ہی مقرر کرتی ہیں کیونکہ اصل منڈیاں انہی کے قبضے میں ہیں اور سپر طاقتوں کو ان حرکتوں سے اس وقت تک روکا نہیں جا سکتا جب تک کہ سارے ترقی پذیر ممالک اپنے مقاصد کو مربوط نہ کریں۔ اس لئے بھٹو کا کہنا تھا کہ ہم ترقی پذیر ممالک ایک تباہ کن راستے پر چل رہے ہیں۔ یہ باتیں شہید بھٹو نے 1976ء میں ہی نہیں کی تھیں بلکہ اپنی کتاب "متھ آف انڈی پنڈنس" میں انہوں نے ان کی نظریاتی اساس پیدا کر دی تھی اور ایوبی دور میں وزیر خارجہ کی حیثیت میں تیسری دنیا کے ممالک کے وزیروں اور حکمرانوں سے بار بار ملاقاتیں کر کے اس تحریک کی ابتدا کر چکے تھے۔ یہ تیسری دنیا کی آزادی کی تحریک تھی۔ انہوں نے بار بار کہا تھا کہ اگر یورپی مشترکہ منڈی جیسی تنظیمیں بنا کر امیر ممالک ان کے آگے اور پیچھے اپنی بڑی بڑی صنعتوں کے کاروبار کا جال پھیلا سکتے ہیں تو ہم غریب ممالک اپنی محنت اور خام مال کی بنیاد پر کیوں اتحاد نہیں کر سکتے؟ واضح رہے کہ جب بھٹو نے تیل کی قیمتیں بڑھانے پر عرب ملکوں کی حمایت کی تو سامراجی ملکوں کو شاید کسی بھی عرب ملک کے سربراہ سے اتنی تکلیف نہ پہنچی ہو جتنی شہید بھٹو کے تھیسس سے پہنچی تھی کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ یہی بھٹو ایک عرصہ پہلے اسلامی سربراہی کانفرنس کی صدارت کر چکا ہے۔ اس کانفرنس کا ذکر میں آگے کروں گا۔ شہید بھٹو نے بائی لیٹرل ازم کا نظریہ اسی تناظر میں پیش کیا تھا۔ اس نظریئے کی تفصیل شہید بھٹو کے ان خطوط اور تقریروں میں موجود ہے جو 1958ء سے لے کر 1966ء تک ایوب خان کی حکومت میں کام کرنے والے بھٹو کے ریکارڈ میں موجود ہیں اور پھر 1967ء سے لے کر 1977ء تک کے دور میں بھی بار بار بھٹو اس نظریئے کی وضاحت کرتے ہوئے اس پر زور دیتے رہے۔ اپنی ان تقریروں اور خطوط میں شہید بھٹو نے پاکستان کی سابقہ حکومتوں کے وزارت خارجہ کے ریکارڈ اور بیرونی ممالک کے مراسلات کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

www.bhutto.org

سوئے دار چلے

یہ حقیقت اب واضح ہو چکی ہے کہ جنرل ضیاء الحق کو شہید بھٹو کی حکومت ختم کرنے اور انہیں پھانسی کے تختے پر چڑھانے کی جرآت کیوں ہوئی؟ اول تو یہ کہ وہ تیسری دنیا کو اس کے وسائل کے ساتھ متحد کر کے 'مشترکہ اقتصادی اور سیاسی پالیسیاں بنانے کی راہ پر چلا رہے تھے' دوسرے اسلامی ممالک کا علیحدہ اتحاد بنانے میں مصروف تھے۔ 1973ء میں تیل کا ہتھیار استعمال کر کے عرب دنیا میں ایک نیا اعتماد آ گیا تھا اور ترقی یافتہ ملکوں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی صنعتی ترقی کی معیشت تیل کے بغیر کیا رہ جاتی ہے؟ یہ ان کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اگر تیل کے ساتھ اس کے ذخیروں کی حفاظت کی اہلیت بھی عرب ملکوں میں پیدا ہو جاتی تو ترقی یافتہ ملکوں کی شہ رگ عربوں کے ہاتھ میں آ سکتی تھی۔ یہ راز بھٹو ہی جانتے تھے انہوں نے عرب ملکوں کے قائدین کو اس سے آگاہ بھی کر دیا تھا۔ انہی میں سے بعض کے تعاون سے انہوں نے پاکستان کا ایٹمی پروگرام شروع کیا۔ سرمایہ دار ممالک جان گئے تھے کہ یہ اصل میں کیا چیز ہے؟ پاکستان کی جوہری طاقت عربوں کے تیل کی حفاظت کا ذریعہ بن کر' دنیا کے سیاسی اور اقتصادی نقشے کو بدل سکتی تھی۔ مغرب کیلئے یہ صورتحال ایک ڈراؤنے خواب کی طرح تھی۔ اسی لئے ایٹمی ری پروسسنگ پلانٹ کا جو منصوبہ انہوں نے تیار کیا تھا وہ امریکیوں کو پسند نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی شہ رگ پر ہاتھ رکھنے کے علاوہ اسلامی ممالک اسرائیل کی تباہی کے قابل بھی ہو جائیں گے۔ بھٹو' بھارتی بورژوازی کی سپر طاقت بننے کی حکمت عملی کے سامنے بھی سر نہیں جھکا رہے تھے۔ دوسری طرف امریکیوں کی ہمیشہ سے یہ پالیسی رہی تھی

www.bhutto.org

کہ پاکستان بھارت کے خلاف کبھی کوئی قدم نہ اٹھائے اور امریکہ سے ملنے والی فوجی امداد صرف سوشلسٹ بلاک کے خلاف استعمال کرے اور خلیج میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے تیل کے مفادات کی حفاظت کرنے والا سپاہی بنا رہے۔ امریکیوں کو اس بات کا پتہ تھا کہ بھٹو کے نیشنل ازم کی کامیابی سے پاکستان اقتصادی طور پر ایک خود کفیل ملک بن جائے گا اور وہ امریکی مفادات کا محافظ سپاہی بننے سے انکار کر دے گا۔ امریکی اس بات کو بھی جانتے تھے کہ بھٹو شہید بار بار افریقہ کے حریت پسند عوام کی حمایت کیوں کر رہے ہیں۔ اس لئے اب بھٹو امریکی انتظامیہ کیلئے ایک مسئلہ بن چکے تھے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر بھٹو اور ان کے نظریات کو ختم کرنے کیلئے پاکستانی عوام کو ان کی قیادت سے محروم کر دیا جائے۔ اسی مقصد کیلئے جماعت اسلامی اور اس کی سرپرست بادشاہتوں کے ذریعے جنرل ضیاء الحق کو چیف آف آرمی اسٹاف بنوایا گیا۔ یہ جنرل 1970ء میں اردن میں فلسطینی تنظیم آزادی کے مجاہدین کے قتل عام میں اہم کردار ادا کر چکا تھا۔ اس تقرر پر بھٹو کے قریبی دوست یاسر عرفات نے انہیں انتباہ بھی کیا تھا۔ بھٹو نے جب ری پروسسنگ پلانٹ کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا تو امریکیوں نے بھی ان پر آخری وار کرنے کی اسکیم تیار کر لی۔ شہید بھٹو اسے بھانپ گئے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی حکومت کی عمر ختم ہونے سے پہلے الیکشن کروا لئے جائیں اور عوام کی مدد سے کامیاب حکومت بنا کر امریکہ اور اس کے پاکستانی ایجنٹوں کو شکست دے دی جائے لیکن امریکہ نے آناً فاناً نو جماعتوں کا اتحاد (پاکستان نیشنل الائنس) قائم کروا دیا۔ اس اتحاد نے نظام مصطفیٰ کا جھوٹا نعرہ لگا کر پاکستان کی مڈل کلاس کو سامراجی مال کے درآمد کنندگان تاجروں ' جاگیرداروں ' سرکاری افسروں اور سرمایہ داروں کی مدد سے میدان میں اُتار لیا۔ اتحاد کے سارے عناصر سازش میں شریک نہیں تھے۔ اکثریت جمہوری آزادیوں کے فروغ کیلئے کام کر رہی تھی لیکن اس جمہوری تحریک کو نظام مصطفیٰ کے نعرے کی آڑ میں قوم پرست قیادت کے خاتمے کی طرف موڑ دیا گیا۔ پاکستان کے اسی فیصد غریب عوام اگرچہ بھٹو کے ساتھ تھے اور انہوں نے 1977ء میں شہید بھٹو کو ووٹ دے کر الیکشن میں فتح بھی دلا دی تھی لیکن پیپلز پارٹی کے ووٹر ایک منظم تحریک کی صورت میں اس لئے اختیار نہ کر سکے کہ اس میں بہت سے موقع پرست ' دولت مند اور مڈل کلاسیئے شامل تھے۔ مڈل کلاس میں فاشزم کا رجحان موجود ہوتا ہے۔ اسے مذہبی جنون کے ذریعے ابھار کے بھٹو کے خلاف استعمال کیا گیا جبکہ پیپلز پارٹی کے محنت کش ایک تحریک میں منظم نہ ہونے کی وجہ سے اس فاشسٹ جنون کے مقابلے میں نہ آئے۔ پروپیگنڈہ یہ کیا گیا کہ عوام بھٹو کے ساتھ ہی نہیں ہیں۔ 1977ء میں جو الیکشن ہوئے بھٹو شہید کے خلاف شروع ہوا اس کی بنیاد کئی برس پہلے رکھی جا چکی تھی۔ اُس پر باقاعدہ عمل اس وقت شروع کیا گیا جب 1976ء میں امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے پاکستان کا دورہ کیا اور شہید بھٹو کو واضح طور پر دھمکی دی کہ امریکہ ان کو عبرت ناک مثال دے گا۔

یہ 10 اگست 1976ء کی بات ہے اس روز ہنری کسنجر لاہور آئے اور شہید بھٹو نے ان کو

www.bhutto.org

عشائیہ دیا۔ اس وقت کسی کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ہنری کسنجر نے کیا بات کی۔ بہت دنوں بعد یہ راز کھلا کہ بھٹو کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر انہوں نے فرانس سے کئے گئے ری پروسسنگ ایٹمی پلانٹ کے معاہدے سے دستبردار ہونا قبول نہ کیا تو ان کو عبرتناک مثال بنا دیا جائے گا۔ تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس بھٹو کو ایٹمی پلانٹ کی وجہ سے شہید کیا گیا اس کی بیٹی کے دور میں فروری 1990ء میں فرانس کے صدر متراں نے خود پاکستان میں آکر ایٹمی پلانٹ دینے کا اعلان کیا اور اسی فروری 1990ء میں بھٹو کی بیٹی نے افواج پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہونے والے جریدے میں "پاکستان ڈیفنس جرنل" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ "اسی ایٹمی پلانٹ کو روکنے کیلئے ان کے والد کی حکومت ختم کی گئی تھی اور اسی پلانٹ کو روکنے کیلئے جنرل ضیاء نے بار بار الیکشن ملتوی کئے تھے۔ یہ پاکستان کے عوام کی بدنصیبی تھی کہ بھٹو جیسا لیڈر اس پلانٹ کے باعث پھانسی چڑھ گیا لیکن یہ انہی عوام کی خوش نصیبی ہے کہ اسی شہید لیڈر کی بیٹی آج اسی فرانس کے ساتھ وہی پلانٹ لگانے کا معاہدہ کر رہی ہے جس سے 1977ء میں فرانس منحرف ہو گیا تھا۔"

10 اگست 1976ء کو جب ڈاکٹر ہنری کسنجر نے بھٹو کو عبرتناک مثال بنا دینے کی دھمکی دی تو بھٹو نے اسی رات لاہور میں کسنجر کے اعزاز میں دیئے گئے عشائیے میں وہ عظیم تقریر کی جو فلسفہ سیاست اور لٹریچر میں کلاسیک بن چکی ہے اور اس کا لفظ لفظ تاریخ کے ایک ایک لمحے کی پکار بن چکا ہے۔ اس تقریر سے ہی ثابت ہو گیا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی جسمانی زندگی اگر ختم بھی کر دی گئی تو یہ شخصیت ایک تاریخ ساز کردار کی صورت میں صدیوں تک لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر چھائی رہے گی۔ انگریزی زبان میں کی جانے والی بھٹو شہید کی تقریر کا پورا اردو ترجمہ میں اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ اس کے ایک ایک لفظ میں جہانِ معنی پنہاں ہے' اس تقریر کو اپنی کتاب میں شامل کرنا میرے لئے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔ میرے لاکھوں الفاظ اس تقریر کے ایک لفظ پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ تقریر کے پہلے دو رسمی جملے پڑھنے کے بعد دیکھئے کہ عالمی ڈپلومیسی سے لے کر تاریخ ساز نظریاتی موقف اور اپنے عزم کو پیش کرتے ہوئے شہید بھٹو نے کیا کچھ کہہ دیا تھا۔ پہلے دو جملے تو یہ ہیں۔

"خواتین و حضرات!

ہمارے لئے یہ باعث مسرت و اعزاز ہے کہ امریکہ کے وزیر خارجہ ایک بار پھر ہمارے ساتھ مذاکرات کیلئے یہاں تشریف لائے ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ ہماری تجویز پر کل صبح لاہور میں ہونے والے مذاکرات حوصلہ افزاء ثابت ہوں گے۔"

ان دو جملوں کے بعد شہید بھٹو نے کہا تھا۔

"مسٹر ڈاکٹر کسنجر میں بڑے دُکھ کے ساتھ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شمرلاہور پر سیاہ بادل منڈلا رہے ہیں اور یہ صرف شمرلاہور پر ہی نہیں منڈلا رہے ہیں بلکہ گذشتہ دس بارہ دنوں سے ملک کے بیشتر حصوں پر

www.bhutto.org

ان کا سایہ ہے۔ ہم نے بہت سی ہولناک تباہیاں دیکھی ہیں۔ اب ہم ایک انتہائی نازک اور تشویش ناک دور سے گذر رہے ہیں کیونکہ ہمارے دریاؤں میں پانی چڑھا ہوا ہے اور وہ بہت شرارتیں کر رہے ہیں۔ وہ ہنگامہ خیزی پر اُتر آئے ہیں اور ہم ان پر ایک کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ وادیء سندھ کی پانچ ہزار سالہ قدیم تہذیب کسی نہ کسی طور سے اپنے دریاؤں کے ساتھ زندگی کرتے اور ان سے نبرد آزما رہتے ہوئے گذری ہے۔ ہمیں بعض اوقات ان دریاؤں کے ساتھ لڑنا پڑتا ہے' بعض اوقات ان کو ٹھنڈا کرنے کیلئے' بعض اوقات ان کا مقابلہ کرنے کیلئے اور بعض اوقات ان کی ناز برداریاں کرنے کیلئے اور دریاؤں سے اسی طرح نمٹ کر ہی ہم نے ڈپلومیسی سیکھی ہے۔ قدرت کے بدلتے تیوروں سے پیش آنے کی طرح ہی ڈپلومیسی میں بدلتے ہوئے حالات سے نمٹنا مضمر ہوتا ہے۔ اس طرح کے تجربات سے گزرنے والے عوام کیلئے ڈپلومیسی فطری عمل بن جاتی ہے۔ ایسا ان لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتا جو دریاؤں کو رام نہیں کرتے ان سے جنگ نہیں کرتے' ان کے ساتھ وصال نہیں کرتے۔ اس لئے کل صبح جب آپ ہم سے مذاکرات کریں گے تو براہ مہربانی آپ یاد رکھیں کہ ہماری ڈپلومیسی کل اپنے عروج پر ہوگی کیونکہ اس وقت ہمارے دریا شرارتوں سے بھرپور ہیں اور چونکہ روڈ یارڈ کپلنگ بھی لاہور میں رہتے رہے ہیں اور مشہور اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایڈیٹر رہے ہیں اس لئے آپ لاہور کو صرف مسٹر کیم اور کپلنگ سے ہی وابستہ نہ کریں اگرچہ کیم اور کپلنگ کا برطانوی راج سے بہت واسطہ تھا جس کے بعض نقوش آج بھی اِدھر اُدھر آپ کو نظر آئیں گے۔

ہمارے تمام شہروں میں' لاہور ہمارا ایک ثقافتی مرکز ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا محور اور ہماری سرگرمیوں کا منبع بھی رہا ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس نے صدیوں قبل اپنا ایک مقام بنالیا تھا۔ اس شہر نے بہت فاتح دیکھے ہیں۔ اس شہر سے ہماری کئی نشاۃ ثانیہ وابستہ ہیں۔ اس شہر کی عظمت ہمارے لئے باعث فخر ہے اور حالیہ زمانوں میں جب لاہور پر چڑھائی کی گئی تھی تو اس شہر کے جیالے عوام نے جارحیت کرنے والوں کو بڑی بہادری سے پسپا کر دیا تھا اور اپنی دھرتی کے ایک ایک انچ کے تحفظ کیلئے جوانمردی سے مقابلہ کیا تھا۔ لاہور کئی اعتبار سے ہمارے دلکش اور مسحور کن احساسات کا گہوارہ ہے۔ یہ باغوں کا شہر ہے' یہ قلعوں کا شہر ہے' یہ ایک تاریخی شہر ہے' یہ تاریخی مساجد کا شہر ہے اور یہاں' اسی شہر لاہور میں' ایک مغل بادشاہ بھی رہتا تھا جس کا شہزادہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی انار کلی کی محبت میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ انار کلی' انار کے درخت کے ایک کھلتے ہوئے پھول کی مانند تھی لیکن شہزادے کا باپ بادشاہ اکبر یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا انار کلی سے شادی کرے۔ اس نے اسے سزا دینے کی غرض سے زندہ دفن کر دیا اور اسی قبر کے نزدیک ہمارا سیکرٹریٹ ہے جہاں ہم اَن تھک محنت کرتے ہیں اور تمام فائلوں کو یہیں سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہاں سے ٹھیک اس کمرے کی دوسری جانب اگلے دروازے کی طرف جہاں ہم مذاکرات کریں گے' اسی میدان میں دو افراد اپنی غلط مہمات کی وجہ سے دفن ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مغل بادشاہوں نے' بدھ شہنشاہوں

www.bhutto.org

نے اور راجہ رنجیت سنگھ جیسے حکمرانوں نے اور بہت سے دوسرے لوگوں نے اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ میں خود ذاتی طور پر بھی اس شہر سے بہت متاثر ہوں۔ مجھے ہمیشہ اس شہر سے گہری عقیدت رہی ہے اور میں اس شہر کو اس لئے بھی پسند کرتا ہوں کہ میں نے 1970ء میں اس شہر سے بھی الیکشن لڑا تھا (میں نے بیک وقت پانچ دوسرے شہروں سے بھی انتخاب لڑا تھا) اور میں لاہور میں صرف ایک دن کیلئے آیا تھا اور مجھے فخر ہے کہ میں نے چالیس ہزار ووٹوں سے ایک ایسے شخص کو شکست دی تھی جس کے باپ نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا لہٰذا لاہور کے لوگوں کی مجھ پر بہت سی نوازشیں اور مہربانیاں رہی ہیں اور میں بھی دل سے ان کا ممنون ہوں۔ اس لئے ہم سوچتے تھے کہ آپ جب پاکستان آتے ہیں تو ہمیشہ اسلام آباد میں آتے ہیں اور صرف ایک بار ہی لاہور میں آئے ہیں جبکہ ہمارا خیال تھا کہ آپ لاہور بھی آئیں مجھے نہیں معلوم کہ مسز کسنجر کے پاس اتنا وقت ہوگا کہ وہ کل صبح اس خوبصورت شہر کے بھی دلکش مقامات کی سیر کر سکیں گی شاید وہ کوشش کریں' آپ ہمارے مہمان ہیں اور ہمارے درمیان کوئی تکلف نہیں ہے۔ اگر آپ تھک گئی ہوں تو دوبارہ آ سکتی ہیں۔ پاکستان میں تو آپ کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جائے گا۔ ڈاکٹر ہنری کسنجر' مسز کسنجر اور آپ کے خاندان کو ہمارے ملک میں ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا۔ خواہ کسی بھی حیثیت سے پاکستان آئیں ہم ان کا کھلے دل سے خیر مقدم کریں گے کیونکہ ہمارے دل میں ان کیلئے بے حد محبت اور عقیدت موجود ہے۔ وہ اس لئے نہیں کہ آپ ایک ممتاز شخصیت کے حامل ہیں اور نہ اس لئے کہ ڈاکٹر ہنری کسنجر اپنے ملک کی خارجہ پالیسی کی تشکیل میں اہم اور نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں اور جس کیلئے مجھے اُمید ہے کہ امریکی عوام بھی آپ کو بھرپور خراج تحسین پیش کرتے ہوں گے بلکہ اس کیلئے کہ ڈاکٹر کسنجر تاریخ پر مکمل گرفت رکھتے ہیں۔ موجودہ واقعات جس اعتبار سے حرکت کر رہے ہیں وہ ان سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ انہیں حکمت عملی کا بھی کلی طور پر علم ہے۔ وہ اس بارے میں کسی غلط پالیسی میں جانا بھی نہیں چاہتے ہوں گے۔ وہ ہمیشہ واضح سمت کا تعین کرتے ہیں اور عالمی امور اور خارجہ پالیسی میں ان کا ایک منفرد مقام ہے اور جب میں یہ کہتا ہوں تو میں صرف ڈپلومیسی کی خاطر نہیں کہتا کیونکہ ہمارے دریاؤں نے ہمیں اس قسم کی کی ڈپلومیسی نہیں سکھائی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میں امریکہ کے بہت سے وزرائے خارجہ سے ملا ہوں۔ میرے دل میں ان سب کیلئے عزت و احترام موجود ہے کیونکہ وہ سب امریکہ کے وزرائے خارجہ رہے ہیں لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک اور عذر نہیں ہے اور میں بغیر کسی خوف و خطرے کے یہ کہوں گا کہ ڈاکٹر ہنری کسنجر! آپ کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔ عالمی امن کی خاطر آپ کی گراں قدر کوششوں کو ہم قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ نے اَن مٹ نشانات چھوڑے ہیں کہ مستقبل کے مؤرخ بھی آپ کو خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

جناب! اس عام رسمی گفتگو سے قطع نظر' میں آپ سے ایک بات کہنا چاہوں گا اور وہ یہ کہ آپ

www.bhutto.org

ایران سے آرہے ہیں۔ ایران پاکستان کا ایک ہمسایہ اور بردار ملک ہے۔ ہماری آزادی کے وقت ہی سے اس ملک کے ساتھ ہر شعبہ ہائے زندگی میں ہمارے قریبی تعلقات رہے ہیں اور آپ کابل سے بھی آ رہے ہیں اور ہم افغانستان کے ساتھ خوشگوار دوستانہ تعلقات کے قیام کیلئے بھرپور کوششیں کر رہے ہیں۔ جب افغانستان کے صدر محمد داؤد ماہِ رواں کے دوران پاکستان آئیں گے تو پاکستان خلوصِ دل کے ساتھ دونوں ملکوں کے درمیان موجود رنجشوں میں دشواریوں پر قابو پانے کی کوشش کرے گا۔ آپ نے دورہء ایران کے دوران زبردست کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

آپ نے امریکہ اور ایران کے پہلے سے قریبی تعلقات کو مزید خوشگوار خطوط پر استوار کیا ہے اور آپ نے اس خطے کی سلامتی کیلئے ایران کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ بات تسلیم کر لی گئی۔ پاکستان 'ایران کی سلامتی کو اپنی سلامتی تصور کرتا ہے اور ایران بھی 'اپنی سلامتی کو پاکستان کی سلامتی سے علیحدہ نہیں سمجھتا۔ چھوٹے موٹے معاملات تو رونما ہوتے ہی رہتے ہیں 'لیکن اگر کوئی بڑی بات ہوتی تو امریکہ ایران کی سلامتی کو پاکستان کی سلامتی سے علیحدہ کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ ان کی بہتری ہماری بہتری ہے اگر امریکہ ایران کی سلامتی کو اتنا اہم تصور کرتا ہے تو پاکستان کی سلامتی کے بارے میں اس قسم کے تصور کے بغیر نسلامتی کا پورا نظریہء منہدم ہو جائے گا۔ اس حقیقت سے چشم پوشی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ امریکہ کی سلامتی کے انتظامات کے احساس کے پورے نظریہ کی ایک کڑی آزمائش ہوگی پاکستان ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کے عمل سے گذر رہا ہے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اگر بڑے ممالک کے ساتھ مفاہمت ہو سکتی ہے تو چھوٹے ممالک کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ لیکن اس مفاہمت کیلئے ضروری ہے کہ بنیادی تنازعات طے ہونے چاہئیں۔ بھارت کے ساتھ کشمیر کے بنیادی مسئلے کو جموں و کشمیر کے عوام کے حق خود ارادیت کی بنیاد پر حل کیا جانا چاہئے۔ مسئلہ کشمیر کا کوئی دوسرا مناسب اور پائیدار حل نہیں ہوگا۔ بنیادی تنازعات پر سودے بازی سے زبردست پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بنیادی معاملات پر اس قسم کی گھٹیا سودے بازی کی کوشش کرنے والے فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب کوئی ضد یا تعصب نہیں ہے جبکہ اس کے برعکس پاکستان صرف تاریخی حقائق و شواہد اور استدلال پیش کرتا ہے۔ بنیادی معاملات پر سودے بازیوں سے مزید الجھن اور گڑبڑ پیدا ہوتی ہے۔ ہم صبح جو مذاکرات کرنے جا رہے ہیں ان کے بنیادی نکات کی وضاحت میں نے آج کر دی ہے۔

آخر میں 'میں پھر لاہور کا ذکر کروں گا جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ سرگرمیوں کا مرکز ہے 'یہ پاکستان کا دل ہے 'یہ وہ شہر ہے جو ہماری سیاست کے اُتار چڑھاؤ اور ہماری ثقافتی اور اقتصادی سرگرمیوں کا گہوارہ ہے۔ جناب! یہ وہ شہر ہے جہاں ہم اپنے آپ کی ری پروسسنگ کر رہے ہیں۔ یہ ہمارا ری پروسسنگ سنٹر ہے اور ہم کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے جس سے پاکستان کی ری پروسسنگ کے مرکز پر

www.bhutto.org

اثرات مرتب ہوں۔"

شہید بھٹو کی اس تقریر کا تجزیہ کرنے لگیں تو کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ اس کے نفسیاتی معنی کیا تھے؟ عالمی ڈپلومیسی میں اس کے کیا کیا مفاہم تھے؟ اور ملک کے اندرونی معاملات میں امریکہ اپنے پالتوں طبقوں کے ذریعے کیا کیا منصوبے بنا رہا تھا جس کا شہید بھٹو کے ذہن میں ایک خاکہ موجود تھا اور انہیں علم تھا کہ ان کے خلاف ایجی ٹیشن کا مرکز لاہور کو ہی بنایا جائے گا اور پنجابی سندھی تعصب پھیلا کر ایک طرف تو ان کی ذات کے خلاف انتقامی کارروائی کی جائے گی لیکن دوسری طرف سندھیوں میں نفرت پھیلا کر ان کے خلاف فوجی ایکشن کروایا جائے گا اور یہ سب کچھ ہم نے دیکھ لیا کہ 1983ء کی تحریک کا سرچشمہ سندھ بنا اور فوجی ایکشن بھی سندھی عوام کے خلاف کیا گیا اور پھر کراچی میں لسانی بنیاد پر جماعت اسلامی اور جی ایم سید کے پرانے شاگردوں کو جمع کر کے جنرل ضیاء الحق نے ان کی تنظیمیں خود بنوائیں جن کا مقصد سندھی نیشنلزم اور پاکستانی پرولتاریت کو کچلنا تھا۔ ہم امریکہ اور بھٹو شہید کے درمیان اختلافات کا سب سے بڑا سبب وہ ایٹمی ری پروسسنگ پلانٹ تھا جس کے بارے میں امریکی یہ سوچ رہے تھے کہ لیبیا کے سربراہ کرنل قذافی اور سعودی عرب کے سربراہ شاہ فیصل کی امداد سے اگر بھٹو نے یہ پلانٹ لگا لیا تو مغرب کی صنعتی قوت اور اسرائیل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اپنی اسی سوچ کی وجہ سے امریکی سامراج بھٹو شہید کی جان کا دشمن ہو گیا تھا اور پی این اے کے ایجی ٹیشن کیلئے کروڑوں روپے کی امداد دے رہا تھا۔ اس پس منظر کی تفصیل اخبارات کی خبروں میں ڈھونڈنے کی بجائے بہتر ہے کہ شہید بھٹو کی اس تقریر کو یاد کر لیا جائے جو انہوں نے نئی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد 28 اپریل 1977ء کو اس کے اجلاس میں کی تھی۔ قومی اسمبلی کے اس اجلاس میں اپنا تاریخی خطاب کرتے ہوئے شہید بھٹو نے کہا تھا۔

"موجودہ بحران ایک بین الاقوامی سازش کا نتیجہ ہے۔ آج پاکستان اہم جغرافیائی حیثیت کا حامل ہے اگر اسے نقصان پہنچا تو بہت سے عرب ملکوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جن میں متحدہ عرب امارات' عمان اور سعودی عرب وغیرہ شامل ہیں۔ سازشی عناصر مجھے ہٹانا چاہتے ہیں۔ وہ پاکستان کی معیشت کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ملک موجودہ تحریک کیلئے بھاری رقم خرچ کر رہا ہے۔ "ہاتھی" نے دیت نام اور مشرق وسطیٰ پر ہمارے موقف کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ ہاتھی مجھ سے ناراض ہے لیکن اس کا واسطہ مجھ بندہ صحرا سے آن پڑا ہے کہ ہم نے ہی عربوں کو ہتھیار فراہم کیے۔ ہمارا سپاہی اسلام کا سپاہی ہے۔ ہم نے ایٹمی پلانٹ پر قومی مفاد کے مطابق موقف اختیار کیا ہے۔ ملک میں غیر ملکی کرنسی پانی کی طرح بہائی جا رہی ہے۔ بعض بیرونی اخبارات نے لکھا ہے کہ اب مزدور بھی جو اس حکومت کے حامی تھے' زبردست خلاف ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے غریب ملک میں اگر اس طرح رقم پھیلائی جائے جس طرح یہاں پھیلائی گئی ہے تو اس سے کون متاثر نہیں ہو گا۔ یہ کوئی راز نہیں ہے کہ کس طرح پاکستان میں پانی کی طرح رقم بہائی گئی ہے اور کس طرح غیر ملکی کرنسی سیلاب کی طرح یہاں پھیلی ہے کہ کراچی میں ڈالر چھ سات روپے کا ہو گیا ہے'

www.bhutto.org

اس کی مثال نہیں ملتی۔ کس طرح لوگوں کو ازانیں دینے کیلئے رقم دی گئی' کس طرح لوگوں کو جیل جانے کیلئے رشوتیں دی گئیں۔ حتیٰ کہ دودھ والوں اور ڈاکیوں کو بھی رشوت دی گئی۔ بڑے بڑے صنعتکاروں نے یقیناً پی این اے کی حمایت کی لیکن اتنا پیسہ تو وہ بھی خرچ نہیں کر سکتے جو رقم پاکستان میں پانی کی طرح بہائی جارہی ہے یہ رقم کس پراسرار طریقے سے پاکستان میں آئی ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی سازش ہے۔

عزیز احمد نے اس کا ذکر ڈپلومیٹک انداز میں کیا ہے لیکن مجھے بتانے دیجئے کیونکہ چند افراد کا مستقبل کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور میرا فرض ہے کہ میں لوگوں پر واضح کر دوں کہ یہ سازش صرف قومی اتحاد کی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ میں کسی ملک کا نام لینا نہیں چاہتا اور کسی ملک کے ساتھ تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتا لیکن عوام کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرا قصور کیا ہے؟ میرا جرم کیا ہے جس کی وجہ سے میرے خون کے پیاسے میری جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ عوام کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہاتھی کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے اور دنیا میں ہاتھی موجود ہیں۔ دنیا میں کتنے ہیں یہ آپ جانتے ہیں۔ یہ ہاتھی زیادہ نہیں ہیں۔ ان ہاتھیوں کا ایسا حافظہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی کو فراموش نہیں کرتے۔ یہ بھولنا نہیں چاہئے کہ ویتنام کی جنگ کے وقت جب میں پاکستان کا وزیر خارجہ تھا تو پاکستان نے کیا موقف اختیار کیا تھا؟ پاکستان سے اس وقت کہا گیا تھا کہ وہ غلط موقف رکھنے والے فریق کی حمایت کرے اور جو کچھ وہ فریق مانگ رہا ہے اگر وہ نہ دے تو کم از کم پنگ پانگ کی گیندیں اور ٹیبل ٹینس کے ریکٹ ہی روانہ کر دے' لیکن ہم نے کہہ دیا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ بات ایک ملاقات میں کہی گئی جو ایک اعلیٰ شخصیت کے ساتھ کراچی میں ہوئی اور یہ شخصیت "ہاتھی" پر سوار تھی۔ اس نے کہا آپ پنگ پانگ کی گیندیں اور ٹیبل ٹینس کی گیندیں بھی بھیجنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایوب خان بھی اس ملاقات میں موجود تھے۔ وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا ہم کچھ بھی نہیں بھیجیں گے کیونکہ اس کا تعلق اصولوں سے ہے۔ ہم کسی طور پر بھی غلط فریق کی حمایت نہیں کر سکتے۔ اس ہاتھی کے چین کے ساتھ بھی بڑے اختلافات تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب چین کا نام لینا بھی جرم تھا اور اس سے بعض افراد کا بلڈ پریشر تیز ہو جاتا تھا چین کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے عمل کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔ پھر ہم نے شرق اوسط میں عربوں کی حمایت کی۔ اس پر میں پاکستان کی ماضی کی ہر حکومت کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ قائداعظمؒ سے لے کر اب تک ہر حکومت نے عربوں کی حمایت کی لیکن بعض وجوہ کی بناء پر یہ حمایت صرف زبانی تھی جو اعلامیوں اور اقوام متحدہ کی قراردادوں تک محدود تھی اور ہمارے عرب بھائی اس کی قدر کرتے تھے لیکن جب میں برسر اقتدار آیا تو میں نے کہا کہ اصل حمایت تو فوجی حمایت ہوتی ہے۔ میری حمایت صرف زبانی نہیں بلکہ یہ ہے کہ آپ کی (عربوں کی) جنگ ہماری جنگ ہے اور پاکستان کا سپاہی اسلام کا سپاہی ہے۔ یہ بات ان لوگوں کو پسند نہ آئی جو جارحیت کا ارتکاب کرنے والے اور جارحیت کا شکار ہونے والوں کے درمیان کوئی فرق کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جب کہ میں نے کھل

www.bhutto.org

کر یہ کہا کہ سوال یہ ہے کہ عرب جارح یا صیہونی جارح ہیں؟ اور جارحیت کا شکار کون ہے' عرب یا یہودی؟ اور یہ فرق ہے ذوالفقار علی بھٹو اور دوسروں کے درمیان۔ قومی اتحاد (پی این اے) کی جس طرح تنظیم کی جارہی ہے اس کو قومی اتحاد کا کوئی ذہن تیار نہیں کر سکتا۔ کیا قومی اتحاد کے پاس ایسا کوئی ذہین ہے جو لوگوں کو بازاروں میں کم قیمت پر سبزیاں فراہم کر دے اور کم قیمت پر بیج تقسیم کر دے؟ کیا قومی اتحاد کے پاس ایسی کوئی تنظیم موجود ہے؟ میں صرف ایک مثال دوں گا۔ ہمارے ملک میں ایسی باتیں کون سوچتا ہے کہ پیسہ جام کر دیا جائے۔ یہ بیرونی خیالات ہیں۔ ایوب خان سے بھی کہا گیا تھا اگر تمہارے خلاف انقلاب آیا تو اس کے جوابی اقدام کے طور پر ہم پیسہ جام آپریشن کروا دیں گے۔ اس مقصد کے لئے دو ہزار افراد بھرتی کئے گئے تھے۔ غیر ملکی ماہرین نے ان کو ریلوے اور طیارے روکنے اور پیسہ جام کرنے کے اقدامات کی تربیت دی تھی۔ جمعہ کے بعد جلوس ہڑتالیں اور مظاہرے تو ہماری سیاست میں ہوتے تھے لیکن یہ پیسہ جام باہر سے بر آمد کی ہوئی چیز ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کی تعمیر نو کی ہے اور اس حد تک کی ہے کہ 1971ء میں مجھے نیویارک میں ایک ذمہ دار شخص نے کہا تھا کہ اب پاکستان کا شمار نیپال' بھوٹان' بنگلہ دیش اور سکم وغیرہ کے ساتھ ہو گا اور ان ہی کے مستقبل سے اس کا تعلق ہو گا کیونکہ پاکستان تو بھارت کے صوبے یوپی کے برابر بھی نہیں ہے لیکن آج چھ سال بعد 1977ء میں یہ صورتحال پیدا ہو گئی ہے کہ بھارت کے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی بھی یہ کہتے ہیں کہ پاکستان انڈیا کا بڑا اور اہم پڑوسی ہے۔ نہ صرف یہ کہ مرارجی ڈیسائی نے یہ بات کہی بلکہ یہ بھی کہا کہ بھارت پاکستان کے ساتھ برابر کے تعلقات چاہتا ہے جبکہ اس سے پہلے بھارت اس پورے خطے پر اپنی بالادستی قائم کرنے کا دعویدار تھا اور ڈاکٹر کسنجر کے دورے کے موقع پر امریکہ نے یہ تسلیم کیا تھا کہ بھارت اس علاقے کا بالادست ملک ہے لیکن میں نے اس وقت بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ہم اس سے صرف برابری کی بنیاد پر تعلقات رکھ سکتے ہیں لیکن اب پاکستان اتنا مضبوط اور مستحکم ہو گیا ہے کہ بھارت نے بالادستی والا موقف ترک کر دیا ہے۔ جغرافیائی طور پر پاکستان کی پوزیشن بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ہمیں جو بھی فوائد یا نقصانات مل سکتے ہیں ان کا تعلق اسی فوجی اہمیت کی پوزیشن سے ہے۔ پاکستان کے جنوب میں بھارت ہے جو بہت بڑا ملک ہے۔ مشرق میں بھارت کے علاوہ بعض دوسرے ممالک ہیں جن میں برما' بنگلہ دیش' بھوٹان' ملائیشیا اور انڈونیشیا شامل ہیں پھر مغرب میں افغانستان ہے جو اہم ملک ہے پھر ایران ہے وہ بھی ایک اہم ملک ہے۔ چین کے ساتھ ہماری 350 میل طویل سرحد ملتی ہے جو فوجی اہمیت کی سرحد ہے جہاں سنکیانگ کا حساس صوبہ ہے جو ہمارے شمالی علاقوں سے ملتا ہے۔ سوویت یونین اور پاکستان کے درمیان صرف نو میل کا سرحدی زون ہے۔ یہ کاریڈور واخان کہلاتا ہے۔ پھر مغرب میں متحدہ عرب امارات' عمان اور دوسری ریاستیں موجود ہیں۔ اسی جانب سعودی عرب ہے پھر جنوب مغرب میں بحیرہ روم اور یونان وغیرہ ہیں۔ اس لحاظ سے پاکستان کی

www.bhutto.org

پوزیشن بڑی اہم ہے۔ خدانخواستہ اگر پاکستان کو کچھ نقصان پہنچا تو مشرقی محاذ' مغربی محاذ اور عرب محاذ کی طرف بہت خراب صورتحال پیدا ہوگی اور اگر پاکستان مستحکم و مضبوط ہوا تو صورتحال مختلف ہوگی۔ پاکستان کمزور ہوا تو متحدہ عرب امارات' عمان اور سعودی عرب کی پیٹھ میں چھرا گھونپا جا سکتا ہے۔ یہ ہے پاکستان کی اہمیت۔ آج جو بڑے پیمانے پر بیرونی مداخلت ہو رہی ہے' یہ کھیل انتخابی دھاندلی کے نام پر شروع کیا گیا ہے۔ اگر دھاندلی کے خلاف لوگ ریل کی پٹریوں پر لیٹ جاتے ہیں اور سینے کھول کر کہتے ہیں کہ ہمیں گولیاں مارو تو ہم نے دھاندلی کا ازالہ کرنے کے لئے ایک طریق کار مقرر کر دیا ہے۔ پھر جہاں تک شریعت کا مسئلہ تھا ہم نے اس کے لئے اقدامات کر دیئے ہیں لیکن اب مولانا مودودی اور نسیم ولی خان کہتے ہیں کہ یہ اصل مسئلہ ہے ہی نہیں۔ حالانکہ ان کے جنرل سیکرٹری رفیق باجوہ نے کہا تھا کہ اگر حکومت نظام مصطفیٰ لے آئے تو ہم دستبردار ہو جائیں گے۔ اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ شریعت یا دھاندلی کا نہیں اس رقم کا ہے جو ملک میں بڑے پیمانے پر بکھیری جا رہی ہے۔ اب وہ میرا استعفیٰ مانگتے ہیں۔ اس وزیراعظم کا استعفیٰ جسے دوبارہ عوام نے منتخب کیا ہے۔ یہ اعزاز لیاقت علی خان' غلام محمد' ناظم الدین کسی کو حاصل نہیں رہا۔ پھر ان لوگوں نے میری پارٹی میں بھی گھسنے کی کوشش کی۔ وزیروں اور ارکان اسمبلی کو بھی ورغلانے کی کوشش کی گئی۔ ہر بیرونی اخبار نویس سوال کرتا ہے کہ آپ کب مستعفی ہوں گے؟ میں نے تو ان سے نہیں پوچھا کہ کیلسان کب مستعفی ہوں گے جو صرف ایک رکن کی اکثریت سے اور لبرل حمایت سے حکومت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور جنہوں نے شمالی آئرلینڈ میں مارشل لاء لگا رکھا ہے۔ وہ کیلہان سے یا اسمتھ سے مستعفی ہونے کے بارے میں کیوں نہیں پوچھتے؟ آخر سارا زلزلہ ذوالفقار علی بھٹو پر ہی کیوں گر رہا ہے؟ اس کی وجہ صرف ایک ہے کہ ہاتھی کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے۔ ہاتھی کو معلوم ہوتا ہے کہ میں پاکستان کے استحکام کا ستون ہوں اور اس کے استحکام کی علامت ہوں۔ اس لئے ہاتھی مجھے ہٹانا چاہتا ہے۔ مسئلہ ایک فرد کا نہیں بلکہ مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کیا چاہتا ہے؟ میں نے جب اسلامی کانفرنس بلائی تو اسے ایک ماہ کے لئے ملتوی کرنے کے لئے کہا گیا۔ اسے ملتوی کر دیا گیا تو پھر مزید ایک ماہ کے لئے ملتوی کرنے کے لئے کہا گیا جو میں نے کر دی۔ پھر جب مجھے تیسری بار یہ کانفرنس ملتوی کرنے کیلئے کہا گیا تو میں نے شاہ فیصل کو خط لکھا۔ انہوں نے مجھ سے مکمل اتفاق کیا اور کہا کہ یہ کانفرنس فروری میں ہوگی اور پاکستان میں ہوگی اور اس میں مزید التواء نہیں ہوگا۔ پھر جب اکتوبر میں بنری کسنجر پاکستان آئے اور ان کے ساتھ میری بات ہوئی تو انہوں نے کیا کہا اور میں نے کیا جواب دیا یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ وہ خود کتاب لکھ رہے ہیں شاید اس میں ذکر کریں یا نہ کریں۔ بات تو یہ ہے یہ اسلامی کانفرنس ہی تھی جس کے بعد یاسر عرفات نے اقوام متحدہ میں خطاب کیا اور تنظیم آزادی ء فلسطین کو تسلیم کیا گیا پھر ہم نے یونان اور ترکی کا تنازعہ طے کروانے کی کوشش کی۔ اس طرح کوریا سے بھی شمالی اور جنوبی کوریا کا تنازعہ طے کروانے کیلئے پاکستان کی طرف رجوع کیا۔ ہاتھی نے ان سب باتوں کو پسند نہیں کیا کہ پاکستان کو یہ

www.bhutto.org

مقام حاصل ہو۔ آج اپوزیشن نے اپنی انتخابی مہم پر ہر بات کا ذکر کیا اور گالیاں تک دیں مگر ایک نہایت اہم بات چھوڑ دی۔ اس پر کچھ نہ بولے اور یہ بات پاکستان اور فرانس کے درمیان ایٹمی پلانٹ کی خریداری کے معاہدے کی تھی جبکہ اس اپوزیشن کو معلوم تھا کہ اس مسئلے پر عالمی دباؤ ہے۔ ہر سوال پوچھا گیا لیکن یہ نہیں پوچھا گیا کہ اس معاہدے پر کیا کیا جانے والا ہے؟ انہیں' مجھ سے یہ پوچھنا چاہئے تھا کہ آپ اس معاہدے کو ختم کریں گے یا اسے مکمل کریں گے؟ میں نے یہ معاہدہ آخر اپنے ذاتی مفاد کیلئے تو نہیں کیا تھا۔ یہ لوگ میرے خون کے پیاسے کیوں ہیں؟ یہ شکاری کتے میرے خون کے پیاسے کیوں ہیں؟ صرف اس لئے کہ میں نے اس مسئلہ پر قومی موقف اختیار کیا ہے۔ اس طرح وہ تیسری دنیا کی کانفرنس سے بھی پریشان ہیں کہ اس شخص (بھٹو) نے آزادانہ فیصلے کئے ہیں اور یہ ہمارے لئے مصیبت کا سبب بن گیا ہے۔ جب کہ میری حکومت کی یہ پالیسی نہیں کہ ہم ایٹم بم بنائیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں ایٹمی ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنے سے کیوں روکا جائے۔ اگر جنگ کے لئے نہیں بلکہ امن مقاصد کے لئے تمام ضمانتیں دیتے ہوئے ایٹمی ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس سے روکنے کا کیا جواز ہے؟ وہ ہمیں صرف اس لئے روک رہے ہیں کہ پاکستان کو ایٹمی توانائی بنانے کی صلاحیت حاصل نہیں ہونی چاہئے۔ جب ہنری کسنجر آئے تو انہوں نے ایٹمی پلانٹ پر سخت مخالفت پر مبنی موقف اختیار کیا۔ پھر وہ فرانس گئے اور وہاں اخبارات میں خاصی ہنگامہ آرائی رہی۔ پھر (امریکہ کی طرف سے) مجھ سے کہا گیا کہ میں اس پر مذاکرات کروں۔ میں نے کہا کہ انتخابات ہو جانے دیں۔ اس کے بعد پھر مذاکرات پر زور دیا گیا تو میں کہا اب میرا انتخاب ہو رہا ہے۔"

یہ ہیں وہ باتیں کہ بھٹو نے پلانٹ پر مذاکرات نہ کئے تو امریکیوں نے پی این اے کے ذریعے ان کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کروا دیا جس میں نظام مصطفیٰ اور انتخابی دھاندلی کا ڈھونگ رچایا گیا۔ شہید بھٹو نے اسی بنیاد پر اپنی اس تقریر میں آگے چل کر کہا۔

"ایٹمی پلانٹ کے بارے میں میرے قوم پرست موقف کی وجہ سے "بلڈ باؤنڈ" میرے خون کے پیاسے ہیں۔ عوام کو اصل کہانی سے ضرور واقف ہونا چاہئے۔ میں کل تک خاموش رہا ہوں۔ اب عوام کو اصل کہانی کا ضرور پتہ ہونا چاہئے کیونکہ یہ بہت بڑی سازش ہے' میں نے اب تک صبر و تحمل سے کام لیا ہے۔ یہ کوئی دیسی سازش نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی سازش ہے لیکن میں نے ماضی میں بھی سازشوں کا مقابلہ کیا ہے اور اس کا بھی کروں گا میں اقتدار سے چمٹا نہیں رہنا چاہتا لیکن میں اپنا مشن مکمل کر کے رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ صلاحیت دی ہے کہ میں ملک کی خدمت کروں۔ میں نے عورتوں' مزدوروں اور کسانوں کو آزادی دلائی اور اجارہ داری ختم کی۔ اس طرح میرے مشن کا پہلا حصہ تو مکمل ہو گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ افغانستان کے ساتھ باعزت اور باوقار سمجھوتہ ہو جائے۔ اس معاملے کو کافی حد تک آگے بڑھایا جا چکا ہے۔ صدر داؤد سے گذشتہ جون کے مذاکرات میں بڑی حد تک اجمالی مفاہمت ہو چکی ہے۔

www.bhutto.org

علاوہ ازیں میں مسلح افواج کی صلاحیت کو بھی مزید بڑھانا چاہتا ہوں اور اس کام کیلئے میں 1963ء سے کوشاں ہوں۔ تیسرے یہ کہ مسئلہ کشمیر کو ہم باوقار اور باعزت طور پر حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تاہم اس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔ اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پہلے میں اپنے دو کام مکمل کر لوں گا اور تیسرے کو مکمل کرنے کی بھی پوری توقع رکھتا ہوں اور پھر ضروری تو نہیں کہ آدمی اپنے تمام مشن مکمل کرے۔ ماؤزے تنگ بھی اپنے تمام مشن مکمل نہیں کر سکے۔"

اب یہ بات وضاحت طلب نہیں رہ گئی کہ وہ تین کام کیا تھے جو شہید بھٹو کے سامنے تھے۔ افغانستان کے ساتھ سرحدی تنازعے کا حل 'مسئلہ کشمیر کا حل' جس کی بنیاد انہوں نے عوام کے حق خود ارادی کو قرار دیا تھا اور پاکستان کی ایٹمی صلاحیت جس کی بنیاد انہوں نے رکھی تھی اور حیرت انگیز طور پر جانتے تھے کہ یہ ان کی زندگی کے بعد پورا ہو گا۔

نفاذ شریعت کے نام پر مذہبی جنون پھیلانے والوں کو بے نقاب کرتے ہوئے اس تقریر میں شہید بھٹو نے کہا "نفاذ شریعت کا مطالبہ کرنے والے اب اس مسئلہ کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ نظام مصطفیٰ کے نام پر اپوزیشن نے ملک میں جنون پھیلا دیا تھا لیکن اب مولانا مودودی جیسی شخصیت کہہ رہی ہے کہ یہ اصل مسئلہ نہیں ہے۔"

اس مذہبی جنون کے پیچھے بھی 'اس امریکی حکمران طبقے کا ہاتھ تھا جسے شہید بھٹو نے ہاتھی کا نام دیا تھا کیونکہ ہاتھی اس وقت امریکہ میں حکمران پارٹی کا انتخابی نشان بھی تھا۔ امریکی مفادات کیلئے اگر مذہبی جنون کو پھیلانے کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو ہٹلر یاد آتا ہے جس نے پارٹی کے آغاز میں نیشنل سوشلزم کا نعرہ لگایا لیکن اپنے فاشزم کی بنیاد رکھتے ہی مذہبی جنون اور فیملی اسٹرکچر کے نام پر ذات پات کے اسی ہتھکنڈے کو استعمال کرنا شروع کر دیا جسے قدیم دور میں تو برہمنوں اور کھشتریوں نے استعمال کیا تھا لیکن اس کے بعد تاتاری اور منگول حملہ آور جہاں جہاں بھی پھیلے ان میں بھی ہلاکو خان اور چنگیز خان نے اسی ذات پات کے نعرے کو استعمال کیا۔ نظام مصطفیٰ کے نام پر پاکستان میں مذہبی جنون اور فرقہ واریت پھیلانے والوں کے آقا جنرل ضیاء الحق نے پردے کے پیچھے بیٹھ کر اس سارے جنون کی نگرانی کی اور خود بھی امریکی کمان کے تحت کام کیا۔ بعد میں اسی جنرل ضیاء نے سیاسی جماعتوں کو سیاست سے نکال دیا اور بلدیاتی انتخابات بھی ذات برادری اور مذہبی جنون کے نام پر منعقد کئے۔ پاکستان میں مذہبی جنون اور ذات پات کو استعمال کرنے کے جس منصوبے پر سرمایہ دار بلاک کے ایجنٹوں نے بے رحمی سے عمل کر کے وہ مثال دہرادی' جس طرح جرمنی کے بلند ترین سرمایہ دار طبقے نے جمہوریت کے خلاف فاشزم کی مہم چلائی اور اس میں مڈل کلاس کو استعمال کیا تھا۔ اسی طرح امریکی سرمایہ دار اور جمہوریت کے زیر اثر ملٹی نیشنل کارپوریشنوں نے بھی اپنی پاکستان جیسی کالونیوں میں جمہوریت کو قتل اور فاشزم کو رائج کیا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ صدیوں پہلے بورژوا انقلاب لانے والے مغربی ملکوں کا جو سرمایہ دار طبقہ جمہوریت کو طلاق دے کر فاشزم

www.bhutto.org

کے جرثومے پھیلانے شروع کر دیئے اور سوشلسٹ اور قوم پرست تحریکوں کے خلاف پوری دنیا میں فاشزم کا وہی نظریہ استعمال کیا جو ہٹلر نے استعمال کیا تھا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستان میں روس نوازی کا نعرہ لگانے والے جو گروپ اور پارٹیاں موجود تھیں ان کے لیڈروں کی زیادہ تعداد بھی امریکی پشت پناہی پر چلنے والی پی این اے کی فاشسٹ تحریک کے ساتھ مل گئی۔ انہوں نے اپنی غلطی سے پاکستان میں بائیں بازو کی تحریک کو بھی تباہ و برباد کر ڈالا اور شہید بھٹو کی پاپولسٹ انداز میں بڑھنے اور پھولنے والی انقلابی تحریک کو کچل دیا اور بھٹو کو پھانسی لگوانے کیلئے ولی خان جیسے سیکولرازم اور قوم پرستی کا دعویٰ کرنے والے لیڈر نے بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد " پہلے احتساب پھر انتخابات " کا نعرہ لگا دیا بہرحال بھٹو شہید ہو کر امر ہو گئے لیکن جعلی سوشلسٹ اور اسلام پسند بے نقاب ہو گئے۔

قومی اسمبلی کے 28 اپریل 1977ء کے اس اجلاس کے آگے پیچھے ایک طرف تو امریکی منصوبے کے ترجمان اخبارات 'پی این اے کی تعریفیں اور بھٹو کی مخالفت کر رہے تھے لیکن دوسری طرف ان کی حکومت کو ختم کروانے اور پھانسی کے تختے تک پہنچانے والے امریکہ کا صدر جمی کارٹر' 29 نومبر 1976ء کو شہید بھٹو کے نام اپنے خط میں انہیں لکھ رہا تھا کہ

" میں دونوں ممالک کے مابین دوستی کے روابط کو مستحکم کرنے کیلئے آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے کا متمنی ہوں۔ براہ کرم میری طرف سے داد قبول کیجئے اور حد درجہ آداب قبول کیجئے۔ "

لیکن اس کے ساتھ ہی امریکی میڈیا این بی سی کے نشریاتی مبصر ڈیوڈ برنکلے نے کہہ دیا تھا کہ " وزیراعظم بھٹو تو چینی کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین ماؤزے تنگ کے پیارے لیڈر ہیں۔ "

لیبیا کے صدر کرنل قذافی نے اگرچہ 25 فروری 1974ء کو ہی تیسری دنیا کے لوگوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ بھٹو کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہو جاؤ لیکن 1976ء سے 1977ء تک قذافی اور یاسر عرفات کو بھی امریکی سازشوں کا سامنا تھا اور پاکستان کے ایٹمی پلانٹ میں مدد دینے والے سعودی عرب کے شاہ فیصل کو بھی بالآخر شہید کر دیا گیا تھا۔ اس توقع پر عوامی جمہوریہ (شمالی) کوریا کے صدر کم ال سنگ نے 21 مئی 1977ء کو اپنے سرکاری بیان میں کہا تھا کہ " پاکستان کے ممتاز رہنما وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو غیر ملکی مداخلت کو ناکام بنانے اور اندرون ملک غیر ملکی طاقتوں کے ایماء پر کام کرنے والے رجعت پسندوں کی رشیہ دوانیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے جو کوشش کر رہے ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا مقصود پاکستان کے عوام کی اُمنگوں کے مطابق ملک کی سلامتی کا تحفظ ہے۔ "

اس کے علاوہ عراق اور شام کے سربراہوں اور یاسر عرفات سے لے کر چین کی حکومت تک سب شہید بھٹو کی حمایت کر رہے تھے لیکن ان سب کی حمایت پاکستان کے اندر اس وقت مؤثر کیسے ہو سکتی تھی جب پیپلز پارٹی کے اندر گھسے ہوئے موقع پرستوں اور سازشیوں نے پارٹی کو اس قابل بننے ہی نہیں دیا تھا

www.bhutto.org

اور جنرل ضیاء الحق کو یہ موقع مل گیا تھا کہ وہ اپنی غلیظ فاشسٹ سازش میں کامیاب ہو جائے اور یہی ہوا۔ شہید بھٹو کو پھانسی نہ دینے کی اپیل کرتے ہوئے پوری دنیا کے سربراہوں نے جنرل ضیاء کو خط لکھے مگر جنرل ضیاء کے اصل سرپرست اسرائیل اور امریکہ یہ چاہتے تھے کہ بھٹو کی جان باقی نہ رہے۔ اس لئے جنرل ضیاء الحق اپنی قاتلانہ روش سے باز نہ آیا۔ جو کچھ بھی جنرل ضیاء الحق نے کیا۔ اس کا پس منظر شہید بھٹو کے اس طویل عدالتی بیان میں نظر آتا ہے جو انہوں نے اپنی جسمانی زندگی کے آخری مہینوں میں سپریم کورٹ میں دیا تھا اس بیان چند حصوں کو میں یہاں پیش کر رہا ہوں تاکہ یہ بتا سکوں کہ بھٹو کی شہادت کے پس منظر کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے اس کی بنیاد شہید بھٹو کے الفاظ پر ہی اٹھائی ہے اپنے اس بیان میں شہید بھٹو کہتے ہیں۔

"میں نے اپنی 4 دسمبر والی درخواست میں یہ استدعا کی تھی کہ میں اس معزز عدالت کے سامنے پیش ہونا چاہتا ہوں کیونکہ میرے نقطہ نظر کے مطابق میری زندگی بحیثیت ایک انفرادی زندگی کی حیثیت میں اس مقدمے میں ملوث ہے جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ معروضی حالات بھی داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ میری شہرت' میرے خاندان کا وقار' میرا سیاسی مستقبل اور ان سب سے بڑھ کر پاکستان کا مستقبل بھی اس مقدمے میں ملوث ہے۔"

بھٹو شہید کے ان ابتدائی جملوں سے ہی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس مقدمے میں پاکستان کا مستقبل کیسے ملوث تھا؟ بعض نا اہل اور متعصب افراد یہ کہتے ہیں کہ بھٹو کے شہید ہونے سے پاکستان کے ٹکڑے تو نہیں ہو گئے۔ اس لئے ان کے اس جملے کو اہمیت کیوں دی جائے؟ لیکن میں یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا کسی ملک کے تباہ ہونے کا مطلب صرف اس کا جغرافیائی طور پر ٹکڑے ہونا ہوتا ہے؟ میری نظر میں کسی ملک کا محض جغرافیائی طور پر قائم رہنا لیکن اقتصادی طور پر برباد ہو جانا بھی اس ملک کی تباہی کہلاتا ہے لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پاکستان اقتصادی طور پر برباد نہیں ہوا بلکہ ترقی یافتہ ملک بن گیا ہے تو اس حقیقت کی کوئی تردید ہو سکتی ہے کہ پاکستانی معاشرے میں جو نراجیت' قتل وغارت' بے عزتی اور بے آبروئی اور فسادات جیسے عوامل دس سال کے مارشل لاء میں ابھر کر سامنے آئے ہیں انہوں نے پاکستانی معاشرے کو ایک قیامت خیز معاشرہ بنا دیا ہے۔ اگر ترقی اس بات کا نام ہے کہ کسی ملک میں جدید کمپیوٹر اور جدید فیشن انتہا پر پہنچے ہوئے ہوں لیکن یہ سب کچھ انسان کی فنکارانہ صلاحیتوں کی بجائے تصنع اور سودے بازی کی بنیاد پر چل رہا ہو تو یہ کہنا ایک حقیقت ہو گا کہ پاکستان کا مستقبل ان دس سالوں کے دوران برباد کر دیا گیا ہے اور اگر اس کو بچانے کے لئے کوئی راستہ نکالا ہے تو وہ شہید بھٹو کی بیٹی اور اس کے ساتھیوں نے صرف اور صرف جمہوری جدوجہد میں بے مثال قربانیاں دے کر نکالا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ڈی پولیٹیکلائزیشن کے ذریعے چھچھ ذہنیت رکھنے والے کرداروں کو سیاستدانوں کا نام دیدیا گیا اور ان کو مجلس شوریٰ سے لے کر اسمبلیوں تک محض ذاتی مفاد استحصال اور رشوت وسفارش کا دھندا چلانے کے لئے بٹھایا گیا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ذات پات' کمرشل ازم اور مذہبی جنونیت کی آڑ میں

www.bhutto.org

ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر کو رائج کیا گیا اور ظالم و مظلوم کی جنگ میں مظلوموں کو جو راستہ بھٹو شہید نے دکھایا اس کو روک کر لسانی اور فرقہ وارانہ فسادات کو رائج کر دیا گیا کیا یہ حقیقت نہیں کہ مسئلہ افغانستان میں سوویت سربراہ برژنیف کی غلطی کی مخالفت کا بہانہ بنا کر امریکی حکومت کی غلط کاریوں کی غلامی کر کے پوری قوم کو جنگ میں جھونک دیا گیا۔ مسئلہ افغانستان کے نام پر کروڑوں روپے کی منشیات اور اسلحہ فروشی کے دھندے چلائے گئے اور ملک کی تمام اندرونی اور بیرونی آمدنی کو صنعتکاری میں لگانے کی بجائے مرکنٹائل ازم کے پھیر میں ڈال دیا گیا جس کے فائدے صرف زر پرست طبقوں' مذہبی جنونیوں اور بدعنوان افسروں کو پہنچے اور ملک کے عوام ایک سطحی فسکل پالیسی کے جھنجھٹ میں الجھ کر رہ گئے۔

اگر یہ دیکھا جائے کہ بھٹو جیسی ایک شخصیت اور ان کے ایک خاندان کو کیوں عذاب میں ڈالا گیا تو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ تاریخ کے ارتقائی سفر میں ترقی پسند تحریکوں نے جو بھی تخلیقی اور مثبت کردار ادا کیا ہے اس میں ایک فرد کا کردار لاکھوں کروڑوں عوام کے کردار سے جدا نہیں ہوتا اور وہ فرد ذوالفقار علی بھٹو جیسی شخصیت ہو تو یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ شخصیت مظلوم طبقوں کا کوئی انقلاب خواہ نہ لا سکے' لیکن اس انقلاب کے سرچشموں کو متحرک اور فعال ضرور بنا کے جاتی ہے یہی وہ کام تھا جو شہید بھٹو نے کیا اور اسی کام کی وجہ سے ان کو سزائے موت سنائی گئی تاکہ ان سرچشموں سے پھوٹنے والے انقلاب کا راستہ روکا جائے یا اس کے آنے میں تاخیر کی جائے۔ اپنے عدالتی بیان میں شہید بھٹو نے جو کہا ہے کہ معروضی حالات بھی اس مقدمے میں داؤ پر لگے ہوئے ہیں تو اس بات کا مطلب ان کی تقریروں میں خاص طور پر سمجھ میں آجاتا ہے جن میں سے ایک انہوں نے اگست 1976ء میں ہنری کسنجر کے سامنے لاہور میں کی تھی اور دوسری اپریل 1977ء میں قومی اسمبلی میں۔ یہ دونوں تقریریں پچھلے صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں۔

مارشل لاء کے دور میں سامنے آنے والی پاکستان کی بدنصیبیوں کے مذکورہ بالا مختصر سے خاکے سے پتہ چلتا ہے کہ شہید بھٹو کی نظریں کتنے فاصلوں تک دیکھ رہی تھیں۔ انکی نظروں نے جو کچھ دیکھا اس کی تمام تفصیلات کا منظر نامہ' ہزاروں صفحات چاہتا ہے شہید بھٹو کے مزید جملوں کو دیکھیے۔ 'ملاؤ قاضی' افسر اور امریکی اس مقدمے کے پس منظر میں بھٹو کو قتل کرنے کے لئے کس طرح سنگینیں تانے کھڑے تھے اور بھٹو اپنے عظیم حسینی کردار کو کس طرح نبھا رہے تھے؟ عدالت میں جو کچھ انہوں نے کہا وہ سب کچھ ہو گیا۔

(1) میں اپنی موت کی چھوٹی سی کوٹھری سے وہ جبر اور مجبوریاں دیکھ سکتا ہوں جو اس کیس کے خاتمے کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ یہ جبری عوامل مجھ پر اسی طرح واضح ہیں جیسے میں ایک پینوراما دیکھ رہا ہوں۔

(2) میں جب اپنی قید کے دوران مارشل لاء کے خلاف نصرت بھٹو کیس میں پیش ہوا تو میں نے

www.bhutto.org

تب بھی عدلیہ سے کہا تھا کہ اس فیصلے (جو مارشل لاء کے نفاذ کے بارے میں دیا گیا تھا) کے لئے آپ کو ایک وقت کا تعین کر دینا چاہئے اور آئین میں اندھا دھند ترامیم کرنے کی اجازت نہ دی جائے..... موجودہ مارشل لاء حکومت اس فیصلے کو بے معنی اور بے اختیار بنا کر رکھ دے گی..... میں نے (نصرت بھٹو کیس کے دوران) یہ بتایا تھا کہ وقت گذرنے کے ساتھ ہی سیاسی جماعتوں کو ختم کیا جائے گا' سیاسی جماعتیں توڑ دی جائیں گی..... آئین کی چھتری نہیں ہوگی تو پھر آئین کے خلاف ہونے کی وجہ سے قومیتوں کے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے پاکستان ایک فیڈریشن تھا لیکن اب یہ فیڈریشن نہیں رہا۔ اب اسے ایک ہی ہاتھ میں دی جانے والی حکومت کے انداز میں چلایا جا رہا ہے۔ مائی لارڈ! ہم فیڈریشن کے اجماع پر بہت دشوار' کٹھن اور تکلیف دہ مرحلے سے گذر کر پہنچے تھے۔ اب مصائب کے صندوق کا ڈھکن کھل گیا ہے اور میں تو یہاں کھوں گا کہ مجھے صورتحال دیکھ کر بے حد تکلیف محسوس ہوتی ہے کہ سیاسی جماعتوں کی کس طرح بچہ کشی کی جا رہی ہے۔ یہ پارٹیاں ہی ملکی رابطے ہوتی ہیں۔ اگر ان رابطوں کو کمزور یا سخت کر دیا جائے تو پھر قومی ڈھانچہ کبھی برقرار نہیں رہ سکتا..... چار قومیتوں کا مسئلہ انتہائی تیزی سے پھل پھول رہا ہے اگر انتخابات کے لئے کسی مدت کا تعین کر دیا جاتا تو موجودہ صورتحال جس کا آغاز تب (نصرت بھٹو کیس) سے ہوا ہے کبھی اتنی خطرناک شکل اختیار نہ کرتی۔

(3) میرے بارے میں (اس عدلیہ میں) کہا گیا کہ صرف نام کا مسلمان ہوں..... میری یوں اعانت کی گئی جیسے نو آبادیوں کے باشندے کے کی جاتی ہے..... میری بار بار بلا جواز بے عزتی کی گئی۔

(4) میرے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ میں ایک مستند ظالم' ایک ڈکٹیٹر اور ایک ہٹلر تھا۔ حال ہی میں ایک شخص نے اپنے آپ کو فاشسٹ کے سانچے میں ڈھال لیا ہے..... ہٹلر ایک فاشسٹ تھا لیکن اس نے کبھی اپنے آپ کو رائیٹسٹ نہیں کہا لیکن میں ایک ایسا شخص ہوں جسے ہٹلر کہا گیا۔

(5) جب جیل سے دو قیدی بھاگ گئے تو مجھے سربمہر کر دیا گیا۔ مجھے مصطفیٰ کھر نے مری میں مشورہ دیا کہ میں ملک چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ لوگ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ میں اپنا ملک نہیں نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنی جڑوں سے اپنا تعلق ختم نہیں کروں گا۔ 13۔ ستمبر کو صادق حسین قریشی کے گھر میں پریس کانفرنس کے بعد ایک غیر ملکی صحافی نے' جس کا نام میں نہیں بتا سکتا مجھے ایک طرف لے جا کر کہا کہ مسٹر بھٹو میں آپ کو بتا نہیں سکتا آپ کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے؟ آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ یہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں چونکہ میں آپ کا ایک مداح ہوں اس لئے آپ کو یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے بتایا کہ میں اپنا ملک نہیں چھوڑ سکتا اور اس سے کوئی مزید بات نہیں سننا چاہتا تاہم اس شخص کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ اس کے بعد اس نے کہا " پلیز آپ لاڑکانہ نہ جائیں کسی اور جگہ چلے جائیں آپ کو قطعاً اندازہ نہیں کہ آپ کے خلاف کیا کیا ہو رہا ہے؟ " میں نے اسے کہا کہ میں لاڑکانہ جاؤں گا۔ میری زمین جہاں میں پیدا

www.bhutto.org

ہوا۔ جس سے میرا تعلق ہے اور میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے معافی نہیں چاہیئے۔"

(6) میرے لئے راتوں رات عدالت میں ایک کٹہرا بنایا گیا..... نواب کالاباغ کے بیٹے پر لاہور ہائیکورٹ میں مقدمہ چلا لیکن ایسے کسی کٹہرے کے پیچھے کھڑا نہیں کیا گیا 23 نومبر کو ایک عجیب مماثلت پیش کرتے ہوئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کہا کہ جرمن جرنیلوں پر بھی تو فورم برگ میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ یہ بھلا کیا موازنہ ہوا۔ ہٹلر ایک ظالم تھا وہ ایک لعنت تھا..... وہ ایک درندہ تھا۔ اس نے ایک تہذیب کو برباد کر دیا۔ اس نے یورپ کی روشنیاں گل کر دیں۔ غیر ملکی فاتح فوجیں آئیں اور انہوں نے جرمن فوجوں پر مقدمے چلائے کہ انہوں نے چالیس ملین انسانوں کی ہلاکت میں حصہ لیا تھا۔ اس کے باوجود 'ان مقدموں پر تنقید کی گئی۔ گوئرنگ کے خلاف جیکسن نے جو استغاثہ پیش کیا' سے تقریباً دوبالا کر دیا گیا تھا جبکہ دنیا جانتی ہے کہ گوئرنگ چنگیز خان سے بھی بدتر انسان تھا' اس پر چالیس ملین انسانوں کی ہلاکت کا الزام تھا یہ جو مثال جرمن جرنیلوں کے حوالے سے فاتح فوج کی دی گئی ہے اس میں یہ ذکر بھی ناگزیر ہے کہ جرمن جرنیلوں کے ساتھ مجھ سے بہتر سلوک کیا گیا تھا۔ انہیں عدالت میں عمدہ نشستوں پر قطار کے ساتھ بٹھایا گیا تھا۔ ان کیلئے کٹہرے تعمیر نہیں کئے گئے تھے۔

(7) جب میں شدید بیمار تھا تو مجھے کہا گیا کہ علاج کیلئے عدالت سے اجازت لوں اور جب میں نے اپنی بیٹی سے ملاقات کیلئے کہا' جسے میں شدید چاہتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میرے بیٹے مجھے مایوس کریں گے تو بھی میری بیٹی مجھے کبھی مایوس نہیں کرے گی' ملاقات کیلئے اس درخواست کے ضمن میں کہا گیا کہ یہ عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہے کیونکہ مجھے مارشل لاء ریگولیشن نمبر 12 کے تحت حراست میں لیا گیا ہے۔ اس لئے عدالت کا مجھ پر کوئی اختیار نہیں جبکہ اس کے ساتھ ساتھ عدالت نے ایک سینئر افسر کو روزانہ میرے ساتھ متعین کیا ہوا تھا کہ وہ ہر روز میرے ساتھ جیل سے عدالت تک جائے۔ عدالت جہاں چاہتی اپنے اختیارات کا مظاہرہ کرتی اور جہاں اس کی مرضی نہیں ہوتی یہ دلیل دے دی جاتی تھی کہ یہ عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

(8) اب اگر یور لارڈ شپ! مجھے ازراہ مہربانی یہ بتا دیں کہ وہ کتنی دیر تک میری شنوائی کر سکتے ہیں تو میں ترجیحات کا تعین کر لوں اور اپنے دلائل اور نکات کو مختصر کر سکوں۔ میں اپنی دوسری وجوہ سے قطع نظر بعض چیزوں کو ان کے صحیح تناظر میں پیش کرنے کیلئے بھی کچھ کہنا چاہوں گا کہ اس وقت ہمارے ملک کے حالات کیا ہیں؟ اس خطے میں کیا حالات ہیں؟ اور پوری دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ کیونکہ 'یقین کیجئے پاکستان اس وقت بہت نازک اور خطرناک دور سے گذر رہا ہے۔ مائی لارڈ! اس حقیقت کا تعلق حکومتوں یا خاص افراد کے ساتھ بالکل نہیں ہو گا شاید آپ کہیں گے کہ میں بڑا خود پسند یا بڑ ہانکنے والا شخص ہوں لیکن یقیناً آپ یہ محسوس کریں گے کہ ہمارے ملک میں کتنا سوا کن خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ یہ ایک بنجر اور بے ثمر خلاء ہے۔ ایک سال قبل جب میں کوٹ لکھپت جیل میں تھا' میں نے یہ کہا تھا کہ ایک برس کے اندر

www.bhutto.org

بھارت کا وزیر خارجہ پاکستان کے بارے میں ایک سخت بیان دے گا۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ صدر سادات یروشلم چلے جائیں گے اور میں نے نتائج کی پیش گوئی بھی کر دی تھی۔ آج بطور خاص طاقت کا توازن بری طرح منتقل ہو چکا ہے اور اس تیزی سے منتقل ہو رہا ہے کہ برصغیر ایک نئی سیاسی صورتحال کا سامنا کر رہا ہے۔ اس مرحلے پر چیف جسٹس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر بھٹو! اس وقت تک بول سکتے ہیں جب تک کہ وہ اس مقدمے سے تعلق رکھنے والے امور کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہیں' تو عدالت یقینی اور فطری طور پر ان کی سماعت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ جہاں تک دوسرے امور کا تعلق ہے' اگرچہ وہ ملک کیلئے بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور وہ ان معزز ججوں کیلئے بھی پاکستانی شہری ہونے کے حوالے سے مفید ہوں گے' خاص طور پر اس لئے کہ ان امور کے بارے میں مسٹر بھٹو اظہار خیال کریں گے جو کہ امور خارجہ میں گہری بصیرت رکھتے ہیں' لیکن عدالت کو مقدمات کے دائرے میں رہنا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے معاملات عموماً متعلقہ نہیں ہوتے۔

شہید ذوالفقار علی - "مائی لارڈ! آپ نے جو فرمایا ہے میں اسے فوراً تسلیم کرتا ہوں۔"

مسٹر جسٹس حسن شاہ نے مسٹر بھٹو سے پوچھا کہ کیا وہ اپنا بیان کل بھی جاری رکھنا پسند کریں گے تو مسٹر یحییٰ بختیار نے واضح کیا کہ مسٹر بھٹو تھک چکے ہیں اس لئے اس بیان کو پرسوں جاری رکھنا زیادہ مناسب ہو گا۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو - "یہ پہلا موقع ہے کہ میں قید تنہائی سے باہر نکلا ہوں۔ میرے لئے یہ بہت مشکل ہو رہا ہے کہ میں اس توازن اور برابری کو ایڈجسٹ کر سکوں۔ میں تو کھڑا بھی مشکل سے ہو سکتا ہوں۔"

سماعت اگلے دن نو بجے تک ملتوی کر دی گئی۔ مسٹر یحییٰ بختیار نے استدعا کی کہ عدالت کا وقت نو بجے سے ساڑھے نو بجے کر دیا جائے لیکن چیف جسٹس نے کہا کہ نو بجے کا وقت ہی مناسب ہے کیونکہ مسٹر بھٹو جلدی جاگ جانے کے عادی ہیں۔

شہید بھٹو - سحر خیز مائی لارڈ! مجھے تو سونے کی اجازت ہی نہیں دی جاتی۔ کوٹ لکھپت جیل میں پچاس پچاس میری کوٹھڑی کے قریب لا کر تین ماہ تک رکھے گئے۔ وہ سارا وقت چیختے چلاتے رہتے تھے اور میرے لئے سونا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد مجھے راولپنڈی لایا گیا تو یہاں شروع میں یہ کھیل کھیلا گیا کہ میری کوٹھڑی کی چھت پر کنکر اور پتھر پھینکے جاتے تھے۔ پہلے پہل تو میں نے سوچا کہ شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں لیکن رمضان کے دنوں میں' میں سحری کے انتظار میں جاگتا رہتا تھا تب میں نے نیچے کی چھت پر شور سنا جو ہر پندرہ بیس منٹ کے وقفے کے بعد کیا جاتا تھا۔ تب مجھے اس حقیقت کا احساس ہوا۔ چھت پر کنکر اور پتھر پھینکے جاتے تھے جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو ایک نیا حربہ اختیار کیا گیا کہ میری کوٹھڑی کے بالکل قریب ایک مورچہ ہے جہاں ایک فوجی گارڈ متعین ہے۔ اب وہاں وقفوں کے بعد وہ گارڈ چھلانگ لگاتا تھا۔ یوں

www.bhutto.org

کنکروں پتھروں کی جگہ ان خوفناک چھلانگوں کے شور نے لے لی۔ یہ شور دہرا ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک گارڈ کی جگہ کئی گارڈ متعین ہیں۔ پچھلی رات میں نے سوچا کہ اس مسلسل اذیت سے نجات مل جائے کیونکہ مجھے صبح عدالت جانا ہے لیکن یہ شور بدستور قائم رہا۔ یور لارڈشپ! یہ میری روح' میرا عزم اور میری قوت ارادی ہے اور یہ کہ میں ایک رہنما ہوں' ان وجوہ کی بناء پر میں پر اذیت ابتلاء کا سامنا کرنے کے قابل ہوں اور یہاں بھی حاضر ہو گیا ہوں۔ ایک عام آدمی کب کا تباہ و برباد ہو چکا ہوتا اور بکھر چکا ہوتا۔ آپ نہیں جانتے کہ میں کتنا پریشان اور بدحال ہو چکا ہوں' میں ختم ہو چکا ہوں۔ مجھے پچیس دنوں سے موت کی اس کوٹھڑی میں پانی تک نہیں دیا گیا۔ کل ہی میری طبیعت کچھ سنبھلی ہے۔ اگر یور لارڈشپ کی یہی مرضی ہے تو میں کل نو بجے حتیٰ کہ آٹھ بجے بھی آ سکتا ہوں۔

(9) مجھے اسی عدالت میں کہا گیا کہ میں صرف نام کا مسلمان ہوں۔ آج (دوسرے دن) بات کا آغاز نام کے مسلمان کے مسئلے سے کروں گا اور ان پیراگرافس کا حوالہ دوں گا جو اس موضوع پر ٹرائل کورٹ نے اپنے فیصلے میں شامل کئے ہیں جو پیراگراف نمبر 609 سے 615 تک محیط ہیں۔

مائی لارڈ! ایک اسلامی ملک میں ایک کلمہ گو کیلئے یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہو گا کہ وہ ثابت کرے کہ وہ مسلمان ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلامی تمدن کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے کہ ایک مسلمان صدر' ایک مسلمان رہنما' ایک مسلمان وزیراعظم جسے مسلمان قوم نے منتخب کیا ہو' ایک دن اپنے آپ کو اس حیثیت میں پائے کہ جہاں اسے یہ کہنا پڑے کہ "میں ایک مسلمان ہوں۔" یہ ایک ہراساں کر دینے والا مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک کربناک معاملہ بھی ہے۔ یور لارڈشپ! یہ مسئلہ کیسے کھڑا ہوا؟ آخر کس طرح؟ یہ مسئلہ اصطلاحاً عوام کے انقلاب یا کسی تحریک کے نتیجے میں کھڑا نہیں کیا گیا جو اس کے خلاف چلائی گئی ہو کہ ایک یہ شخص مسلمان نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ کوئی خواہ کتنے ہی اعلیٰ عہدے پر کیوں نہ ہو دراصل اسے اس معاملے میں دخل دینے کا کوئی استحقاق نہیں ہے..... کسی ادارے یا عدالتی بنچ کا حق نہیں بنتا کہ وہ ایک ایسے معاملے پر اپنی رائے دے جس پر رائے دینے کا اسے کوئی جائز حق حاصل نہیں۔ یور لارڈشپ! میں یہاں مسلمان بادشاہ ہارون الرشید کی مثال پیش کروں گا۔ ہارون الرشید کے دربار میں مسلمانوں کے ایک بہت بڑے عالم نے اٹھ کر ہارون الرشید سے مخاطب ہو کر پوچھا "فرض کیجئے کہ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ آج سے میں خدا پر ایمان نہیں رکھتا تو..... ....؟" ہارون الرشید نے جواب دیا تھا "میں تمہاری بات پر یقین نہیں کروں گا' کیونکہ اس پر یقین کرنا میرا کام نہیں' یہ تمہارا اور خدا کا معاملہ ہے۔ وہیں پر یہ طے ہو گا کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے یا نہیں ہے لیکن جہاں تک میرا معاملہ ہے تو میرا عقیدہ ہے کہ آپ مسلمان ہیں کیونکہ آپ ایک مسلمان تھے' میں اپنے سماج کی اس بردباری کے تحت اسے قبول کرتا ہوں۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو ہارون الرشید کے دربار میں کہے گئے تھے اور میں انتہائی محتاط طریقے سے کہوں گا

www.bhutto.org

کہ وہ اپنے عقیدے کے اظہار کیلئے مختلف ذرائع اور طریقے اختیار کرتے ہیں۔ میرے نقطہ نظر کے مطابق تقریباً تمام مذاہب واحدانیت کے قائل ہیں تقریباً سب مذاہب خدا پر ایمان لاتے ہیں۔ سائنسی انداز میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا کی واحدانیت کا تصور یہودیت سے شروع ہوا یعنی حضرت ابراہیمؑ سے اور ان کے بعد ان کے جانشینوں اور اسرائیلی یہودی پیغمبروں سے جو ان کے بعد آئے۔ مذہبی یہودی تہذیب کے عروج پر پہنچنے کے بعد منتخب قبیلے کا تصور ظہور پذیر ہوا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ آئے اور ان کے بعد عیسائیت آئی۔ حضرت عیسیٰؑ خود کہتے ہیں کہ میں آدمی کا بیٹا ہوں۔ اسلام خود ان کی بے داغ پاکیزگی کے تصور میں ایمان رکھتا ہے۔ اسلام حضرت عیسیٰؑ کے منزہ اور پاک ہونے کو تسلیم کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے صرف یہی نہیں کہا تھا کہ میں ایک آدمی کا بیٹا ہوں بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ "میں ایک یہودی کا بیٹا ہوں۔ کیا آپ نے ایک نئے مذہب کا پرچار نہیں کیا تھا؟ کیا آپ نے ایک نئے مذہب کی تبلیغ کی یا پھر یہودیت کی ہی توسیع کی تھی؟ عیسائیت نے تثلیث کا تصور قائم کیا 'باپ' بیٹا اور روح القدس۔ ایک طرح سے یہ واحدانیت کے تصور سے بالکل مختلف ہے یعنی ایک خدائے واحد' جہانوں کے ایک مالک کے تصور کے منافی ہے اور اس کے بعد وہ مذہب آتا ہے جس نے وحدانیت کی تکمیل کر دی یعنی اسلام 'اسلام کی دیگر فضیلتوں اور عظیم اضافوں کے علاوہ کہ میں اس موضوع کا عالم نہیں ہوں ' اسلام نے واحدانیت کے تصور اور عقیدے کو نئی زندگی دی یعنی خدا واحد ہے۔ ایک تثلیث کا تصور اسلام میں قبول نہیں کیا جاتا۔ اسلام نے خدا کی واحدانیت اور توحید کے عقیدے کو مستحکم کیا' اس کے علاوہ یہ تصور اور عقیدہ دیا کہ انسان اور خدا کا رشتہ براہ راست ہے۔ اس میں کوئی واسطہ نہیں ہے جس طرح یہودیوں میں ربی کو واسطہ بنایا جاتا ہے یا پوپ اور پادریوں کو عیسائیت میں واسطے کی حیثیت دی جاتی ہے۔ پیغمبر اسلام نے خود یہ فرمایا کہ میں صرف خدا کا پیامبر ہوں۔ وہ مذہب اسلام میں کسی اپنے اضافے کی نفی کرتے ہیں۔ آپؐ ایک عظیم ترین سیاسی جینئس تھے' آپؐ ایک عظیم مجاہد تھے' آپؐ ایک عظیم فلسفی تھے لیکن آپؐ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ خود آپؐ نے اسلام میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کیا ہو۔ آپؐ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ آیت میری ہے۔ آپ نے ہمیشہ یہ فرمایا کہ یہ سب کچھ خدا کی دین ہے اور خدا اور آدمی کے درمیان بیچ کا واسطہ نہیں ہے' اس لئے یہاں معاشرے میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ سماج میں سماجی برائیاں جنم لیتی ہیں جو انسان اور انسان کے مابین تخلیق پاتی ہیں اور ان کی سزا اسی دنیا میں ہی دی جاتی ہے۔ جیسے چوری' غنڈہ گردی' زنا وغیرہ۔ لیکن خدا کے خلاف بھی انسان جرم کرتے ہیں' جن کا اسلام میں ذکر موجود ہے۔ لیکن ان گناہوں کا تصفیہ خدا اور انسان کا معاملہ ہے اور اس کا فیصلہ خدا خود روز حشر کو کرے گا۔ اس حد تک انسان اور خدا کے درمیان براہ راست تعلق کی بات ہے۔ اسلام جو تبلیغ کرتا ہے وہ نہ تو یہودیوں کے خدا کی ہے نہ عیسائیوں کے خدا کی اور نہ ہی صرف مسلمانوں کے خدا کی بلکہ یہ اسلام کے خدا کی تبلیغ ہے۔ اسی خدا کی تبلیغ جو اسلام کا خدا ہے۔ اسلام خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ رب العالمین کا تصور ہے۔ وہ

www.bhutto.org

سارے جہانوں کا خدا ہے وہ صرف مسلمانوں کا ہی خدا نہیں ہے' خدا جو قادر مطلق ہے جو مطلق العنان ہے لیکن اس مطلق العنان اور جہانوں کے مالک خدا نے اپنے آپ پر ایک رضا کارانہ حد لگا رکھی ہے ایک ایسی پابندی جو اس نے خود اپنے آپ پر لگائی ہے۔ اس نے اپنی مطلق العنانیت کو مشروط کر دیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ رحم کرنا' معاف کرنا اس کا کرم ہے۔ وہ رحم و کرم کرتا ہے اس دنیا کا خالق' کائنات کا خالق' اس جہاں کا خالق' دونوں جہانوں اور سات آسمانوں کا خالق جس کیلئے اسے کوئی پابندی نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ پر کوئی پابندی لگائے۔ وہ خود اپنی مطلق العنانیت اور قدرت پر پابندی لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے خود اپنے اوپر پابندی لگائی کہ وہ رحم کرے' معاف کرے' مہربانی کرے اور اپنے مطلق العنان اختیارات کو رحم و کرم اور عفو (معافی) و درگذر کا پابند کر دے۔

آنریبل چیف جسٹس - مسٹر بھٹو! میں مداخلت کرنا سخت ناپسند کرتا ہوں لیکن آپ اصل نکتے پر بات کیجئے کہ کیا ہائیکورٹ آپ کے بارے میں ایسا کوئی ریمارک دینے میں جواز رکھتی تھی یا نہیں؟

شہید بھٹو - مائی لارڈ! یہ میرا نکتہ ہے جس کے بارے میں مجھے کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔ (فاضل جج صاحبان کی مختصر بحث کے بعد)

شہید بھٹو - مائی لارڈ! جیسا کہ اس سے پہلے میں کہہ چکا ہوں کہ ایک مسلمان کیلئے یہ کافی ہے کہ وہ کلمے میں ایمان رکھتا ہو اور اسے پڑھتا ہو۔ اس حد تک بات کی جا سکتی ہے کہ جب ابو سفیان مسلمان ہوئے اور انہوں نے کلمہ پڑھا تو رسول اللہؐ کے بعض صحابہ نے سوچا کہ ابو سفیان کی اسلام دشمنی اتنی شدید تھی کہ شاید ابو سفیان نے اسلام کو محض اوپری اور زبانی سطح پر تسلیم کیا ہو لیکن رسول اللہؐ نے اس سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ جونہی انہوں نے ایک بار کلمہ پڑھ لیا تو وہ مسلمان ہو گئے۔ اس لحاظ سے اسلام کا نقطہ نظر بہت سادہ ہے۔ یہ ایک بنیادی تصور ہے۔ اسلام بذات خود توکل' فروتنی اور تسلیم و رضا ہے۔ یہ بنیادی رضاجوئی ہے۔ اسلام مکمل رضاجوئی اور اطاعت کا نام ہے۔ یہ مذہب بنیادی طور پر توکل اور فروتنی کا نام ہے۔ بجز و انکسار اور اطاعت اس کا بنیادی محور ہے۔"

جب آنریبل چیف جسٹس نے کہا کہ ہائیکورٹ کے فاضل جج کے فیصلے کے پیراگراف نمبر 609 سے 611 تک جو رائے دی گئی ہے اس کی اس مقدمے کے ساتھ مطابقت ہے؟ تو شہید بھٹو نے جواب میں کہا۔

"مائی لارڈ! یہ اس لئے مطابقت نہیں رکھتا کہ یہ اختیار قادر مطلق نے اپنے بندوں کو تفویض کیا ہے اور یہاں عوام کی حکومت ہے۔ لوگ اپنے حکمران چنتے ہیں کیونکہ یہاں امانت کا لفظ حکومت کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ حکومت ایک ٹرسٹ ہے یا امانت کی شکل میں سونپی جاتی ہے جو عوام نے سونپی ہے کیونکہ یہ امانت عوام کی ہوتی ہے جسے وہ منتخب نمائندوں اور حکمرانوں کو تفویض کرتے ہیں تو یہی قرارداد مقاصد ہوتی ہے۔ یہ عوام کا اعتماد ہوتا ہے جسے عوام ہی عوام کے ذریعے اپنے منتخب نمائندوں کو تفویض کرتے

www.bhutto.org

ہیں۔ اس لئے اصل نکتہ یہ ہے کہ عوام ہی اپنے حکمرانوں کا فیصلہ کرتے ہیں تو وہی حکومت کو آئینی حیثیت دیتے ہیں اور ایک آئینی حکومت وجود میں آتی ہے جس میں پھر عوام ہی اپنے منتخب نمائندوں کو ذمہ داری اور حکومت تفویض کرتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کے حوالے سے اسلام میں ہی ایک حکومت پر اعتماد اسی صورت میں ہوتا ہے کہ وہ ایک منتخب حکومت ہوتی ہے۔ اسلام میں کسی منتخب حکومت کیلئے گنجائش ہے۔ جہاں تک ایک منتخب حکومت کا تعلق ہے تو پاکستان میں پہلی بار 1970ء میں انتخابات ہوئے تھے اور مجھے پاکستان کے عوام نے چنا تھا۔

عدالت نے اس موقع پر خیال ظاہر کیا کہ مسٹر بھٹو کی حکومت کا طرز عمل اس مقدمے کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس پر شہید بھٹو نے کہا کہ مقدمہ چلانے والی عدالت کی ذاتی آراء ایک واضح تعصب کا اظہار ہیں۔ فاضل چیف جسٹس نے شہید بھٹو سے کہا کہ عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے جو اعتماد حکومت کو سونپتے ہیں اس کی نوعیت پر اصرار کرنے کا اس عدالت کے سامنے کوئی موضوع نہیں بنتا تو شہید بھٹو نے کہا۔

"میں پاکستان کا پہلا لیڈر تھا جسے اسلامی تصور کے مطابق اختیارات سونپے گئے تھے اس لئے میں عوام کے تفویض کردہ حق کے بارے میں بات کر رہا تھا۔" ایک معزز جج نے کہا کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد بھی آپ کے زمانے میں ہی ہوا تھا تو شہید بھٹو نے کہا "اسلامی ہاں صحیح معنوں میں حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی عوام نے پہلی بار اپنے رہنما کا انتخاب کیا تھا۔ اپنی پارٹی کا چناؤ کیا تھا اور ہمیں اکثریت سے ہمکنار کیا تھا اور پاکستان کے عوام کی اکثریت مسلمان ہے اور انتخابات کے دوران ہماری مخالفت میں انتہائی بدترین باتیں کی گئی تھیں۔ ہمارے خلاف فتوے دیئے گئے تھے کیونکہ ہم اپنے معاشرے کے ہم عصر اور جدید معیارات اور مسائل پر یقین رکھتے تھے۔ فتوے یہ دیئے گئے تھے کہ یہ کافر ہے' یہ پارٹی کفر ہے اور فتوے صرف پاکستان کے علماء نے ہی نہیں دیئے تھے بلکہ باہر کے بعض اہم علماء نے بھی ہمارے خلاف فتوے جاری کئے تھے۔ ان فتووں کو ہمارے خلاف انتخابی مہم میں استعمال کیا گیا۔ اس سے قطع نظر میں نے لاہور سے انتخاب علامہ اقبالؒ کے صاحبزادے جاوید اقبال کے مقابلے میں الیکشن لڑا اور میں لاہور میں صرف ایک دن کیلئے آیا تھا۔ میں نے انہیں چالیس ہزار ووٹوں کی اکثریت سے شکست دی۔ اب لاہور کے عوام اندھے تو نہیں ہو گئے تھے کہ انہوں نے مجھے رجعت پسندوں اور ظلمت پسندوں کی شدید مخالفانہ مہم کے باوجود منتخب کیا اور فقید المثال اکثریت کے باوجود چنا۔ ملتان میں میں نے مولانا حامد کے مقابلے میں ستر ہزار ووٹوں کی اکثریت سے انتخاب جیتا۔ لوگوں نے خود' جو کہ مسلمان ہیں کیونکہ لوگوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ انہوں نے مجھے مسلمان کی حیثیت سے منتخب کیا۔ اس حیثیت سے میں نے اسلامی قانون شہادت کے مطابق صدر کا عہدہ سنبھالا۔ اسلام کے سماجی نظام مملکت اور سیاسی نظم و نسق کے مطابق۔ اس کے بعد ایسی رائے کی کیا تشریح کی جا سکتی ہے جو میرے بارے میں دی گئی۔ میں

www.bhutto.org

صرف اس کی تمہید باندھ رہا ہوں۔ اسلام میں یہ ممکن نہیں ہے کہ اسلامی نظم و نسق کو تہہ و بالا کیا جا سکے یعنی اس میں آمریت کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام میں جمہوری نظام اپنایا جاتا ہے۔ ایک ایسی حکومت ہوتی ہے جسے عوام منتخب کرتے ہیں اور عوام ہی کے ذریعے اسے چنا جاتا ہے۔ آمریت اسلام میں ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اسلامی تاریخ میں بنیادی جھگڑا ہی اسی وجہ سے رہا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ کسی غیر قانونی اور ناجائز عمل کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایک ناجائز بچہ اپنے والدین کیلئے بوجھ ہو سکتا ہے لیکن اسے ورثے میں کچھ نہیں ملتا' اسے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح ایک ناجائز حکومت کو جائز حکومت نہیں بنایا جا سکتا۔ میں قانون کے مطابق بڑا مجرم نہیں ہوں' یہ ایک گمراہ کن اصطلاح ہے۔ ذرا یہ تو سوچئے کہ اس اصطلاح کو مسلسل دھرایا جانا یعنی چھ ماہ سے ایک ہی بات "بنیادی اور بڑا مجرم" کی تکرار کرنا' اس کے عوام پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ یہ فیصلے کی طرح آرٹ کی دنیا میں بھی تقریباً ایک اصطلاح کی طرح رائج کر دی گئی ہے۔ اس میں بھی تعصب واضح ہے۔ مجھے اصلی مجرم اور بدمعاش بھی کہا گیا۔ جناب والا! فیڈرل سکیورٹی فورس اس لئے نہیں بنائی گئی تھی کہ میں ذاتی انتقام لینے کی تیاری کر رہا تھا۔ فیڈرل سکیورٹی فورس اس لئے بنائی گئی تھی کہ یہ تمام وفاقی ممالک میں ہوتی ہے اور آئینی طور پر پاکستان کا وزیراعظم لازمی طور پر مسلمان ہوتا ہے۔"

دین اسلام کے نام سے جو الزامات شہید بھٹو پر مذکورہ بالا مقدمہ قتل کے دوران لگائے گئے تھے اس کا اصل مقصد یہ نہیں تھا کہ صرف شہید بھٹو کی ذات کو کافر قرار دیا جائے بلکہ یہ تھا کہ ان کا جو دینی نظریہ ہے اسے ہی کفر قرار دیا جائے اور اس بات کا ثبوت شہید کے اس عدالتی بیان سے بھی ملتا ہے کیونکہ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ الزام 1970ء کے عام انتخابات کی مہم میں بھی ان پر لگائے گئے تھے۔ انہیں اور سوشلزم کو کفر قرار دینے والے مولویوں نے دراصل سائنس کو کفر قرار دیا تھا۔ ملاؤں نے اس وقت ایک سابق امریکی وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس کی اس پالیسی پر عمل کیا تھا' جس میں انہوں نے کہا تھا "سوشلزم کے سائنسی نظریئے کے خلاف مذہب کو استعمال کیا جائے۔"

اس پالیسی کا مقصد آر تھوڈوکسی اور فنڈامینٹل ازم (بنیاد پرستی) کو پھیلا کر دنیا بھر میں سوشل سائنس کے ارتقاء کو روکنا تھا اور چونکہ شہید بھٹو سائنسی بنیاد پر معاشرے کے ارتقاء کو تیز رفتار کر رہے تھے اس لئے ان پر کفر کے یہ فتوے ٹھونس دیئے گئے تھے۔

میں نے گذشتہ سطور میں یہ کہا ہے کہ شہید بھٹو کے دینی نظریات بھی سائنسی تھے اس حوالے سے ایک سیاسی ثبوت تو یہ ملتا ہے کہ شہید بھٹو آمریت کی نفی کر کے عوامی انتخابات کو رائج کر چکے تھے۔ سوشیالوجی کے حوالے سے اس بات کا ثبوت یہ ملتا ہے کہ انہوں نے طبقاتی اونچ نیچ کی مخالفت کی اور پارٹی کے منشور کی بنیاد جمہوریت' سوشلزم اور اسلامی مساوات کے امتزاج پر رکھی۔ اسلام کو شہید بھٹو نے مذہب لکھنے کی بجائے دین لکھا اور پھر ہو جمالو کے گیت کے ساتھ دھمال ڈال کر اور رنگین شلوار قمیص پہن

www.bhutto.org

کر اسلام کے اس نظریئے پر عمل کیا جس پر شہباز قلندرؒ' لطیف بھٹائیؒ' مادھو لعل شاہ حسینؒ' بلھے شاہؒ اور وارث شاہؒ جیسے صوفیاء کرام نے کیا تھا۔ اس اسلامی نظریئے کو فلسفے کی زبان میں وحدت الوجود کا نام دیا جاتا ہے لیکن وحدت الوجود کی جو تشریح اور تفسیر مذکورہ بالا صوفیائے کرام نے کی ہے اس کی بنیاد شیخ محی الدین ابن عربی کے اسلامی فلسفے میں رکھی گئی ہے۔ اس فلسفے کی وضاحت کیلئے طویل و عریض باب درکار ہیں۔ میں مختصر طور پر اس وقت صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ شہید بھٹو نے وحدت الوجود کا وہ نظریہ اختیار کیا جسے مذکورہ بالا صوفیاء کی شاعری میں ملامتی وحدت الوجودی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ فلسفہ ملاؤں کو اس لئے قبول نہیں کہ انہوں نے بادشاہوں اور آمروں کے سرکاری مکتبوں سے ہمیشہ وظیفے حاصل کئے۔ انگریز کے بنائے ہوئے مذہبی محکموں کے قوانین کے ایجنٹ بن کر کام کیا اور بیوروکریسی کے کارندے بن کر مذہب کے نام پر دکانداری چلاتے رہے۔ ان ملاؤں کو یہ بات بتادی گئی تھی کہ اگر بھٹو کے نظریئے پر عمل شروع ہو گیا تو ملازم کی دکان بند ہو جائے گی۔ پچھلے صفحات میں میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ ادبی اور فنی اصطلاح میں شہید بھٹو اپنے فلسفے کو رومانویت کا نام دیتے تھے اور یہ بات ادب اور فلسفہ میں واضح ہو چکی ہے کہ رومانویت کا فلسفہ دراصل دنیا میں انسان کی کھوئی ہوئی جنت کو حاصل کرنے کیلئے انوکھے اقدامات کرنے کا فلسفہ ہے۔ اس فلسفے کی ایک صورت کو مفعول قرار دیا جاتا ہے جو یہ چاہتی ہے کہ ماضی کی طرف لوٹ کر اس جنت کو دوبارہ حاصل کیا جائے جو حضرت آدم سے کھو چکی ہے اور اس کی دوسری صورت کو ترقی پسند اور جارحانہ کہا جاتا ہے جو یہ چاہتی ہے کہ اس کھوئی ہوئی جنت کو اسی دنیا میں قائم کیا جائے۔ شہید بھٹو اس جنت کو اسی دنیا میں قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے اور ماضی کی طرف لوٹنے والی رومانویت کے مخالف تھے۔ اس سلسلے میں ایک اور بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ شہید بھٹو نے اس کمیونزم کی مخالفت کی جس کا ماڈل سوویت یونین میں بنایا گیا تھا۔ یہ بات انہوں نے اس خط میں بھی کہی ہے جسے وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے شائع کیا ہے اور جس کا نام "مائی ڈیئر پیسٹ ڈائر" ہے۔ سوویت یونین کے سوشلزم کا ماڈل لینن کے نظریئے کے مطابق بھی نہیں تھا کیونکہ اسے اسٹالن نے بیوروکریسی کی آمریت کے ذریعے رائج کیا تھا جسے برژنیف کے دور تک چلایا گیا اور جس کے نقشے مشرقی یورپ میں بھی نظر آئے اور آخر کار ان خطوں کے عوام نے اپنی شناختوں' عقیدوں اور جڑوں کے حوالے سے اس ماڈل کی نفی کر دی جس کے ثبوت آج 1990ء میں مل رہے ہیں۔ یوں بھٹو شہید کے نظریات کو تاریخ نے درست ثابت کر دیا ہے لیکن ستم ظریفی دیکھئے کہ 1970ء کی دھائی میں ایک طرف ملا اور دوسری طرف پاکستان کے عقیدہ پرست کمیونسٹ یعنی دونوں اپنی اپنی عقیدہ پرستی کی وجہ سے شہید بھٹو کی مخالفت کرتے رہے تاہم تاریخ نے شہید بھٹو کے حق میں فیصلہ کر دیا اور وہ جسمانی موت کے باوجود نظریاتی زندگی کے ہیرو بن گئے جبکہ ملا اور عقیدہ پرست کمیونسٹ عوام کے ہاتھوں مسترد ہو گئے۔

فلسفہ' ادب اور سوشیالوجی کے حوالے سے شہید بھٹو نے جو نظریات پیش کئے ان کی تفصیلات بہت

www.bhutto.org

زیادہ ہیں۔ اس لئے میں ان کے نظریات کا مندرجہ بالا خلاصہ پیش کرنے تک ہی محدود رہا ہوں۔ اب میں قارئین کی توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کر رہا ہوں کہ پاکستان کے عدالتی نظام میں چھپے ہوئے جنرل ضیاء الحق کے پرچارکوں نے شہید بھٹو کے خلاف درج ہونے والے مقدمہ ء قتل کی سماعت میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ کسی بورژوا سسٹم کے نظام عدل کو بھی نہیں چلا رہے بلکہ انگریز کی بنائی ہوئی عوام سے بالاتر بیوروکریسی کو بادشاہوں کے نامزد کردہ قاضیوں کے ساتھ ملا کر قاضی اور بیوروکریسی کے مشترکہ کردار پر عمل کرتے رہے ہیں۔ شہید بھٹو کے خلاف اس مقدمہ میں جو سیاسی عناد ان کے خلاف استعمال کیا گیا اس کیلئے راجہ رتنم (چیف جسٹس سری لنکا) کی کتاب دیکھی جا سکتی ہے اور ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ان وکلاء کے مضامین بھی دیکھے جا سکتے ہیں جنھوں نے اس مقدمہ میں بعض پاکستانی فاضل ججوں کے فیصلے کا تجزیہ کیا ہے۔ اس لئے میں اس موضوع کو یہیں چھوڑ کر اس سیاسی پس منظر کی طرف آتا ہوں جو شہید بھٹو کی صاحب زادی محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنی نوعمری کے دوران جیلیں کاٹتے ہوئے اور جمہوریت کی تحریک چلاتے ہوئے ملا اور جس میں ایک طویل قائدانہ سفر کر کے وہ وزیر اعظم بنیں اور وزیر اعظم بن کر بھی آج اسی جمہوری تحریک کو چلا رہی ہیں۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو کو ورثے میں کیا ملا

وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو شہید باپ سے ورثے میں جو ذمہ داریاں ملیں انہیں پورا کرنے کا پہلا مرحلہ تو خود والد کی پھانسی کو برداشت کرنے اور جیل میں رہنے کا تھا۔ والدہ ان کے ساتھ تھیں اور دونوں بھائی جلاوطن تھے۔ ان کے تاریخ ساز والد کے قتل کی سازش کرنے والی قوتوں نے اس وقت مختلف ہتھکنڈے اختیار کر رکھے تھے۔

وہ ہتھکنڈے یہ کہ شہید ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری قوم پرست راہ عمل کو کچل دیا جائے۔ اس وقت اگر امریکہ نے یہ پالیسی اختیار کر رکھی تھی تو سوویت یونین بھی شہید بھٹو کی قوم پرستی کا حامی نہیں تھا کیونکہ امریکہ ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے کنٹرول میں چلنے والے عالمی سرمایہ داری نظام کی سرپرستی' عالمی سامراج بن کر کر رہا تھا جبکہ سوویت یونین سٹیٹ کنٹرول میں چلنے والی سرمایہ داری کی سرپرستی نام نہاد سوشلسٹ ملکوں کو اپنے کنٹرول میں چلا کر کر رہا تھا۔ اس صورتحال میں امریکہ اور سوویت یونین کی پالیسی اگرچہ بظاہر آپس میں سخت دشمنی کی تھی لیکن بھٹو کے اس ڈیموکریٹ نیشنل ازم کی مخالفت یہ دونوں سپر طاقتیں کر رہی تھیں کیونکہ شہید بھٹو کے اپنے ثقافتی سوشلزم میں اسلام کے اصولوں کی روشنی میں جو نظریہ پیش کیا گیا تھا وہ سوشلزم اور فنڈامنٹل ازم کو ملانے کا نظریہ نہیں تھا بلکہ سوشلزم اور تصوف کو ملا کر بڑھنے کا نظریہ تھا۔ اس تصوف کی بنیاد' اسلامی ملکوں میں پانچ چھ سو سال پہلے شیخ محی الدین ابن عربی نے رکھی تھی۔ جنھوں نے اپنے فلسفیانہ فکر کی تشریح کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ انہوں نے یہ نظریہ اپنی محبوبہ شمسہ کے رشتے

www.bhutto.org

سے استوار کیا ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کی کتابیں "فتوحات مکیہ" اور "خصوص الحکم" اس فلسفہ کی بنیادی دستاویزات میں شامل ہیں۔ اس نظریئے کا اگر سوشلزم کے اس نظریہ یا فلسفہ سے تقابل کیا جائے جسے کارل مارکس نے پیش کیا تھا تو پتہ چلتا ہے کہ سوویت یونین' چین اور مشرقی یورپ میں مارکسزم کے نام سے جو سوشلزم چلایا گیا وہ سوشلزم ہی نہیں ہے۔

امریکہ اور سوویت یونین اس بات کو بھانپ گئے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو "ہے جمالو" کے گیت گا کر اور تیسری دنیا کی حریت پسند قوموں کو متحد کر کے جو ثقافتی اور سیاسی تحریک چلا رہے ہیں وہ آخر اس نقطے میں غلبہ حاصل کر جائے گی اور پاکستان ایٹمی طاقت کا مرکز بن کر اقتصادی حوالے سے بھی تیسری دنیا کی قیادت کرنے والا ملک بن جائے گا۔ بھٹو دونوں سپر طاقتوں کیلئے ایک خطرہ بن چکے تھے جو آپس میں ایک دوسرے کی دشمن تھیں۔ علاوہ ازیں سوویت یونین کو یہ بھی شکایت تھی کہ بھٹو نے چین اور امریکہ کے درمیان صلح کروائی ہے جبکہ بھٹو کا مقصد چین کو امریکہ کا بجٹ بنانا نہیں بلکہ چین کو جدید ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی سہولتیں دلوا کر ایک متوازن طاقت بنانا تھا جو پاکستان کے ساتھ مل کر ایٹمی ترقی میں بھی مدد دیتا رہے اور سپر طاقتوں کا مقابلہ کرنے کیلئے بھی آگے بڑھتا رہے۔ اس صورت حال میں محترمہ بے نظیر بھٹو کو وراثت میں کوئی سلطنت نہیں ملی تھی بلکہ ایک تحریک ملی تھی جو عالمی سامراج اور فنڈامنٹل ازم کے اتحاد کے جبر و ستم کا مقابلہ بھی کر رہی تھی اور سوویت یونین کے میکینکل سماجی ڈھانچے کے مقابلے میں انسان دوست سوشلسٹ نظام استوار کرنے کی طرف بھی بڑھ رہی تھی اور انفرادی حوالہ سے دیکھا جائے تو بے نظیر بھٹو جس عمر میں مغربی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کر کے واپس آئی تھیں وہ عمر لڑکیوں کے کھیلنے اور گیت گانے کی عمر ہوتی ہے لیکن بے نظیر بھٹو کو اس عمر میں باپ کی پھانسی اور بھائیوں کی جلاوطنی' پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو لگنے والے کوڑے اور پھانسیاں اور اپنی والدہ کی گرفتاری کے دکھ ملے تھے۔ پہلے پانچ سال بے نظیر بھٹو نے اسی عذاب میں گزارے۔ مغربی ملکوں کی یونیورسٹیوں کے بعد پاکستان کی جیل اور مارشل لاء کے عذاب کا مقابلہ کرتے کرتے ان کی ذات از خود انسان کی نجات کیلئے جدوجہد کی تعلیم دینے والی یونیورسٹی بن گئی۔

سامراجی قوتوں نے شہید بھٹو کے خلاف دوسرا ہتھکنڈہ یہ استعمال کیا تھا کہ پاکستان کی قدامت پسند مذہبی جماعتوں' ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا مال امپورٹ کرنے والے تاجروں' ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں تربیت حاصل کرنے والی پاکستانی بیوروکریسی اور جرنیلوں کو عرب ممالک کے رجعت پسند حکمرانوں کی حمایت سے بھٹو کے خلاف استعمال کیا جائے۔ اس سازش کو کامیاب بنانے کیلئے امریکیوں نے 1977ء میں پاکستان نیشنل الائنس (پی این اے) کی قیادت میں منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کرایا اور پی این اے کو بیرونی ملکوں سے کروڑوں ڈالرز کی امداد ملی۔ اس ایجی ٹیشن کے دوران پاکستان میں موجود روس نواز اور چین نواز نام نہاد سوشلسٹوں نے بھی امریکہ نواز جماعتوں

www.bhutto.org

کا ساتھ دیا لیکن سیاسی حکمتِ عملی سے کام لے کر جب بھٹو شہید نے دوبارہ انتخابات کا اعلان کر کے پی این اے کے لیڈروں کو معاہدے پر رضامند کر لیا تو امریکی سامراج کے سب سے بڑے کارندے جنرل ضیاء الحق نے راتوں رات مارشل لاء لگا دیا اور اس معاہدے پر دستخط بھی نہ ہونے دیئے جس کا مسودہ تیار ہو چکا تھا اور پی این اے کے لیڈروں کے پاس اس معاہدے کو مسترد کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی۔ جب مارشل لاء لگا تو یہی پی این اے اس کی وزارتوں میں شامل ہوئی اور ولی خان جیسے قوم پرستوں نے اعلان کر دیا کہ پہلے احتساب ہو گا پھر انتخاب ہو گا جس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے بھٹو کو پھانسی دی جائے گی۔ اس کے بعد انتخابات ہوں۔ تب 1977ء سے لے کر آج 1990ء تک پی این اے میں شامل ہونے والی جماعتیں اور نام نہاد لیڈر بے نظیر بھٹو کو ختم کرنے کی سازشیں کرتے آ رہے ہیں لیکن چونکہ بین الاقوامی سیاست کا منظر تبدیل ہو گیا ہے اس لئے ان کو 1985ء سے لے کر آج تک مسلسل شکستوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔

بین الاقوامی سیاست میں جو تبدیلیاں آج منظرِ عام پر آئی ہیں ان کا آغاز 1983ء کے ساتھ ہی ہو گیا تھا جبکہ پاکستان میں ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم سے سول نافرمانی کی تحریک چلائی جا رہی تھی اور اس تحریک میں سب سے بڑی قوت صرف پیپلز پارٹی تھی۔ ایم آر ڈی میں باقی پارٹیاں وہی تھیں جو 1977ء میں پی این اے میں شامل ہوئی تھیں۔ یہ پارٹیاں اگر 1981ء میں ایم آر ڈی میں شامل نہ ہوتیں تو ان کا وجود اسی طرح ختم ہو جاتا جس طرح جنرل ضیاء الحق کا ڈی پولیٹیکلائزیشن کا نظریہ ختم ہوا ہے۔ ان پارٹیوں نے ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم پر وارد ہونے کا فیصلہ اس لئے کر لیا تھا کہ مارشل لاء کی مخالفت کا نعرہ لگا کر پیپلز پارٹی کو مستقبل میں مجبور کر سکیں کہ نئی حکومت میں حصہ لینے پر آمادہ ہو جائے تاکہ مستقبل میں پیپلز پارٹی کی بالادستی بھی قائم نہ ہو اگر یہ پارٹیاں ملک و قوم کیلئے کسی ایسے منشور پر عمل کرتیں جو سامراجی قوتوں اور استحصالی نظام کو ختم کرنے والا ہوتا تو آج 1990ء میں یہ اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی) اور سی او پی میں شامل نہ ہوتیں لیکن ان کا مقصد ملکی اور قومی مفاد نہیں تھا بلکہ پیپلز پارٹی کے ترقی پسند منشور کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا تھا۔ اس لئے ان جماعتوں کو ساتھ ملا کر جمہوریت کی ڈگر پر چلانا بھی محترمہ بے نظیر بھٹو کیلئے ایک مشکل عمل تھا لیکن انہوں نے ہر حال میں اس مشکل کا سامنا کیا جبکہ اگست 1986ء میں ایم آر ڈی کی طرف سے ایجی ٹیشن کرنے کی جو پالیسی بنائی گئی وہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی نظر میں درست پالیسی نہیں تھی لیکن ایم آر ڈی کی دوسری پارٹیوں اور خصوصاً جمعیت علمائے اسلام کے فیصلے کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے اس لئے قبول کر لیا کہ ایم آر ڈی کی سربراہی ان دنوں مولانا فضل الرحمٰن کر رہے تھے جو آج آئی جے آئی کے ساتھ بغلگیر ہو چکے ہیں۔ آج ایم آر ڈی کی دیگر پارٹیاں بھی حکومت میں کوئی حصہ اس لئے نہیں دے سکیں کہ ایک تو انہوں نے پیپلز پارٹی کے منشور سے اتفاق نہیں کیا اور دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہی نہیں کہ جس قدامت پسند پالیسی کو وہ

www.bhutto.org

نافذ کرنا چاہتی ہیں اسے بین الاقوامی پس منظر میں مقبولیت حاصل نہیں ہے جبکہ محترمہ بے نظیر بھٹو بین الاقوامی تناظر کے حوالے سے آگے بڑھ رہی ہیں۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ وہ بین الاقوامی سیاسی تناظر کیا ہے جس میں محترمہ بے نظیر بھٹو کو جیل سے نکال کر فرانس بھیجنا پڑا اور پھر ان کے بھائی کو شہید کر دیا گیا اور 1986ء میں انہیں پاکستان میں دوبارہ تحریک چلانے کا موقع بھی دیا گیا۔ اس بین الاقوامی سیاسی تناظر کو سمجھنے کیلئے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ سوویت یونین میں پرانی بیوروکریسی کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور موجودہ صدر گورباچوف اقتدار میں آئے تو عالمی سیاست کا نقشہ بھی تبدیل ہو گیا پاکستان پر اس تبدیل شدہ نقشے کا سب سے پہلا اثر یہ پڑا کہ افغانستان سے سوویت یونین کی فوجیں واپس بلا لی گئیں۔ امریکہ کو جنرل ضیاءالحق اور ان کے کارندوں کی اس نوکری کی ضرورت ہی باقی نہ رہی جو 1977ء سے ان کو سونپی گئی تھی اگرچہ روسی فوجوں کی واپسی کا مرحلہ 1988ء میں آیا لیکن امریکہ اور یورپ کو اس بات کا پتہ ان دنوں میں ہی چل گیا تھا جب برژنیف کے بعد آندروپوف سوویت یونین کے صدر بنے اور انہوں نے روسی بیوروکریسی کی سابقہ پالیسیوں پر تنقید کی اور روسی بیوروکریسی کا وہ اصلاحات پسند گروپ اوپر آنے لگ گیا جس کی سربراہی موجودہ صدر گورباچوف کر رہے تھے۔ ان دنوں امریکہ کے اندر بھی صدر ریگن کی حکومت پر یہ تنقید شروع ہو گئی تھی کہ دشمن کا خون بہانے کی جس پالیسی پر عمل کر کے امریکہ افغانستان میں افغان مجاہدین اور ضیاءالحق کو استعمال کر رہا ہے یہ پالیسی اب مستقبل میں بالکل فائدہ مند نہیں رہے گی۔ ماضی میں بھی اس پالیسی نے اخراجات میں اضافہ کیا ہے اور مفادات کم مہیا کئے ہیں۔ اس صورتحال میں امریکہ کیلئے پاکستان کی وہ اہمیت نہیں رہی تھی جو ماضی میں اس کو حاصل تھی کیونکہ پاکستان امریکہ کا کرائے کا گوریلا بن کر افغانستان میں لڑنے والے افغان مجاہدین کی مدد کر رہا تھا۔ مختصر لفظوں میں اسی بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ نے پاکستان کو جس ڈیوٹی پر لگایا ہوا تھا گورباچوف نے افغانستان سے فوجیں واپس بلا کر اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہنے دی اور اس اسامی کے ختم ہونے کا اندازہ امریکہ نے 84-1983ء میں کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ اور یورپ نے شدت سے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ پاکستان میں جن مولویوں اور جرنیلوں کو امریکہ نے افغان مسئلے کی بنیاد پر ترقی دی تھی وہی مولوی اور جرنیل ہیروئن فروشی اور کلاشن کوف فروشی کے کاروبار میں ڈرگ مافیا کے ساتھ مل گئے ہیں اور اس ڈرگ مافیا نے پاکستان کو ہیروئن فروشوں کی پناہ گاہ بنا کر پوری مغربی دنیا میں اپنا جال پھیلا دیا ہے۔ امریکہ اور یورپ نے دس سال پیشتر یہ منصوبہ بنایا تھا کہ پاکستان میں بھٹو جیسے لیڈر کو ختم کرنے کیلئے ڈرگ مافیا کی مدد لی جائے لیکن جب ڈرگ مافیا نے پاکستان کی سیاست پر مکمل قبضہ کر لیا اور کالے دھن کے ذریعے پاکستان کی معیشت بھی قابو میں کر لی تو امریکی حکام نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ڈرگ مافیا تو وہ حکمران طاقت بن گئی ہے جس نے امریکہ کے شہروں میں بھی کوڑا کرکٹ اٹھانے کے ٹھیکے اپنے کارندوں کو لے دیئے ہیں اور امریکی حکام میں بھی اثر و رسوخ پیدا کر لیا ہے۔

www.bhutto.org

یورپ کی معیشت میں ڈرگ مافیا نے جو جال پھیلایا تھا اس سے ملٹی نیشنل کارپوریشنیں بھی پریشان ہو گئی تھیں اس لئے امریکہ اور یورپ نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ پاکستان میں فنڈا منٹل ازم، ڈرگ مافیا اور افسر شاہی کی قوت کو نیچے لایا جائے۔ اس صورتحال میں امریکیوں اور یورپیوں کو محترمہ بے نظیر بھٹو کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑ گئے اور انہوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ بے نظیر بھٹو اگر ایٹم بم بنانے کا ارادہ ترک کر دیں تو ان کی جمہوریت کو قبول کر لیا جائے۔ علاوہ ازیں امریکہ کو ایک اور نقصان بھی پہنچا اور وہ یہ کہ سوویت صدر گورباچوف نے یورپ میں ایٹمی اسلحہ کے خلاف تحریک چلانے میں کامیابی حاصل کر لی اور خصوصی طور پر مغربی جرمنی کو یہ پیشکش کر دی کہ سوویت یونین مشرقی جرمنی کو اس کے ساتھ ملانے پر تیار ہے۔ اس پیشکش کی بنیاد پر مغربی جرمنی نے سوویت یونین کے ساتھ تیل اور گیس کی خرید و فروخت کے معاہدے کرنے شروع کر دیئے اور امریکہ کے فوجی اتحاد نیٹو سے ہاتھ کھینچ لئے۔ دوسری طرف سوویت یونین نے مشرقی یورپ کے ملکوں کے بیورو کریٹک ریاستی ڈھانچے کو توڑ دیا اور وہاں بھی جمہوری ڈھانچے بنانے شروع کر دیئے اور جرمنی جیسے ملکوں کو یہ پیشکش کر دی کہ ان کی مشینیں بنانے والی جو صنعتیں خسارے میں جا رہی ہیں وہ ان کی مشینوں کو مشرقی یورپ میں سرمایہ کاری کیلئے لگا لیں۔ اس پیشکش سے بھی یورپی ملک امریکہ کا ساتھ چھوڑنے لگے اور امریکہ کے میزائلوں کی جو فروخت یورپ میں ہوتی تھی وہ کم ہو گئی۔ اس طرح بھی امریکہ نے سوویت یونین کے ساتھ اپنے رویئے میں تبدیلی کر لی اور تیسری دنیا کے ممالک میں امریکہ کی قوت کم ہوتی چلی گئی جبکہ سوویت یونین نے تیسری دنیا کے ممالک پر دباؤ ڈالنے کا راستہ چھوڑ دیا اور اپنا رخ یورپ کے ساتھ اتحاد کرنے کی طرف موڑ لیا۔ امریکہ کو ایک اور نقصان یہ پہنچا کہ جاپان کی آٹو موبائل اور الیکٹرونکس کی صنعت نے امریکہ کی اندرونی اور بیرونی منڈیوں پر اپنی بالادستی قائم کر لی۔ اس صورتحال میں امریکہ کو پاکستان کے بارے میں یہ خیال آیا کہ اس کے کرائے کے گوریلوں کے خلاف پاکستان میں جو تحریک پیپلز پارٹی چلا رہی ہے وہ اب مزید آگے بڑھ کر امریکہ کا مکمل صفایا کر دے گی جبکہ فنڈا منٹل ازم کے علمبردار اپنی آمریت کو قائم رکھنے کیلئے امریکہ کی سرمایہ دارانہ ثقافت کو ڈرگ مافیا کے ایجنٹ بن کر ختم کرا دیں گے لہٰذا امریکہ کیلئے صرف یہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ پیپلز پارٹی کی جمہوریت کو قبول کرے اور مکمل مفادات حاصل کرنے کی بجائے کچھ کم مفادات حاصل کرنے کے مقام پر آ جائے۔

دوسری طرف محترمہ بے نظیر بھٹو کو پوری طرح یہ احساس تھا کہ ان کی پارٹی کو دس گیارہ سال کی لڑائی کے بعد آگے چلنا ہے تو کچھ دم لے کر چلے اور دم بھی اس طرح لے کہ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر حکومت میں جا کر اپنے کارکنوں کو کچھ سہولیات فراہم کر دے اور تاجروں، ملاؤں اور افسروں کی حکومتی اجارہ داری کے مقابلے میں مڈل کلاس کو شامل کر کے اس اجارہ داری کو کمزور کر دے محترمہ بے نظیر بھٹو کی یہ پالیسی قدرے کامیاب بھی ہو گئی اور 1988ء کے الیکشن کے بعد ان کو حکومت بنانے کا موقع بھی مل گیا لیکن اس مختصر تجزیئے کے بعد یہ بتانا ضروری ہے کہ ڈرگ مافیا، فنڈا منٹلسٹوں اور قدامت پسند بیورو کریسی نے

www.bhutto.org

شہید ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی کو نقصان پہنچانے کیلئے کیا کیا سازشیں کی ہیں؟ ان سازشوں کی تفصیلات کیلئے ہزاروں صفحات درکار ہیں تاہم ان کا مختصر خاکہ پیش کرنا ضروری ہے۔

وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے وطن واپس آنے کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے 10 اپریل 1986ء کا دن آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ جس روز لاہور میں دخترِ مشرق کیلئے محبت کش عوام کا ایک طوفان امڈ آیا تھا اور مڈل کلاس جو محض اس جلوس کا نظارہ کرنے کیلئے اس میں آئی تھی اس طوفان کے بہاؤ میں بہہ گئی۔ اس جلوس کو جن لوگوں نے انتہاپسندانہ انداز میں دیکھا انہوں نے تو یہ سمجھا کہ بے نظیر بھٹو اس جلوس کی مدد سے کوٹھیوں، صنعتوں اور سرکاری دفتروں کو آگ لگا دیں گی اور جنرل ضیاء الحق کو مزید دس سال تک مارشل لاء لگانے کا موقع مل جائے گا لیکن کسی بھی دشمن کو اندازہ نہیں تھا کہ شہید بھٹو کی بیٹی کتنی عقل و دانش کی مالک ہے۔ بے نظیر بھٹو کو پوری طرح احساس تھا کہ پیپلز پارٹی کے جلوس میں شامل ان لاکھوں لوگوں کو آگ لگانے اور انتہاپسندی جیسی احمقانہ حرکتوں میں استعمال کرنے کا کام صرف جنرل ضیاء الحق جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں کوئی بھی جمہوری لیڈر اس قسم کی حرکتیں نہیں کرتا اس لئے انہوں نے جلوس کے بعد پہلی ہی کانفرنس میں یہ بات کہہ دی کہ وہ آگ لگانے اور انتہاپسندی کرنے کیلئے نہیں آئیں بلکہ پُرامن جمہوری جدوجہد کرنے کیلئے آئی ہیں۔ علاوہ ازیں محترمہ بے نظیر بھٹو نے یہ تجزیہ بھی کر لیا تھا کہ ان کی پارٹی میں خواہ کروڑوں عوام شامل ہیں لیکن اصل کام تو یہ ہے کہ اس پارٹی کو ایک ہجوم سے ایک تنظیم بنایا جائے اور تنظیم بنانے کیلئے ضروری ہے کہ اس ہجوم کو الیکشن کے عمل میں ڈالا جائے تاکہ یہ ایک ایسی مادی قوت بن سکے جو جمہوریت کی بنیاد بنے اور بار بار مارشل لاء لگا کر ملک کو تباہ کرنے والوں کو شکست دے سکے۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ پُرامن جدوجہد کریں گی اور اس پُرامن جدوجہد کو بھی انقلابی تحریک کی صورت میں آگے بڑھائیں گی۔ سرمایہ دارانہ نظام کی کمزوریوں کا وہ پوری طرح احاطہ کر چکی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ سمجھتی تھیں کہ اگر عالمی سامراج کو مشتعل کیا گیا تو وہ درندوں کی طرح مزید حملے کرے گا خواہ وہ اندر سے کتنا بھی کمزور کیوں نہ ہو گیا ہو۔ ان کی یہ سوچ درست بھی تھی کہ سرمایہ دار بلاک کا یہ ریکارڈ ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کے باعث پیچھے بھی ہٹتا ہے لیکن جب اس کے پورے مفادات خطرے میں پڑ جائیں تو غضبناک ہو جاتا ہے اور تباہ کن ہتھیار استعمال کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی محترمہ بے نظیر بھٹو کو یہ خیال بھی تھا کہ جنرل ضیاء الحق کو ختم کیا جائے تاکہ اس کی اجارہ دارانہ قوت کمزور ہو اس لئے انہوں نے ایم آر ڈی کی جماعتوں اور بر سر اقتدار طبقے کے بہت سے افراد کو ان کے وقتی مفادات کے حوالے سے اپنے ساتھ ملانے کی پالیسی بھی اپنائی لیکن دوسری طرف زیرِ دست استحصالی طبقوں نے بھی یہ چالیں چلنی شروع کر دیں۔ انہوں نے اپنے آدمیوں کو پیپلز پارٹی کے اندر داخل کیا کہ اس کی انتخابی ٹکٹوں پر قبضے کر کے اپنے ہی ایجنٹوں کو اقتدار میں لے آئیں۔ یہ کوششیں ابھی تک جاری ہیں۔ اس مقصد کیلئے زیرِ دست عناصر نے سب سے پہلی چال یہ چلی کہ

www.bhutto.org

1987ء کے بلدیاتی انتخابات میں پیپلز پارٹی کے غریب کارکنوں کو پارٹی فنڈ کے وسائل سے محروم امیدوار بنا کر شکست دلادی تاکہ یہ غریب کارکن الیکشن میں ہار جائیں اور صوبائی اور قومی اسمبلی کے الیکشن میں ٹکٹ حاصل نہ کر سکیں۔ علاوہ ازیں موقع پرستوں نے پارٹی میں یہ لائن بھی چلائی کہ الیکشن میں بہتر معیاری امیدوار کو اسمبلی میں بھی سامنے نہ لایا جائے اور صرف ذات برادری کی بنیاد پر جیتا جاسکتا ہے جس کیلئے کوئی منشور نہ دیا جائے صرف جئے بھٹو کا نعرے دے دیا جائے۔ انتخابی مہم میں ٹکٹ دلانے اور جئے بھٹو کے نعرے تک محدود رہنے کی لائن دے کر دولت پرستوں کو ٹکٹ دلانے کی پالیسی صرف اور صرف اس لئے اختیار کی گئی کہ پارٹی کا امیج اور رنگ روپ تبدیل ہو جائے۔ اول تو یہ ہار جائے اور اگر نہ ہارے تو کمزور ترین پارٹی بن کر جیتے۔ وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو پر اس وقت طرح طرح کے دباؤ ڈالے گئے اور یہ نقصان کافی حد تک پارٹی کو بھی پہنچایا گیا لیکن بے نظیر بھٹو نے اس کا مقابلہ کرنے کیلئے اپنی حکمتِ عملی یہ بنائی کہ ایم آر ڈی کی محتاجی ختم کر دی جائے اور امیر زادے اسمبلی ممبران کو کارکنوں کی تنقید کے سامنے پیش کر دیا جائے تاکہ انہیں قابو میں رکھا جاسکے اور ایک مختصر عرصہ تک حکومت میں رہنے کے ساتھ ہی نئے الیکشن کی مہم چلادی جائے۔ آئی جے آئی کے لیڈروں کے منہ سے جب ذات برادری کے طریقے کی بات سنائی دیتی تھی تو خیال یہ آتا تھا کہ اس اتحاد کے لیڈر جمہوری تحریک کو ختم کرنے کے علمبردار ہیں اور اسی وجہ سے جنرل ضیاء الحق کے غیر سیاسی اور غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لے کر عوام کو چودھرانہ اکانومزم میں مبتلا کرتے رہے ہیں لیکن پیپلز پارٹی جو 10 اپریل 1986ء سے لے کر دسمبر 1988ء تک محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت میں سینکڑوں عوامی جلسے اور جلوس کر چکی تھی اس کے کسی لیڈر کو یہ زیب ہی نہیں دیتا تھا کہ وہ ذات برادری کا نعرہ لگائے اور محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایسا کوئی نعرہ لگایا نہیں تھا تاہم پارٹی کے اندر گھسے ہوئے موقع پرست لوگ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ انتخابی ٹکٹ ذات برادری اور دولت مندی کی بنیاد پر دیئے جائیں اور غریب عوام جو شہید بھٹو کے نظریئے پر چل رہے ہیں ان کی سوچ کو کنفیوژن میں مبتلا کر دیا جائے۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

انحراف یا تسلسل؟

گذشتہ ابواب میں پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام اور اس کی جدوجہد کی جو تفصیل پیش کی گئی اس کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین کے ذہن میں بار بار یہ سوال پیدا ہوا ہو گا کہ پہلے دور میں سوشلزم کے نظریئے پر جس قدر زور دیا گیا پارٹی کی قیادت اس کے بارے میں مختلف نقطہ نظر رکھتی ہے۔ بادی النظر میں ' یہ بات درست بھی معلوم ہوتی ہے اس بناء پر میں نے دستاویزات کے حوالوں کے دوران بھی کئی جگہ وضاحتی نوٹ یا اپنے تبصرے شامل کر کے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن تفصیلی مطالعے کے بعد خود مجھے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس موضوع پر ایک علیحدہ باب قائم کیا جائے جب پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو دنیا دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس سرد جنگ سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی جو سیاسی ' معاشی ' جغرافیائی اور تجارتی ہر محاذ پر جاری تھی۔ یہ تصور ضرور پیدا ہو چکا تھا کہ جنگ مسائل کا حل نہیں رہی۔ سپر پاورز کے درمیان توازنِ طاقت یا توازنِ تباہی بھی اس حد تک آ چکا تھا کہ دیتانت کا تصور سامنے آ گیا تھا۔ بر صغیر بلکہ تیسری دنیا کے سیاستدانوں میں ذوالفقار علی بھٹو سب سے زیادہ اس کا شعور رکھتے تھے۔ میں ان کی کتابوں کے حوالے بھی دے چکا ہوں اور تاریخ اور سیاست کے طالبعلم یہ بات جانتے ہی ہیں کہ بھٹو نے مستقبل کے بطن سے نمودار ہونے والی اس دنیا کے خدوخال دیکھ لئے تھے جو آج ہمارے سامنے ہے لیکن انہیں سیاست ایک ایسے ماحول میں کرنا تھی جو ابھی دوسری جنگِ عظیم کے خمار میں ڈوبا ہوا تھا۔ بالخصوص پسماندہ ملکوں میں تو ترقی یافتہ دنیا نے طے شدہ پالیسیوں کے تحت اسی قسم کے علوم۔

www.bhutto.org

معلومات ' تصورات اور نظریات پھیلا رکھے تھے جن میں محاذ آرائی اور تصادم کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے اور اس کی وجہ بھی تھی۔ دونوں بڑے بلاکوں نے تیسری دنیا کو اپنے حلقۂ اثر میں تقسیم کر رکھا تھا اور ہر ایک نے اپنے زیرِ اثر علاقوں میں محاذ آرائی کی وہ فضاء قائم کر رکھی تھی جس سے یہ فائدہ اٹھا کر اپنے علاقائی اتحادیوں کو تصادم پر آمادہ رکھتے تھے۔ اس کی نمایاں مثال سوویت یونین کے عوام کا وہ ردِ عمل ہے جو انہوں نے افغانستان پر حملے کے وقت ظاہر کیا۔ وہ اس فوجی اقدام کو اپنے دفاع کیلئے لازمی تصور کرتے تھے۔ اسی طرح خود امریکی عوام ہزاروں میل دور ویت نام میں لڑی جانے والی جنگ کو اپنے دفاع کی جنگ سمجھتے تھے یہ تو خود ان طاقتوں کے عوام کی حالت تھی ' اندازہ کیجئے کہ انہوں نے اپنے زیرِ اثر ملکوں میں ان تصورات کو کیسے پھیلایا اور مستحکم کیا ہوگا؟ ان کے اثرات کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی دونوں سپر طاقتیں بیشتر امور میں ایک دوسرے سے تعاون کر رہی ہیں حتیٰ کہ اب علاقائی جنگوں کے سلسلے میں بھی ان کے مؤقف ایک ہونے لگے ہیں۔ اس پروپیگنڈہ کے مارے ہوئے پسماندہ عوام ابھی تک انہیں حریف قوتیں تصور کرتے ہیں۔ جب سرد جنگ کی صورتحال واقعی موجود تھی ' اس وقت کے بارے میں تصور کیا جا سکتا ہے کہ صورتحال کیا تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو اپنے وقت سے آگے کے انسان تھے۔ یہ بات ان کی تقریروں ' ان کی کتابوں اور ان کے اپنے ساتھیوں سے ہونے والی گفتگوؤں کے ریکارڈ سے ظاہر ہے۔ ابھی جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں انہیں اسی ماحول میں سیاست کرنا تھی جو کہ انہیں دستیاب تھا۔ اس زمانے میں خواہ آپ کیسے بھی جدید سے جدید نظریات لے کر میدان میں آتے لیکن عوام سے باتیں کرنے کیلئے رائج الوقت سیاسی اصطلاحوں کی ضرورت تھی۔ بھٹو کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو وہ دائیں بازو کی رائج سیاسی اصطلاحوں میں اپنا نظریہ بیان کرتے یا بائیں بازو کی رائج الوقت سیاسی اصطلاحوں میں اپنے تصورات عوام تک پہنچاتے۔

پہلا راستہ جبر و استحصال کی قوتوں کا راستہ تھا۔ ظاہر ہے، بھٹو ان کی اصطلاحوں میں بات نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرا راستہ وہ تھا جو ان سے نبرد آزما قوتوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ یہ تمام گروہ سوشلزم کی اصطلاحیں استعمال کرتے تھے تو اپنے آپ کو برسرِ اقتدار طبقوں کی سیاست اور ان کی پہچان سے علیحدہ کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ابتدائی طور پر وہ اصطلاحیں استعمال کی جائیں جو استحصالی قوتوں سے متضاد ہوں اور مختلف شناخت رکھتی ہوں۔ اس غرض سے بھٹو نے سوشلزم کی اصطلاح کا سہارا لیا لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو محسوس ہوگا کہ وہ ہر مرحلے پر اس امر کی وضاحت کرتے رہے کہ سوشلزم سے مراد ان کے نزدیک کوئی بندھا ٹکا ٹکسالی تصور نہ تھا۔ انہوں نے بار بار یہ بات واضح کی کہ سوشلزم کا جو تصور ان کے پیشِ نظر ہے اس کا نہ تو روس اور چین کے نظریات سے تعلق ہے اور نہ ایشیا ' افریقہ اور لاطینی امریکہ کی ان آمریتوں کے نعروں سے جو کہ سوشلزم کو اپنے اپنے مقاصد کے تحت استعمال کر رہی تھیں۔ وہ سوشلزم کا علیحدہ اور

منفرد نظریہ رکھتے تھے جو اسکینڈے نیویائی ملکوں سے زیادہ قریب تھا لیکن اسے بھی ماڈل قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ بھٹو پاکستان کی تہذیب، تاریخ اور یہاں کے عوام اور ان کے تمدن اور نظریئے کو اپنے سوشلسٹ نظریہ میں شامل کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی ان سے نہ تو کبھی نکسالی اور سکہ بند سوشلسٹ مطمئن ہو سکے اور نہ ہی دائیں بازو کے قدامت پسندوں کی سمجھ میں ان کی بات آ سکی۔ ویسے بھی یہ دونوں اپنی اپنی سرپرست عالمی طاقتوں کے نعروں کو استعمال کرتے تھے۔ اسلام کا نعرہ، امریکی بلاک سے تعاون کرنے والے لوگوں کو مرغوب تھا اور سوشلزم کا نعرہ، اس کی مخالف قوتوں کا ساتھ دینے والے لگاتے تھے۔ نہ ان کے اسلام کا تعلق حقیقی اسلام سے تھا اور نہ ہی ان کے سوشلزم کا تعلق اپنے ملک کے عوام سے تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو ان دونوں طاقتوں سے طویل جنگ لڑنا پڑی۔ دائیں بازو کے لوگوں سے جو اپنے آپ کو اسلام پسند قرار دیتے تھے اُن سے کھل کر لڑنا پڑا اور بائیں بازو کے نکسالی سوشلسٹ، جو خود ان کی پارٹی میں بھی شامل ہو گئے تھے ان سے پارٹی کے پلیٹ فارم پر طویل جنگ لڑنا پڑی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ بھٹو اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ وہ ایک مرتی ہوئی دنیا کے بھوتوں سے لڑتے ہوئے اپنی جان دے گئے اگر قدرت نے انہیں مہلت دی ہوتی اور انہیں آج کی دنیا میں سیاست کرنے کا موقع ملا ہوتا تو شاید وہ واحد لیڈر ہوتے جو اس بدلی ہوئی دنیا کے پیچھے چلنے کی بجائے اس کے آگے چل رہے ہوتے۔ آج کے لیڈروں کی حالت یہ ہے کہ تیزی کے ساتھ رونما ہونے والی تبدیلیاں ان کی آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی ہیں اکثر اوقات واقعات ان کی سوچ سے پہلے رونما ہو جاتے ہیں اور انہیں واقعات کے تعاقب میں لپک کر چلنا پڑتا ہے۔ گورباچوف کے سوا اس وقت عالمی طور پر کوئی بھی ایسا لیڈر نظر نہیں آتا جو ان حیران کن تبدیلیوں کا ساتھ دے سکے۔ بھٹو ان تبدیلیوں کا نہ صرف ادراک کر رہے ہوتے بلکہ وہ ان کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی اہلیت بھی رکھتے تھے لیکن یہ قدرت کو منظور نہیں تھا۔ جو بات میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بھٹو صاحب، سوشلزم کا جو تصور لے کر آئے تھے وہ درحقیقت اس دنیا کی نشاندہی کر رہا تھا جو 80ء کے عشرے میں تشکیل پانا شروع ہوئی اور آج ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے ہے۔ اگر آپ 1960ء اور 1970ء کے عشرے میں ذوالفقار علی بھٹو کی وہ سیاست سمجھ لیں جو انہوں نے اپنے حامی اور مخالف ترقی پسند سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے ساتھ کی تو یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ ان کے پیش نظر ایک اور ہی دنیا تھی لیکن جو سکہ بند ترقی پسند گورباچوف کے زمانے میں حقائق کو نہیں سمجھ پا رہے، وہ بھٹو کی بات بھلا کیا سمجھ پاتے؟ ذوالفقار علی بھٹو کے سوشلزم کا ایک عملی نمونہ تو ان کی عملی سیاست ہے۔ جس میں نہ تو کسی بلاک کی غلامی کا پہلو تھا اور نہ ہی دنیا کو وہ اس انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے کہ اس دور کی قیادتیں دیکھتی ہیں۔ وہ اپنی ذہانت اور بے پناہ سیاسی شعور کی بناء پر نہ صرف ملک کے اندر اکیلے بلکہ عالمی طور پر بھی تنہا تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو وقت سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ انہوں نے وقت کا ساتھ دینے کی بہت کوشش کی لیکن وقت ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اس عظیم لیڈر کی

www.bhutto.org

جانشین ہیں جو تاریخ کا نہایت گہرا شعور رکھتا تھا اور جسے مستقبل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا مکمل ادراک تھا۔ خوش قسمتی سے یہ عظیم لیڈر ان کے والد بھی تھے یہ وہ امتیاز ہے جو کسی دوسرے لیڈر کو حاصل نہیں ہے۔ بھٹو نے اپنی بیٹی کو سیاست کے ان اسرار و رموز سے بھی آگاہ کر دیا تھا جن سے وہ اپنے سیاسی ساتھیوں کو آگاہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں کوئی رازداری کی بات نہیں 'مسئلہ یہ تھا کہ بے نظیر ایک بیٹی ہونے کی حیثیت میں اپنے والد کی باتوں پر بغیر کسی تیل و حجت اور تنقید کے اعتبار کرتی تھیں اور انہی باتوں کی روشنی میں شعور کی تشکیل میں مصروف رہتی تھیں جبکہ سیاسی ساتھی ان کی پیش گوئی نما تعلیمات کو یا تو مجذوب کی بڑ سمجھتے یا اپنے لیڈر کا رومانوی خواب سمجھ کر انہیں نظر انداز کر دیتے تھے۔ بھٹو کی سیاسی تربیت نے بے نظیر بھٹو کو دیگر لیڈروں کے مقابلے میں نئے دور کا شعور بہتر انداز میں دیا ہے۔ بے نظیر بھٹو کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ سرد جنگ کے عہد کی پیداوار نہیں ہیں۔ ان کا سیاسی شعور بدلتے زمانوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھا اور وہ اپنے عظیم والد کے سیاسی ورثے کی مالک بھی ہیں۔ بھٹو کے سیاسی ورثے میں مستقبل کے جو خاکے 'اندازے اور تصورات موجود ہیں ان کی آج کے لیڈروں کو ہوا تک نہیں لگی۔ ہمارے لیڈر ابھی تک سرد جنگ کے اثرات سے باہر نہیں نکلے۔ انہیں تو یہ بھی علوم نہیں کہ روس اور امریکی بلاک باقی نہیں رہے۔ وہ ابھی تک یہ نہیں جانتے کہ دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے وہ ابھی تک کسی سرپرست کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ انہیں یہ اندازہ ہی نہیں کہ آج قومیں بالغ ہو چکی ہیں اور ان کے سروں سے ان کی سرپرست سپر طاقتوں کے دست ہائے شفقت کھینچ رہے ہیں۔ بے نظیر نے اپنی سیاست کسی سہارے کے بغیر شروع کی۔ ملکی تاریخ کے سب سے جابر ظالم طاقتور اور اخلاق سے عاری حکمران کا مقابلہ کیا اور اس بہادری سے کیا کہ پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی سیاسی لیڈر اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ شاید بے نظیر کی قسمت میں ہی ایک نئے دور کی بنیاد رکھنا ہے۔ اپنی پارٹی کی سیاست میں وہ ایک یتیم لڑکی کے طور پر داخل ہوئی اور اسے اپنی منزل تک پہنچا دیا۔ ایسی منزل جس کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ خود پارٹی لیڈر اور کارکن مایوس ہو چکے تھے لیکن صرف بے نظیر بھٹو کے عزم و اعتماد اور لگن کے نتیجے میں پارٹی اپنی منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ یہ منزل اقتدار نہیں تھا یہ منزل تھی عوام کی جمہوری آزادی 'پریس کی آزادی 'انسانی حقوق کی بحالی 'عدلیہ کی آزادی 'قانون کی حکمرانی 'عورتوں کی آزادی اور اسی قسم کے بے شمار انسانی حقوق۔ اسی طرح جب وہ پاکستان کی وزیر اعظم بنیں تو اس وقت امریکہ اور روس اپنے اپنے بلاکوں کو چھوڑ کر اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ یہ سوچنا غلط ہو گا کہ صرف روس ہی افغانستان سے نکلا ہے بڑی طاقتوں کے اس کھیل میں کبھی ایک واپس نہیں جاتا لڑتے ہیں۔ تو دونوں ہی لڑتے ہیں واپس جاتے ہیں تو دونوں ہی واپس جاتے ہیں اگر سوویت یونین افغانستان سے گیا ہے تو امریکہ بھی پاکستان سے دشت کش ہو رہا ہے اور بے نظیر کا پاکستان کسی کا مرہون منت پاکستان نہیں ہے۔ پرانے دور کے تصورات میں اسیر لوگ ابھی تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ بے نظیر امریکہ کے زیر اثر ہیں بلکہ اس کی مدد سے حکومت میں آئی ہیں۔

www.bhutto.org

یہ تو ممکن ہے کہ کوئی سپر طاقت کوئی حکومت بدل دے لیکن یہ کسی کے بس میں نہیں ہوتا کہ حکومت چلا بھی دے۔ افغانستان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اپنی پسند کے شخص کو حکومت میں رکھنے کے لئے سوویت یونین کو اپنی فوجیں میدان میں اتارنا پڑی تھیں۔ امریکہ بھی اپنی پسند کا حکمران مسلط کرنا چاہے گا تو اسے بھی ایسی حکومت چلانے کیلئے اپنی فوجیں میدان میں لانا پڑیں گی۔ آج کے دور میں یہ تصور کرنا بھی احمقانہ بات ہے کہ کوئی سپر طاقت اپنی مرضی کی حکومت کسی ملک میں نہ صرف مسلط کر سکتی ہے بلکہ اسے چلا بھی سکتی ہے بے نظیر بھٹو عوام کی طاقت سے برسر اقتدار آئی ہیں۔ جو لوگ اس کا کریڈٹ امریکہ یا کسی دوسری طاقت کو دیتے ہیں، وہ اپنے عوام کی بھی توہین کرتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو کو تو ایک ایسا پاکستان دیا گیا جو امریکہ کی خاطر بے معنی جنگ لڑتا ہوا اپنا وجود خطرے میں ڈال چکا تھا۔ اس کے اندر تیس لاکھ افغان مہاجر کیمپوں میں پڑے ہوئے تھے۔ اس کے شہروں اور دیہات میں اسلحے کے انبار لگ چکے تھے۔ اس کے معاشرے میں ہیروئن، رشوت، بدعنوانی، بدکرداری، سمگلنگ، ٹیکس چوری اور بداخلاقی کا زہر پھیل چکا تھا۔ ان کے سامنے کوئی مقصد تھا نہ کوئی منزل، معیشت تباہی کے کنارے پر کھڑی تھی اور زندہ رہنے کے لئے روٹی کو ہی نہیں خوابوں کو بھی ترس رہے تھے۔ یہ بالکل وہی صورتحال تھی جو ذوالفقار علی بھٹو کو اقتدار میں آنے کے بعد ملی تھی۔ اس وقت بھی پاکستان ایک بے معنی جنگ میں اپنا سب کچھ لٹا چکا تھا۔ اس وقت بھی پاکستان کی معیشت تباہ ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی پاکستانی عوام کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ فوجی آمریت نے ہمارے عوام کو ان کے خوابوں سے محروم کر دیا تھا اور وہ مایوسی اور نا امیدی کے عالم میں یہ سوچ رہے تھے کہ پاکستان اور اس کی آزادی باقی بھی رہ سکے گی یا نہیں۔ اس وقت بھی ہمارے ترانوے ہزار فوجی بھارتی کیمپوں میں پڑے تھے اور انہیں وطن واپس لا کر ان کے عزیزوں اور بھائیوں کی خوشیاں لوٹانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ بے نظیر بھٹو کو اقتدار ملا تو بھی حالات اس سے مختلف نہ تھے۔ معیشت اسی طرح تباہ تھی۔ عوام اسی طرح مایوس تھے۔ افغانستان کی طوفانی جنگ کا نتیجہ اسی طرح پاکستان کے لئے مایوس کن رہا ضیاء الحق اور اس کی نامزد سول حکومت نے جنیوا میں اپنے مستقبل کا سودا کر دیا تھا۔ مہاجرین کا مسئلہ جوں کا توں چھوڑ دیا گیا۔ پاکستان کے مسائل الجھا دیئے گئے درحقیقت یہ سپر طاقتوں کا معاہدہ تھا جس میں دونوں کے ایجنٹوں نے اپنے اپنے آقاؤں کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے دستخط کر دیئے تھے 1971ء میں دستخط کرنے والوں کو حکم اندرا گاندھی اور یحییٰ خان نے دیا تھا اور اب کی بار یہ حکم جنرل نجیب اور جنرل ضیاء نے دیا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اندرا گاندھی کی سرپرستی اس وقت امریکہ نے کی تھی اور اب کے بار ہمارے دشمن کی سرپرستی سوویت یونین نے کی تھی۔ باپ بیٹی دونوں کے مقدر میں ایک بات مشترک ہے کہ دونوں کو اقتدار اس وقت دیا گیا جب فوجی حکمران اپنے ملک کو تباہی و بربادی کے کنارے پہنچا چکے تھے۔ بھٹو نے اقتدار میں آنے کے بعد نہ صرف ٹوٹی ہوئی امیدوں کو جوڑا بلکہ ٹوٹے ہوئے دلوں اور لٹے ہوئے خوابوں کو بھی از سر نو مرتب کیا۔ ان کے سامنے نوے ہزار فوجی بھائیوں کو دشمن کے قید خانوں

www.bhutto.org

سے نکال کر اپنے گھروں میں آباد کرنے کا مسئلہ تھا جو انہوں نے کامیابی کے ساتھ سلجھایا۔ ان کے سامنے تباہ شدہ معیشت کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کا مسئلہ بھی تھا۔ ان کے سامنے مسلح افواج کی بکھری ہوئی قوت کو از سرِ نو منظم کرنے کا مسئلہ تھا ان کے سامنے عوام کی قوت کو متحرک کر کے ملک کی تعمیرِ نو کا سوال تھا۔ بے نظیر بھٹو کو بھی اقتدار میں آتے ہی انہی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں بھی بکھری ہوئی معیشت کو پھر سے اکٹھا کرنا پڑا۔ انہیں بھی گیارہ سالہ آمریت میں کچلے ہوئے عوام کو حوصلہ دینا پڑا۔ انہیں بھی مایوسیوں اور نا امیدیوں سے روشنی کی کرن بن کر چمکنا پڑا اور ان کے سامنے بھی 30 لاکھ مسلمان بھائیوں کو ان کے گھروں میں آباد کرنے کا سوال تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت ہمارے بھائی دشمن کے قید خانوں میں تھے اور آج مہمان ہیں لیکن میں تو صرف اس مشابہت کی بات کر رہا ہوں جو باپ بیٹی کے دورِ اقتدار میں پائی جاتی ہے۔ دونوں کو اقتدار خلوصِ نیت سے نہیں دیا گیا۔ دونوں کو حکومت دینے والے اندر سے یہ خواہش کر رہے تھے کہ یہ ناکام ہوں گے۔ خواہش ہی نہیں بلکہ وہ کوشش بھی کر رہے تھے کہ انہیں قدم جمانے کا موقع نہ دیا جائے۔ گویا پہلے تو یہ اہتمام کیا گیا کہ یہ نارمل حالات میں اقتدار ہی میں نہ آئیں اور جب حالات اتنے بگڑ گئے کہ ان پر قابو پانا بر سرِ اقتدار طبقوں کے لئے ناممکن ہو گیا اور یہ بات واضح ہو گئی کہ اب حکومت میں آنے والے کو سوائے ناکامی کے کچھ نصیب نہ ہو گا تو بھٹو اور پھر ان کی بیٹی کو اقتدار دیا گیا اور ان کو یہ موقع نہ دیا گیا کہ وہ سکون کے ساتھ تباہی کے اثرات سے نکل سکیں بلکہ اقتدار دیتے ہی ان کے خلاف سازشیں بھی شروع کر دی گئیں۔ یہی ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ہوا تھا اور یہی بے نظیر بھٹو کے ساتھ ہو رہا ہے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عوام کے خلاف سازشیں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ حالات کی یہ ناسازگاری اور مخالفین کی سازشیں بھٹو کے خلاف بھی اسی طرح تھیں اور ان کی بیٹی کے خلاف بھی اسی طرح ہیں لیکن بھٹو نے بھی عوام کی طاقت سے ان سب کو ناکام بنا دیا تھا اور تھوڑے ہی عرصے میں پاکستان کو ایک مضبوط اور خوشحال ملک بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور بے نظیر بھٹو بھی ان سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آج اس مرحلہ پر آ گئی ہیں کہ اگر کسی عاقبت نا اندیش نے حماقت کر کے قوم کو خود کشی کے منہ میں نہ دھکیلا تو پاکستان اپنے مسائل پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائے گا یہاں پر ایک اور دلچسپ مماثلت کا ذکر بے جا نہ ہو گا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اقتدار میں آنے کے بعد ابتدائی مسائل پر قابو پاتے ہی پاکستان کے اصل اور حقیقی مسئلے یعنی کشمیر کی طرف توجہ مبذول کی تھی اور بیٹی بے نظیر بھٹو نے بھی قومی اسمبلی میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرتے ہی اس مسئلہ پر توجہ مبذول کر دی اور عدم اعتماد کی تحریک کو ناکام بنانے کے بعد انہوں نے کشمیر کو اپنی توجہ کا محور بنا لیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پارٹی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے میں نے کشمیر اور پیپلز پارٹی کے عنوان سے بھی علیحدہ باب شامل کیا ہے۔ اس میں بھٹو کے یہ الفاظ بھی آپ کو یاد ہوں گے کہ یہ پاکستانی عوام کا ایمان اور پارٹی کا اعلیٰ ترین مشن ہے یعنی کشمیر کی تحریکِ آزادی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا۔ بھٹو نے بھی لکھا تھا کہ پاکستان کشمیر کے بغیر ایسا ہی ادھورا ہے جیسے ایک جسم

www.bhutto.org

کے بغیر سرتینتالیس سال تک کشمیر کے نہتے عوام نے بھارتی قبضے کے خلاف جدوجہد کی ہے۔ ان کی جدوجہد آزادی پاکستان کو مکمل کرنے کی جدوجہد ہے۔ کشمیری عوام سے کئے گئے وعدے پورا کرنے کے مقابلے میں پاکستان کو کوئی اور کام عزیز نہیں ہو سکتا اور کوئی دوسرا فرض اس سے افضل نہیں ہو سکتا۔ اسی ذمہ داری سے پہلو تہی پاکستان کے لئے تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ پارٹی کا عہد ہے کہ وہ عزت کے راستے سے کبھی نہیں ہٹے گی اور جموں و کشمیر کو آزاد کرانے سے کبھی نہیں پھرے گی۔ نتائج سے بے نیاز ہو کر خدا اور انسان سے کئے گئے وعدے کو پورا کرے گی۔ پارٹی اور بھٹو کا یہی وعدہ ہے، یہی عزم ہے بلکہ ایمان ہے جس کی روشنی میں بے نظیر بھٹو نے انتہائی بُرے حالات کے باوجود کشمیر کی جنگ آزادی میں بھرپور کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ بہت نازک حالات ہیں۔ عالمی رائے عامہ کی حالت آج وہ نہیں ہے جو 50ء کے عشرے میں تھی۔ کشمیر کے مسئلے کو بھول چکی تھی۔ پاکستان کے فوجی آمروں نے اس مسئلہ کو طاق نسیاں میں رکھ دیا تھا۔ حد یہ ہے کہ پاکستان کے سیاسی لیڈر حتیٰ کہ پاکستان کی وزارتِ دفاع کے اہم اہلکار اور افسران بھی اس مسئلہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے لیکن بے نظیر بھٹو نے جو کہ اپنے عظیم والد کے خوابوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا مصمم ارادہ کئے ہوئے ہیں 'انہوں نے تمام سازشوں' عالمی حالات اور بے قاعدگیوں کے باوجود اس اوّلیں فرض کو ادا کرنے میں بھی کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ آج خود بھارت کے لوگ بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ کشمیر ان کے ہاتھوں سے نکل رہا ہے۔ سیاسی قیادتیں فوجی حملے نہیں کیا کرتیں وہ سیاسی حکمت عملی کے ذریعے ہی اپنے مقاصد حاصل کیا کرتی ہیں۔ ماضی کے فوجی حکمرانوں نے کشمیر کے مسئلے کو ایک مردہ مسئلہ سمجھ کر اس کو دفن کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے پاکستان کے عوام میں بھی مایوسی پیدا کر دی تھی اور یہ باور کیا جانے لگا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ دوبارہ شاید کبھی زندہ نہ ہو سکے۔

لیکن آج صورتحال کیا ہے۔ کشمیر کی جنگِ آزادی ایک ایسے فیصلہ کن موڑ پر آ چکی ہے کہ اب یا تو بھارت کشمیر پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کی کوشش کرے تو اندر سے چیخ جائے گا یا پھر اسے کشمیر سے اپنا قبضہ چھوڑنا پڑے گا لیکن اس طرح رجعت پسند اور تنگ نظر قوت آسانی کے ساتھ اپنی گرفت کسی کی شہ رگ سے ہٹایا نہیں کرتی۔ پیچھے ہٹنے سے پہلے اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ متاثرین کو جس قدر بھی تباہی سے دوچار کیا جا سکتا ہو کر دے۔ بے نظیر بھٹو بھارت کے اس ردِ عمل سے واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو وہ کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی کے ساتھ پاکستان کے پختہ وعدہ پر قائم ہیں اور دوسری طرف وہ بھارت کی ان سازشوں کو بھی ناکام بنا رہی ہیں جو وہ کشمیریوں کے ہاتھوں ہونے والی ذلت ورسوائی کا داغ مٹانے کے لئے پاکستان پر حملہ کی غرض سے کر رہا ہے۔ باپ اور بیٹی کے مقدر میں ایک اور بات مشترک نظر آ رہی ہے اور وہ یہ کہ جب وہ پاکستان کو مایوسیوں اور تلخیوں کی دلدل سے نکال کر کامیابیوں استحکام اور خوشحالی کی راہ پر گامزن کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تو انہیں اپوزیشن کی طرف سے تعاون میسّر نہیں آتا بلکہ ان

www.bhutto.org

کے خلاف سازشیں ہی کی جاتی ہیں۔ شہید بھٹو کو بھی شکست کے آثار مٹانے اور پاکستان کی فوجی اخلاقی اور معاشی قوتوں کو بحال کرتے وقت اس قسم کی مخالفتوں اور سازشوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی بیٹی بھی آج اس قسم کی سازشوں اور مخالفتوں کا سامنا کرتے ہوئے پاکستان کو آمریت کے نہ صرف تباہ کن اثرات سے نکالنے میں مصروف ہیں بلکہ اس کے ماتھے پر کامیابیوں کے جھومر سجانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

ان چند سطور میں یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ بے نظیر بھٹو نہ صرف سیاسی 'نظریاتی اور اصولی اعتبار سے اپنے عظیم والد ذوالفقار علی بھٹو کی حقیقی وارث ہیں بلکہ وہ اس مشن کو لے کر بڑے وقار کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ آج جب میں اس کتاب کے آخری باب کو مکمل کر رہا ہوں تو میرے سامنے اخبارات کی سرخیاں ہیں جن میں اطلاع دی گئی ہے کہ وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو کے خلاف ایک اور قرارداد عدم اعتماد لائی جا رہی ہے۔ یہ نئی بات نہیں اس کی توقع پہلے ہی تھی۔ یہ لوگ صرف چھ ماہ کا وہ عرصہ پورے کرنے کے منتظر تھے جس کے تحت ایک قرارداد عدم اعتماد کے بعد دوسری لانے کے لئے چھ ماہ کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اسی دوران بڑے منظم انداز میں بے نظیر حکومت کے خلاف کرپشن کے نام پر ایک مہم چلائی گئی اور یہ مہم چلانے والے وہ لوگ ہیں جو گذشتہ گیارہ سال تک لوٹ مار میں مصروف رہے۔ ان کی سربراہی ایک ایسا خاندان کر رہا ہے جس کی بدعنوانیوں کی داستانیں پنجاب میں بالخصوص لاہور کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ اصل میں کرپشن پر ان لوگوں کا اجارہ ہے۔ پاکستان کو لوٹنا' پاکستان کے عوام کو لوٹنا یہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔ جونیجو دور میں ان لوگوں نے اربوں روپے بینکوں اور مالیاتی اداروں سے حاصل کئے یہ ان کا حق ہے۔ جب تک لوٹ مار کی اجارہ داری ان لوگوں کے پاس رہتی ہے حالات بالکل درست ہوتے ہیں۔ کرپشن کہیں نہیں ہوتی یہ بالکل صاف اور پاکباز لوگ ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی عوام کی کوئی منتخب حکومت آکر ان کی لوٹ مار میں کچھ کمی کر دیتی ہے اور صنعتی اور تجارتی قرضے ایسے لوگوں کو دینے لگتی ہے جو ان کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تو یہ لوٹ مار کا شور مچا دیتے ہیں۔ بے نظیر نے کیا کرپشن کی؟ بینظیر نے یہ کرپشن کی کہ اس نے صنعتی قرضے غریب لوگوں کو دینا شروع کر دیئے۔ اس نے ترقیاتی کام ان افراد کے ذریعے شروع کرا دیئے جو لوٹ مار کی اصل کلب کے رکن نہیں تھے یہی چیز ان لوگوں کو گوارہ نہیں تھی۔ دولت جو ان کے ہاتھوں میں سمٹ چکی ہے کسی بھی طریقہ سے وہ پھیلے یا عوام تک جائے انہیں یہ بات پسند نہیں ہے کیونکہ بے نظیر بھٹو نے سرمایہ کو اس کلب سے باہر نکال کر عوام میں پھیلانے کی کوشش کی۔ بے نظیر بھٹو نے پیپلز ورکس پروگرام کے منصوبے پیپلز پارٹی کے عام کارکنوں کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا راستہ اختیار کیا۔ بے نظیر نے قرضے ایسے لوگوں کو دینا شروع کئے جو نہ کسی کو رشوت دے سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے پاس گارنٹیاں دینے کیلئے پہلے سے لوٹی ہوئی جائدادیں موجود ہیں چونکہ بے نظیر نے ان کے مقابلے میں صنعت اور تجارت میں کچھ نئے لوگوں کو کھڑا کرنے کی کوشش کی لہٰذا ان کی حکومت کرپٹ ہے۔ ان کی حکومت بدعنوان ہے لیکن بے نظیر نے یہ کام اپنی ذات یا اپنی پارٹی کیلئے

www.bhutto.org

نہیں کیا بلکہ انہوں نے ایک بہت بڑے بحران کو سامنے رکھتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اگر ارتکاز دولت کا یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ پرامن انداز میں دستور اور قوانین کے اندر رہتے ہوئے 'اصولوں اور ضابطوں کا احترام کرتے ہوئے' رائج الوقت نظام کو خراب کئے بغیر دولت کو عام لوگوں تک پھیلانے کی پالیسی اختیار کی۔ ان کو تاہ اندیشوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ بے نظیر کی ان پالیسیوں کی وجہ سے ہی ان کے خلاف عوام کا بڑھتا ہوا غم و غصہ کسی قدر کم ہو گا اور وہ ان کے غیض و غضب کا شکار ہونے سے اور کچھ دیر بچ جائیں گے۔ بے نظیر نے ایک بہت بڑے ہنگامے اور انارکی کو روکنے کیلئے ایسے قدم اٹھائے ہیں لیکن وسائل پر قابض طبقوں کو یہ طریقے بھی پسند نہیں۔ وہ عوام کو اتنی سی رعایت دینے کو بھی تیار نہیں اور انہیں بے نظیر کی یہ پالیسیاں جن کے تحت وہ عوام کو قومی مسائل میں شریک کرنے کی کوشش کر رہی ہیں' پسند نہیں آ رہی ہیں لیکن ان کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ پاکستان کے حکمران طبقے ہمیشہ سے ہی تنگ نظری اور بے عقلی کا شکار رہے ہیں۔ ایک مرتبہ مشرقی پاکستان کی صورت میں قوم کو اس کی تاریخ کے بدترین بحران سے دوچار کر چکے ہیں اور آج بھی وہ قوم کو ایک ایسے ہی بحران سے دوچار کرنے کیلئے اندھا دھند ٹکریں مار رہے ہیں لیکن بے نظیر اس لئے بے نظیر نہیں کہ وہ پاکستان کی وزیراعظم ہیں۔ وزارت عظمیٰ نے تو ان کے مقام اور مرتبے میں کچھ کمی ہی کی ہے۔ انہیں وزارت عظمیٰ سے کوئی عزت نہیں ملی ہے یہ تو بے نظیر ہیں جنہوں نے وزارت عظمیٰ کو قبول کر کے اسے عزت بخشی ہے تو میرے لئے ان کا حکومت میں رہنا یا نہ رہنا کوئی اہم بات نہیں۔ میری نظر میں بے نظیر کی اہمیت اور ان کا تاریخی کردار وہ ہے جو وہ پاکستان کے مظلوم اور پسے ہوئے عوام کی قائد کی حیثیت میں ادا کر رہی ہیں۔ وہ پاکستان کے عوام کے خوابوں کی امین ہیں۔ وہ ان خوابوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا عزم رکھتی ہیں اور ان کا یہ عزم ہی ہمارا سرمایہ ہے اگر وہ وزارت عظمیٰ پر فائز ہیں جب بھی اور نہیں ہیں تب بھی وہ پاکستان کے غریب عوام کی غیر متنازعہ لیڈر ہیں۔ ان کا کوئی حریف نہیں' ان کا کوئی مقابل نہیں۔ وہ جس پرچم کو لے کر آگے بڑھ رہی ہیں دوسرا کوئی اسے اٹھانے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا' دوسرا کوئی اس پرچم کو اٹھانے کا اہل ہی نہیں ہے۔ یہ بے نظیر بھٹو کا مقدر ہے کہ وہ پاکستانی عوام کو اپنے ساتھ لے کر اکیسویں صدی کے روشن زمانے میں فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہوں۔ یہ سفر حکومتوں کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔ یہ تاریخ کا سفر ہے اور تاریخ کے اس سفر میں ہم سب بے نظیر بھٹو کے ساتھ ہیں۔

(6 اگست 1990ء)

www.bhutto.org

www.bhutto.org

آخری باب

6اگست 1990ء کے دن میری کتاب مکمل ہوئی اور اسی شام تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوگیا۔ میرا خیال تھا کہ میں اگلے روز کتاب کا مسودہ جنگ پبلشرز کے حوالے کر دوں گا لیکن رات کو گھر پر ایک ڈی ایس پی صاحب تشریف لائے اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں ہر وقت اپنے آپ کو ان کے لئے دستیاب رکھوں۔ یہ عجیب و غریب حکم تھا۔ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی لیکن مجھے رضا کارانہ طور پر اپنے ہی گھر میں نظربند رہنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ چند روز اسی مخمصے میں گذر گئے کہ یہ نظربندی ہے کہ قید۔ دوسری طرف میرا کاروبار جس کا زیادہ تر تعلق حکومتی اداروں سے تھا اس پر دباؤ پڑنا شروع ہوگیا۔ میرے بل روک دیئے گئے۔ مجھ پر معاشی دباؤ بڑھا دیا گیا۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ ذہنی پریشانی کی ایک کیفیت تھی۔ اس میں 'میں کتاب کی طرف نہ دیکھ سکا۔ چند روز میں سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر کراچی تشریف لے آئیں پھر ان کے ساتھ مختلف عوامی تقریبات اور جدوجہد کے عمل میں شریک ہونا پڑا۔ خصوصاً ان کے خلاف مقدمات کی جو بھرمار کی گئی "اس میں" میں بھی دیگر کارکنوں کی طرح ان کے قدم بقدم عدالتوں میں شریک رہا۔ ان مصروفیات کی وجہ سے کتاب کی طرف توجہ نہ دی جا سکی۔ اب بھی اسی بھاگ دوڑ میں سے کچھ وقت نکال کر اس مسودہ پر نظرثانی کی۔ اس طرح مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی کہ مسودہ میں تبدیلی کروں بلکہ بعض باتیں جو میں نے کتاب میں دورانِ اقتدار لکھی تھیں۔ وہ ثابت ہوتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ کتاب میں جا بجا محترمہ بے نظیر بھٹو کا حوالہ ان کے دورِ اقتدار کی نشاندھی کرتا ہے۔ اگر میں تبدیلی کرنے بیٹھ جاتا تو زیادہ تاخیر کا امکان تھا۔ لہٰذا مناسب یہ ہی سمجھا کہ 6 اگست سے لکھی گئی پوری کتاب کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور کتاب میں مزید ایک باب کا اضافہ کر دیا جائے اور بعد کے حالات کا

www.bhutto.org

جائزہ لے لیا جائے۔

جیسا کہ میں نے گذشتہ ابواب میں جابجا اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو اقتدار خوش دلی کے ساتھ منتقل نہیں کیا گیا تھا بلکہ اقتدار دینے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ناکامی سے دوچار کر کے انہیں ہمیشہ کے لئے سیاسی منظر سے ہٹا دیا جائے لیکن یہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی ہمت، اہلیت اور قائدانہ صلاحیتیں تھیں کہ انہوں نے ان تمام سازشوں کا مقابلہ کر کے پاکستان کو استحکام اور ترقی کے راستے پر گامزن کر دیا۔ ملک ان 20 ماہ میں کہاں تک پہنچ گیا تھا اس کا اندازہ ان حقائق سے لگایا جا سکتا ہے کہ 6 اگست تک پاکستان اس خطے کے سب سے مستحکم اور باوقار ملکوں میں شمار ہوتا تھا یہاں پر ترقیاتی منصوبے جاری تھے۔ عالمی سرمایہ کاری کا رجحان بڑھ رہا تھا سیاسی استحکام حاصل ہو چکا تھا۔ اسمبلیاں ٹھیک طرح سے کام کر رہی تھیں۔ قومی اسمبلی میں محترمہ بے نظیر بھٹو کو قابل اعتماد حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ حکومت نے اپنے قدم جما لئے تھے۔ ترقیاتی منصوبوں کے ساتھ ساتھ صنعتیں لگ رہی تھیں۔ ملک میں زرِ مبادلہ کے ذخائر کافی اونچی حد کو چھو چکے تھے لیکن جیسے ہی غیر آئینی طور پر ایک منتخب حکومت کو ختم کیا گیا دیکھتے ہی دیکھتے یہ تمام چیزیں نظروں سے اوجھل ہونے لگیں۔ وہی پاکستان جہاں سرمایہ کاری کے لئے عالمی ادارے راغب تھے اب ایک ناپسندیدہ مقام بن کے رہ گیا۔ عالمی مالیاتی اداروں نے امداد سے ہاتھ کھینچ لئے۔ امریکہ نے پاکستان کو سیاسی عدم استحکام کا شکار ہوتے دیکھ کر امداد میں کمی کا فیصلہ کر لیا اور جو امداد باقی رکھنے کا فیصلہ ہوا اس پر بھی مذاکرات کی شرط عائد کر دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان کی وہ معیشت جو مضبوط بنیادوں پر استوار ہونے جا رہی تھی ایک دفعہ پھر بحران سے دوچار ہو گئی۔

دوسری طرف مسئلہ کشمیر بھارت کے لئے وبالِ جان بن گیا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت نے داخلی استحکام حاصل کرنے کے بعد بھارت کو کشمیر کے سوال پر ساری دنیا میں دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عالمی رائے عامہ میں کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی سے ہمدردیاں بڑھنے لگی تھیں اور بھارت ہر جگہ دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ دوسری طرف کشمیری عوام کے حوصلے بلند تھے اور وہ دن بدن زیادہ منظم اور موثر انداز میں اپنی جدوجہد کو آگے بڑھانے لگے تھے پاکستان کے عالمی وقار کا یہ عالم تھا کہ اقوام متحدہ کے تحت ستمبر میں بچوں کے عالمی اجتماع کے سلسلے میں جہاں ستر ملکوں کے سربراہ شریک ہونا تھے اس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو کو کرنا تھی لیکن جمہوریت کا خاتمہ ہوتے ہی پاکستان اس اعزاز سے بھی محروم ہو گیا۔ اسی طرح جسٹس دراب پٹیل اس بار عالمی عدالت کے جج منتخب ہو رہے تھے۔ اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ انہیں اکثریت حاصل ہونے کا یقین تھا لیکن انہیں بطور امیدوار واپس بلا کر پاکستان کو اس اعزاز سے بھی محروم کر دیا گیا۔ سب سے بڑی بات خلیج کی صورتحال ہے۔ میں اسے پاکستان کی دوسری بڑی بدنصیبی سمجھتا ہوں کہ جب بھی علاقائی حالات پاکستان کے لئے بہتر امکانات سامنے لاتے ہیں، ہمارے ملک میں آمریت کے سائے منڈلانے لگتے ہیں اور پاکستان اس صورتحال میں اپنی پوزیشن کا فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جاتا ہے۔ 1978ء

www.bhutto.org

میں افغان انقلاب سے قبل ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم کی گئی اور اس خطے میں جو تاریخ ساز تبدیلی رونما ہوئی تھی پاکستان اس کا فائدہ اٹھانے سے محروم رہا۔ دو سپر پاورز کی اس کشمکش میں پاکستان ایک آلۂ کار کے طور پر سوویت یونین جیسی سپر طاقت سے نبرد آزما ہوا۔ اس نے اپنی تباہی کا خطرہ مول لیا لیکن اس کا معاوضہ صرف یہ حاصل کیا کہ جنرل ضیاء الحق نے اپنی آمریت کے لئے مغربی سرپرستوں سے مدد حاصل کی۔ گویا پاکستان کے عوام ایک طرف امریکی مفاد کے لئے روسی فوجوں سے لڑ رہے تھے۔ اپنے ملک میں 30 لاکھ افغان مہاجرین کی میزبانی کر رہے تھے۔ اندرون ملک تخریب کاری کا مقابلہ کر رہے تھے پاکستانی شہریوں کی جان و املاک تباہ ہو رہی تھی۔ پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزیاں ہو رہی تھیں اور اس کے عوض پاکستان حاصل کیا کر رہا تھا؟ اس پر ایک آمر کی حکومت مسلط رکھی گئی۔ جنگ کی تباہی ہمارا مقدر بنی اور جنگ کے فوائد امریکی حاصل کر گئے۔ یہ آمریت کا پھل تھا جو ہمیں نصیب ہوا۔ دوسری مرتبہ خلیج میں امریکی افواج کی آمد کے بعد ایک ایسی صورتحال پیدا ہوئی تھی کہ پاکستان اس خطہ میں ایک اہم مسلمان فوجی طاقت ہونے کی حیثیت میں انتہائی اہم کردار ادا کر سکتا تھا اور اس کردار میں پاکستان کے لئے نہ صرف یہ کہ رعائتی نرخوں پر تیل ملنے کے بہت امکانات تھے بلکہ یہاں ہم اپنے ملک کے لئے بے شمار اقتصادی مفادات حاصل کر سکتے تھے۔ بدلی ہوئی فوجی صورتحال میں بے شمار نئی مارکیٹیں پیدا ہوئیں' بے شمار صنعتی امکانات پیدا ہوئے' ملازمتوں کے بے شمار مواقع پیدا ہوئے اور دوسری بات یہ کہ پاکستان کو اس بحران میں جو مالی نقصان برداشت کرنا پڑا اور اس نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت جو مؤقف اختیار کیا اس کے بدلے میں پاکستان کو تلافی کے لئے عالمی مدد ملنے کی امید ہونا چاہئے تھی لیکن ہوا کیا؟ بنگلہ دیش بھی جو کہ ہمارا ایک برادر ملک ہے' ان نقصانات کے عوض مختلف مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کویت پر عراق کے فوجی قبضہ سے پاکستان کو کم از کم سوا ارب ڈالر سالانہ کا نقصان ان ترسیلات کے ختم ہونے سے ہوا جو پاکستانیوں کی طرف سے یہاں آیا کرتی تھیں۔ تیل کی قلت اور مہنگائی کی وجہ سے پاکستان کے درآمدی بل میں ایک ارب ڈالر سے زیادہ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس طرح مشرق اوسط کے ان ممالک میں اب برآمد ختم ہونے سے تقریباً سوا ارب ڈالر سالانہ کا نقصان ہوا ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر خلیج کے بحران سے پاکستان کو تقریباً 4 ارب ڈالر کا سالانہ نقصان ہوا ہے۔ یہ سارا نقصان خلیج کی صورتحال کی وجہ سے ہے جس میں پاکستان کا اپنا کوئی قصور نہیں۔ دوسری طرف پاکستان مغربی ملکوں اور امریکہ کی پالیسیوں کے تحت اس خطے میں اپنی حکمت عملی کو ان کے ساتھ ہم آہنگ کر رہا ہے حتیٰ کہ پاکستان نے اپنی افواج بھی ان کے سپرد کر دیں اور اس کے عوض پاکستان کو مزید تو کیا حاصل ہونا تھا۔ ان 4 ارب ڈالر سالانہ کے نقصانات کی تلافی کا بھی کوئی سامان نہیں کیا گیا۔ گویا ہم ایک بار پھر علاقائی بحران سے فائدہ اٹھانے کے بجائے نقصان کا سودا کر رہے ہیں۔ اگر پاکستان میں منتخب جمہوری حکومت ہوتی تو یہ صورتحال نہیں ہو سکتی تھی۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت خلیج کی صورتحال میں پاکستان کے ہونے والے نقصانات پورے کرنے کے لئے عالمی ہمدردیاں حاصل کرنے کی اہل تھی کیونکہ یہ ایک مقبول اور منتخب

www.bhutto.org

حکومت تھی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کا ایک وقار تھا۔ وہ ایک عالمی شخصیت کے طور پر ساری دنیا میں پہچانی جاتی تھیں اور اگر وہ پاکستان کے کیس کے لئے یورپ یا امریکہ گئی ہوتیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ نہ صرف پاکستان کے ہونے والے نقصان کی تلافی کر لاتیں بلکہ وہ پاکستان کے لئے مزید بہت کچھ حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہوتیں۔ لیکن غیر منتخب حکومت ہونے کی وجہ سے پاکستان کے عوام ایک بار پھر اس سنہری موقع سے محروم رہ گئے۔

بظاہر تو ان کی حکومت کی برطرفی کا جواز بد عنوانیوں میں تلاش کیا گیا لیکن آج دو ماہ گزر جانے کے باوجود یہ الزامات کہیں بھی ثابت نہیں کئے جا سکے بلکہ حکومت خود اپنے جال میں پھنس گئی اور آج ساری دنیا میں اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ یہ نا اہلی ہے یا بدنیتی اس پر میں بحث نہیں کرونگا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ منتخب عوامی حکومت ختم کرنے کے نتیجے میں پاکستان نہ صرف داخلی طور پر ایک بڑی تشویش ناک صورتحال سے دوچار ہو گیا ہے بلکہ عالمی طور پر بھی اس کا وقار خاک میں مل چکا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ بات اتنی سادہ تھی۔ بظاہر صدر غلام اسحاق خان نے اپنی تقریر میں حکومت کی برطرفی کے لئے دلائل دیئے وہ اب غلط ثابت ہو چکے ہیں لیکن اصل دلائل یہ نہیں تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کی برطرفی کا اصل سبب عالمی اور علاقائی حالات ہیں ایک بات تو زبان زدِ عام ہے کہ کویت پر عراقی قبضہ کے ساتھ ہی ان کی منتخب حکومت ختم کی گئی۔ پاکستان میں اس کا فوری ردِ عمل یہ تھا کہ پیپلز پارٹی کے مخالفوں نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھا کر جمہوری حکومت ختم کی ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے۔ خلیج کے حالات کا تعلق حکومت کے خاتمہ کے ساتھ یقیناً ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ فیصلہ کرنے والے صرف اندرونی عناصر نہیں تھے بلکہ اس میں بہت سے بیرونی عوامل بھی کارفرما تھے اور جن قوتوں نے اس اقدام کی درپردہ حمایت کی ہے ان کے مقاصد اب سامنے آتے جا رہے ہیں۔ پاکستان دوسری مرتبہ اپنے عظیم دوست امریکہ کی عالمی حکمت عملی میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے لیکن اس مرتبہ بھی پاکستان کو اس کردار کے بدلے میں جو کچھ حاصل ہو رہا ہے وہ صرف ایک نگران حکومت کو ملنے والا سہارا ہے اور یہ سہارا بھی اس قدر ناقدری اور توہین آمیز طریقے سے دیا جا رہا ہے کہ اگر کوئی عزتِ نفس کا احترام کرنے والا شخص اس حکومت کی سربراہی کر رہا ہوتا تو عالمی طور پر اس توہین آمیز رویہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس حکومت سے ہی دستبردار ہو جاتا۔ جمہوری حکومت کو ختم کرنے کی دوسری وجہ میرے نزدیک کشمیر کا مسئلہ ہے۔ امریکی انتظامیہ میں موجودہ بھارتی حکومت کا اثر و رسوخ ماضی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ وزیر اعظم وی پی سنگھ بھارت میں امریکہ دوست لابی سے تعلق رکھنے والے سیاستدان ہیں اور عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس منصب تک پہنچنے میں انہیں مغربی دوستوں کی طرف سے کافی مدد اور تعاون حاصل رہا ہے۔ اس اعتبار سے آج کی بھارتی حکومت امریکہ کی ایک حلیف حکومت ہے اور اس حکومت کو قائم رکھنے استحکام دینے اور اس سے علاقائی اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے مدد لینے میں امریکہ کی دلچسپیاں عیاں ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے دورِ حکومت میں کشمیر میں امریکہ کی یہ دوست حکومت کشمیر میں بہت زیادہ مسائل سے

www.bhutto.org

دوچار ہو گئی تھی اور جس کامیابی کے ساتھ محترمہ بے نظیر بھٹو کی منتخب حکومت نے عالمی رائے عامہ کی نظر میں کشمیریوں کے کاز کے لئے ہمدردیاں حاصل کی تھیں اس سے صاف نظر آنے لگا تھا کہ بھارت مشکلات سے دوچار ہوتا جائے گا یہ بھی حقیقت ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو نے اپنی کشمیر پالیسی انتہائی ذہانت' مہارت اور حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ چلائی۔ ایک طرف انہوں نے کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کی بھرپور حمایت جاری رکھی اور دوسری طرف انہوں نے عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے شاندار تحریک چلائی اور تیسری طرف انہوں نے اس مسئلہ پر اسلامی برداری کو منظم کیا مگر ساتھ ہی ساتھ بھارت کو اس بات کا کوئی موقع نہیں دیا کہ وہ پاکستان پر مداخلت کا الزام لگاتا۔ اسے فوجی یا کسی اور قسم کے دباؤ میں لا سکتا۔ بینظیر بھٹو نے بھارت کو اس قسم کا کوئی بہانہ فراہم نہیں کیا۔ یہ بات بھارت کے لئے بہت پریشان کن تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی منتخب عوامی حکومت کی برطرفی میں بھارت کی ان مشکلات کا بھی بہت دخل ہے اور یہ شاید غلط نہ ہو کہ بھارت کے وہ مغربی دوست جو اس خطہ میں علاقائی کردار کے لئے بھارت سے بہت امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہیں' وہ چاہتے تھے کہ اس حکومت کو ان مشکلات سے نکالا جائے جو محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت نے دی پی سنگھ کے لئے پیدا کی ہوئی تھیں۔ اگر میرا یہ اندازہ درست ہے تو میں ایک اور بات بھی کرنا چاہوں گا کہ ہو سکتا ہے کہ کشمیر کے سلسلے میں مغربی ملکوں اور بھارت نے مل کر جو منصوبہ تیار کر رکھا ہے اس پر عمل درآمد کے لئے پاکستان کی منتخب حکومت کو راستے سے ہٹانا ضروری سمجھا گیا۔ اس منصوبے کے سلسلے میں جو شواہد ملتے ہیں۔ وہ پاکستان کے نقطہ نظر سے حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کی برطرفی سے کچھ عرصہ پیشتر جنوبی ایشیائی امور کا ایک امریکی ماہر ہندوستان اور پاکستان آیا تھا۔ اس نے اسلام آباد اور دہلی میں یہ تجویز کئی حلقوں میں غور کے لئے پیش کی کہ کشمیر کو غیر فوجی علاقہ قرار دے کر 10 سال کے لئے پاکستان اور بھارت کی مشترکہ نگرانی میں دیدیا جائے اور یہ دونوں ملک 10 سال تک اس مسئلہ کو منجمد کر دیں اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ امریکی پالیسی سازوں کی سوچ میں یہ بات آچکی ہے تو پھر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آنے والے چند ماہ کے دوران بھارت کے ساتھ مذاکرات شروع ہونے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے فیصلے جب کسی نمائندہ اور منتخب حکومت کے زمانے میں کئے جائیں تو سودے بازی سخت انداز میں کی جاتی ہے کوئی منتخب حکومت اپنے لوگوں کے مفادات کو نظرانداز نہیں کر سکتی لیکن آج ایک کمزور اور غیر منتخب حکومت مذاکرات کی میز پر جاتی ہے تو اس سے مراعات حاصل کرنا آسان ہوتا ہے یہ بات ہم تاشقند میں دیکھ چکے ہیں پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی جناب شہید ذوالفقار علی بھٹو کو شکایت ہی یہ تھی کہ جو کچھ پاکستانی افواج اور عوام نے میدان جنگ میں حاصل کیا ہے ایک آمر نے مذاکرات کی میز پر اسے ہار دیا ہے اگر کشمیر کے حالات اس حد تک آچکے ہیں کہ بھارت مذاکرات پر مجبور ہو رہا ہے تو اس کا سہرا محترمہ بے نظیر بھٹو کے سر ہے' یہ ان ہی کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ بھارت ابھی تک کشمیر میں اپنی فوجی کارروائیوں کا جواز عالمی رائے عامہ کے سامنے پیش کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ حالانکہ گذشتہ 8 ہفتوں کے دوران ہماری نگران

www.bhutto.org

حکومتوں نے کشمیریوں کے مسئلہ کو پس پشت ڈال رکھا ہے' اس کے باوجود منتخب عوامی حکومت جو کام کر گئی تھی اس کے اثرات سے بھارت کو نجات نہیں مل رہی۔ اس سلسلے میں اگر کشمیر کے مسئلے پر پاکستان کی کسی غیر منتخب حکومت نے کسی قسم کا کوئی معاہدہ کیا یا مذاکرات کئے تو اسے نہ پاکستان کے عوام کی تائید حاصل ہوگی اور نہ یہ دیرپا ہوگا اور نہ ہی کشمیر کے عوام اسے قبول کریں گے۔ اس انتظامیہ میں جو نقصان مجھے نظر آرہا ہے وہ آزاد کشمیر کے ساتھ ہونے والی ممکنہ ناانصافی ہے کیونکہ فوجوں کی موجودگی کا مسئلہ صرف مقبوضہ کشمیر میں ہے۔ اگر عوام اور قابض افواج کے درمیان کوئی تنازعہ ہے تو وہ مقبوضہ کشمیر میں ہے۔ اگر انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے تو وہ مقبوضہ کشمیر میں ہو رہی ہے۔ اگر کوئی انتظامیہ امن وامان قائم رکھنے میں ناکام ہوئی ہے تو وہ بھی مقبوضہ کشمیر میں ہے۔ آزاد کشمیر میں ایسی کوئی صورتحال موجود نہیں ہے اور میں اسے محترمہ بے نظیر بھٹو کی فراست اور بصیرت کا نتیجہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے عین اس وقت آزاد کشمیر میں عام انتخابات منعقد کرائے جبکہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی حکومت عوام کو سنگینوں سے کچل رہی تھی۔ آپ کو محترمہ بے نظیر بھٹو کا وہ چیلنج یاد ہوگا کہ آزاد کشمیر کی انتخابی مہم سے قبل انہوں نے آزاد کشمیر جاکر ایک عظیم الشان جلسہء عام سے خطاب کیا اور بھارتی وزیراعظم کو چیلنج دیا کہ وہ بھی مقبوضہ کشمیر میں کسی جلسہ سے خطاب کر کے دکھائیں۔ یہ تھا وہ واضح فرق جو محترمہ بے نظیر بھٹو نے عالمی رائے عامہ کے سامنے نمایاں کر کے دکھادیا اور اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے کسی بھی قسم کی عالمی تجویز کا سامنا کرنے کیلئے یہ تضاد نمایاں کیا تھا اور ہو سکتا ہے کہ آزاد کشمیر کے انتخابات بھی انہوں نے اسی نقطہء نظر سے کرائے ہوں تاکہ دنیا دیکھ لے کہ پاکستان کے زیر انتظام آزاد کشمیر میں نہ صرف یہ کہ مکمل امن وامان ہے اور یہاں کی انتظامیہ موثر اور باوقار ہے بلکہ حالات اتنے نارمل اور معمول کے مطابق ہیں کہ وہاں عام انتخابات منعقد ہوتے ہیں' اسمبلیاں وجود میں آتی ہیں' اپنا وزیراعظم منتخب کرتی ہیں' اپنا صدر منتخب کرتی ہیں اور اس کے باوجود بھی وہاں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس بھارتی مقبوضہ کشمیر میں انتظامیہ مفلوج ہے۔ کوئی بھی سرکاری محکمہ صحیح طور سے کام نہیں کر رہا ہے۔ بھارتی اتھارٹی کو وہاں چیلنج کر دیا گیا ہے۔ وہاں پر موجود بھارتی افواج کی حیثیت قابض افواج کی ہے' وہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کی جارہی ہیں اور کشمیری عوام نے وہاں انتخابات کا مکمل بائیکاٹ کیا تھا۔ وہاں پر کوئی منتخب اسمبلی موجود نہیں۔ وہاں کے منتخب نمائندے بھارتی پارلیمنٹ میں موجود نہیں ہیں غرضیکہ آئینی' قانونی' سیاسی اور انتظامی ہر لحاظ سے بھارتی حکومت مقبوضہ کشمیر میں ایک قابض اور غاصب حکومت ہے۔ یہ درست ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین کشمیر ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ پاکستان کا موقف عالمی اداروں میں تسلیم شدہ ہے اور ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ کشمیری عوام ہی حل کر سکتے ہیں۔ ہم انہیں یہ حق دینے سے بالکل نہیں گھبراتے کہ وہ ہندوستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں یا پاکستان میں۔ اصل سوال تو کشمیریوں کیلئے وہ حالات پیدا کرنے کا ہے جن میں وہ اپنا حق رائے دہی استعمال کر سکیں۔ ایسے حالات مقبوضہ کشمیر میں نہیں ہیں۔ آزاد کشمیر میں یہ حالات آج

www.bhutto.org

بھی موجود ہیں۔ استصواب رائے کیلئے آزاد کشمیر میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ وہاں ہونے والے آزادانہ عام انتخابات اس امر کا ثبوت ہیں کہ کسی بھی قسم کی رائے شماری کیلئے وہاں کی انتظامیہ مؤثر اور کارگر ہے جبکہ مقبوضہ کشمیر کیلئے یہ بات نہیں کہی جا سکتی تو اگر حالات درست کرنے کی ضرورت ہے اگر DEMILITARISATION کرنے کی ضرورت ہے اور اگر رائے شماری کیلئے فضاء ساز گار بنانے کی ضرورت ہے تو وہ مقبوضہ کشمیر میں ہے۔ جب آپ ایک فساد زدہ خطہ کو ایک پر امن خطہ سے ملا کر دونوں سے یکساں سلوک کرنے کی بات کرتے ہیں تو آپ صریحاً ناانصافی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اگر کشمیر میں کوئی ایسی تجویز سامنے آرہی ہے جس کے تحت ہندوستان اور پاکستان کو اپنی افواج کشمیر سے واپس بلانی پڑیں تو یہ نا انصافی پر مبنی تجویز ہوگی۔ پاکستان کشمیریوں کے حق خود ارادیت سے انکار نہیں کرتا۔ پاکستان کے زیر انتظام کشمیر میں منتخب حکومت موجود ہے جو مؤثر ہے اور جو عوام کے اعتماد کی حامل ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں نہ تو وہاں کے عوام کی منتخب حکومت موجود ہے اور نہ وہاں بھارتی انتظامیہ کسی قسم کا اثر و رسوخ رکھتی ہے' نہ وہاں کے عوام' انتظامیہ کے کنٹرول میں ہیں۔ فی الواقع وہاں کوئی انتظامیہ موجود ہی نہیں ہے۔ بھارت انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزیاں کرتے ہوئے وہاں پر فوجی قبضہ جمائے ہوئے ہے۔

میں یہ بات مان سکتا ہوں کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں استصواب رائے کے حالات پیدا کرنے کیلئے شاید دس سال کی ضرورت ہو یقیناً وہاں بھارتی افواج کی موجودگی میں رائے شماری کی صورتحال پیدا نہیں ہو سکتی۔ وہ ماحول پیدا نہیں ہو سکتا جس میں کشمیری عوام آزادی سے اپنا حق رائے دہی استعمال کر سکیں۔ وہاں پر یقیناً فوج کو ہٹا کر ہی حالات کو بہتر بنانا پڑے گا اور اس کیلئے دس سال کا عرصہ لازماً درکار ہوگا کیونکہ بھارت نے وہاں چالیس سالوں کے دوران وہاں اتنے مسائل پیدا کر دیئے ہیں' وہاں اتنی ساری لاقانونیت پیدا کر دی ہے اور انتظامیہ اور عوام کے درمیان اتنے فاصلے پیدا کر دیئے ہیں کہ وہاں پر معمول کی زندگی بحال کرنے کیلئے ایک طویل عرصہ درکار ہوگا اور یہ حالات اس وقت معمول پر آسکیں گے جب وہاں سے بھارتی افواج نکل جائیں۔ یہ عرصہ 5 سال کا ہو سکتا ہے' 10 سال کا بھی ہو سکتا ہے اور 3 سال کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس پر غور کیا جا سکتا ہے لیکن آزاد کشمیر میں تو یہ سوال موجود ہی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر دونوں پر ایک سی شرط عائد کرنا بہت بڑی ناانصافی ہوگی لیکن یہ فرق ایک منتخب اور نمائندہ حکومت ہی محسوس کر سکتی ہے۔ مجھے ڈر یہ ہے کہ پاکستان کی غیر منتخب نگران حکومت یا پھر انتخابات سے گریز کر کے قائم کی گئی کوئی اور نمائندہ حکومت مذاکرات کی میز پر جا کر کشمیری عوام کی قسمت کا سودا نہ کر لے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس عالمی سازش کا شکار ہو کر کوئی ناعاقبت اندیش آزاد کشمیر سے پاکستانی فوجوں کو نکالنے کا فیصلہ نہ کر بیٹھے۔ اس طرح ہم ایک بھی گولی چلائے بغیر پورا کشمیر بھارت کے حوالے کر دیں گے۔ کہنے کو تو یہ ایک غیر فوجی علاقہ ہوگا' ہو سکتا ہے اس کے بندوبست میں کچھ عالمی ادارے بھی شامل ہوں لیکن تاریخی حقائق کیا ہیں؟ نیپال ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے۔ سری لنکا اور بھوٹان بھی آزاد اور خود مختار ملک ہیں لیکن اس آزادی اور خود مختاری کے باوجود انہیں بھارتی ہمسائیگی کی کیا

www.bhutto.org

قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بڑے اور طاقتور ملک کی ہمسائیگی میں کسی چھوٹے ملک کو اس کے اثر و رسوخ کی لپیٹ میں آ جانے کے خطرے سے دوچار رہنا پڑتا ہے اور غیر فوجی یا DEMICIARISE کشمیر کا تصور تو بالکل مختلف چیز ہے۔ میں اس کا تجزیہ یوں کرتا ہوں کہ اگر کشمیر سے بھارتی اور پاکستانی افواج نکل جائیں اور بغیر کسی فیصلہ کے پوری ریاست جموں و کشمیر خواہ کچھ عرصے کیلئے خواہ ہمیشہ کیلئے 'بھارت اور پاکستان دونوں سے علیحدہ کوئی انتظامی ڈھانچہ مرتب کر کے (خواہ وہ کسی بھی انتظام کے تحت مرتب کردہ ڈھانچہ ہو) ایک مرتبہ علیحدہ جغرافیائی تشخص میں سامنے آ گئی تو یہ نہ تو کوئی آزاد ریاست ہو گی اور نہ ہی اسے کوئی بھارتی تسلط سے نجات دلا سکے گا۔ دس برس تک تو معاہدے کے تحت ہی اسے ایک علیحدہ انتظامی جغرافیائی اکائی ہی کی حیثیت میں رہنا پڑے گا۔ ان دس برسوں کے دوران بھارت جو کام گزشتہ چالیس برس کے دوران نہ کر سکا' بہت آرام سے کر لے گا۔ بھارت اپنے وسائل' فوجی طاقت' اور سائز کی وجہ سے اس خطے کو اپنے اقتصادی شکنجہ میں جکڑے گا اور اس دوران وہ فریب کاری سے کام لیتے ہوئے ایک آزاد اور خود مختار کشمیر کے تصور کو عوام میں مقبول کرانے کی کوشش کرے گا۔ اس کام کے لئے پہلے ہی بہت سی تنظیمیں معرض وجود میں آ چکی ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ آج خود مختار کشمیر کی جن دعویدار تنظیموں کے خلاف بھارت کارروائیاں کرنے کا دعویٰ کرتا ہے' درحقیقت وہ انہی کو مزید مؤثر اور مستحکم کر رہا ہو۔ اس صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے اگر پاکستان DEMICIARISE کشمیر کے تصور کو تسلیم کر لیتا ہے تو میرے نزدیک اس کے نتائج مندرجہ ذیل صورتوں میں برآمد ہو سکتے ہیں۔

1 - یہ DEMILATARSE کشمیر سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے بیرونی مدد کا محتاج ہو گا۔ بھارت کے لئے بہت آسان ہے کہ وہ اس خطے میں خصوصی طور پر اقتصادی امداد پہنچانا شروع کر دے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کشمیری عوام میں ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے تصور کو فروغ دینے کی کوشش کرے اور اگر آزاد اور خود مختار ریاست کا تصور مقبول ہو گیا' جیسا کہ امکانات سے ظاہر ہے' تو پھر جو کام وہ فوجی حملوں سے نہ کر سکا فوجی قوت سے نہ کر سکا اور 40 سال کے جبر و تشدد سے نہ کر سکا وہ بات چیت کے ذریعے کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

2 - بھارت گزشتہ 40 سال کے دوران اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد سے بچنے کے لئے ہمیشہ یہ دلیل دیتا رہا ہے کہ وقت بہت گزر چکا ہے۔ حالات بہت بدل چکے ہیں' قراردادیں بہت پرانی ہو چکی ہیں اب ان پر عمل درآمد کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ آج اگر وہ بات چیت پر مجبور ہو گا تو کشمیریوں کی بے پناہ قربانیوں' ان کی جدوجہد آزادی کے نتیجے میں اپنی مشکلات کی وجہ سے آمادہ ہو گا۔ لیکن اس بار بھی وہ وہی حربہ استعمال کرنے کو کوشش کرے گا جو ماضی میں کرتا رہا ہے یعنی 1948ء میں وہ جنگ بندی اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کی صورت میں جنگ کی صورتحال سے نکلا اور پھر اس نے مختلف حربوں سے وقت گزارنے کی کوشش کی اور جب 8 یا 10 برس گزارنے میں کامیاب ہو گیا تو کہا کہ وقت گزر گیا اور قراردادوں پر عمل درآمد کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح DEMILATARSE کشمیر کے دس سال بھی اسی

www.bhutto.org

کام میں استعمال کئے جائیں گے۔ بھارت نے اپنی فوجی کارروائیوں 'جبر و تشدد' لوٹ کھسوٹ' کشمیری عوام کی توہین کی وجہ سے اپنے لئے وہاں جو نفرت پیدا کر لی ہے اس سے نجات کی اب اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بھارت اب کشمیر سے نکلنے پر مجبور ہو رہا ہے۔ بھارت کے بس میں نہیں ہے کہ وہ طویل عرصہ تک فوجی قوت کے ذریعہ کشمیر پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکے۔ بھارت کی معیشت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ بھارت کے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کے اندرونی' نسلی' طبقاتی' ذات برادری اور علاقائی تضادات اسے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ بھارت کی معیشت میں اتنا دم ہی نہیں کہ وہ فوجی کارروائی کی متحمل ہو سکے۔ اگر 2 یا 3 سال تک بھارت کو کشمیر میں اپنا قبضہ برقرار رکھنا پڑا تو نہ صرف یہ کہ بھارت کشمیر سے ذلیل و رسوا ہو کر نکلنے پر مجبور ہو جائے گا بلکہ اس دوران وہ خود بھی اتنے بڑے اقتصادی اور سیاسی مسائل سے دوچار ہو چکا ہو گا کہ اسے کشمیر ہی نہیں بلکہ اسے اور بہت سے علاقوں سے اپنا تسلط ختم کرنا ہو گا۔ بھارتی حکمران یہ بات جان چکے ہیں۔ چنانچہ وہ کشمیر سے آبرومندانہ پسپائی کا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ اگر پاکستان میں منتخب حکومت موجود ہو تو بھارتی حکمرانوں کو ایسے آبرومندانہ راستے تلاش کرنے میں مدد دے سکتی ہے لیکن بھارت اس سے پہلے ایک اور کوشش کرنا چاہتا ہے اور وہ یہ کہ وہ کشمیر سے اپنی فوجیں بھی واپس بلا لے اور کشمیر پر اس کا قبضہ بھی ہو جائے اور اس مرتبہ اس کا قبضہ صرف مقبوضہ کشمیر پر نہ ہو بلکہ آزاد کشمیر بھی اسی کے زیر تسلط آ جائے۔

3۔ بھارت کا یہ سارا منصوبہ اس تجویز کے اندر موجود ہے۔ کشمیر کو غیر فوجی علاقہ قرار دینے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں اپنی اپنی فوجیں ریاست جموں و کشمیر سے نکال لیں۔ ہندوستان تو اپنی فوجیں نکالنے پر مجبور ہے' پاکستان کیوں نکالے؟ پاکستان اقوام متحدہ کی ہر قرارداد پر عمل کرانے کی پوزیشن میں ہے۔ پاکستان تو 10 برس مانگ ہی نہیں رہا۔ پاکستان تو آج بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ اقوام متحدہ جس دن چاہے وہ پاکستان کے زیر انتظام کشمیری علاقے میں رائے شماری کا اہتمام کر سکتا ہے لیکن ایسا مقبوضہ کشمیر میں نہیں ہو سکتا۔ اگر کہیں سے فوجیں نکالنے کی ضرورت ہے' اگر کہیں پر 10 سال یا 5 سال یا 3 سال حالات کو معمول پر لانے کے لئے درکار ہیں تو ان سارے معاملات کا تعلق مقبوضہ کشمیر سے ہے۔

لیکن یہ سیاسی دنیا عجیب ہوتی ہے۔ بھارت DEMILATARISE کی تجویز کے ذریعے ہاری ہوئی بازی جیتنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہمارے مہربان مغربی دوست یہ بازی بھارت کے حق میں کرنے کیلئے پوری طرح اس کی مدد کر رہے ہیں۔ میں انتباہ کرتا ہوں کہ اگر پاکستان نے یہ فارمولا تسلیم کر لیا تو یہ نہ کشمیر کے بدنصیب عوام کے ساتھ بدترین غداری ہو گی۔ پاکستان کے عوام کے ساتھ غداری ہو گی یہ پورے عالم اسلام کے سینے میں خنجر گھونپنے کے مترادف ہو گا۔ کشمیر کا مطلب ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کے مترادف ہو گا۔ اس بات کا کوئی جواز موجود ہی نہیں ہے مگر میں ڈر رہا ہوں کہ پاکستان کی کمزور' غیر منتخب اور غیر مقبول حکومت اس قسم کا کوئی غدارانہ معاہدہ نہ کر بیٹھے لہٰذا

www.bhutto.org

ہمیں اس مسئلے پر توجہ دینی ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت برطرف کرتے وقت یہ چیز پیش نظر رکھی گئی ہوگی اور اگر یہ بات درست ہے تو ہمیں اور زیادہ جوش و خروش اور زیادہ منظم انداز میں جذبۂ اتحاد کے ساتھ محترمہ بے نظیر بھٹو کا ساتھ دینا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کو اقتدار سے دور ہی اس لئے کیا گیا ہو کہ پاکستان کو کشمیر سے محروم کر دیا جائے!

اب "CORRUPTION" کے بنیادی الزام کی طرف آتے ہیں جسے بنیاد بنا کر منتخب حکومت کا خاتمہ کیا گیا۔ میں نے گزشتہ صفحات میں جو بے نظیر بھٹو کے اقتدار میں لکھے گئے تھے 'ایک جگہ لکھا ہے کہ "بے نظیر نے کیا کرپشن کی؟ بے نظیر نے یہ کرپشن کی اس نے صنعتی قرضے' غریب لوگوں کو دینا شروع کر دیئے۔ اس نے ترقیاتی کام ان افراد کے ذریعے شروع کرا دیئے جو لوٹ مار کی اصل کلب کے رکن نہیں تھے۔ یہی چیز ان لوگوں کو گوارہ نہیں تھی۔ دولت جو ان کے ہاتھوں میں سمٹ چکی ہے کسی بھی طریقہ سے وہ پھیلے یا عوام تک جائے۔ انہیں یہ بات پسند نہیں ہے کیونکہ بے نظیر بھٹو نے سرمایہ کو اس کلب سے باہر نکال کر عوام میں پھیلانے کی کوشش کی۔ بے نظیر بھٹو نے پیپلز ورکس پروگرام کے منصوبے پیپلز پارٹی کے عام کارکنوں کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا راستہ اختیار کیا۔ بے نظیر نے قرضے ایسے لوگوں کو دینا شروع کئے جو نہ کسی کو رشوت دے سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے پاس گارنٹیاں دینے کیلئے پہلے سے لوٹی ہوئی جائدادیں موجود ہیں۔ چونکہ بے نظیر بھٹو نے ان کے مقابلے میں صنعت و تجارت میں کچھ نئے لوگوں کو کھڑا کرنے کی کوشش کی لہٰذا ان کی حکومت "کرپٹ" ہے۔ ان کی حکومت بدعنوان ہے لیکن بے نظیر نے یہ کام اپنی ذات یا اپنی پارٹی کے لئے نہیں کیا بلکہ انہوں نے ایک بہت بڑے بحران کو سامنے رکھتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اگر ارتکاز دولت کا یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ پرامن انداز میں دستور اور قوانین کے اندر رہتے ہوئے اصولوں' اصولوں اور ضابطوں کا احترام کرتے ہوئے' رائج الوقت نظام کو خراب کئے بغیر دولت کو عام لوگوں تک پھیلانے کی پالیسی اختیار کی۔ ان کو تباہ اندیشوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ بے نظیر کی ان پالیسیوں کی وجہ سے ہی ان کے خلاف عوام کا بڑھتا ہوا غصہ کسی قدر کم ہو گا اور ان کے غیض و غضب کا شکار ہونے سے اور کچھ دیر بچ جائیں گے۔

یہ الفاظ میں نے اس وقت لکھے تھے جب محترمہ بے نظیر بھٹو اقتدار میں تھیں لیکن آج ان کے اقتدار کو ختم ہوئے 2 ماہ گزر چکے ہیں۔ میں نے دوبارہ مسودہ پڑھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں واقعی حقیقت بیانی کر رہا تھا۔ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔ پوری نگران حکومت نے دن رات ایک کر کے ان کے خلاف لگائے گئے بے شمار الزامات ثابت کرنے کے لئے بے پناہ قومی سرمایہ لٹایا۔ سرکاری ملازموں کا وقت ضائع کیا۔ عدالتوں کا وقت صرف کیا۔ بنکوں میں انتظامیہ کو اس کام پر لگایا۔ پی پی کے ساتھیوں پر ذہنی' نفسیاتی' اور اخلاقی دباؤ استعمال کر کے ہر ممکنہ طریقہ سے الزامات ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حاصل کیا ہوا؟ بدعنوانی کا ایک بھی الزام ثابت نہیں کیا جا سکا۔ گزشتہ صفحات میں' میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو اقتدار خلوصِ نیت سے منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ بات بھی اب ایک حقیقت کی

www.bhutto.org

صورت میں عوام کے سامنے آچکی ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف زرداری روزِ اوّل سے ہی عوام دشمنوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ میں اسے کوئی اتفاقیہ واقعہ نہیں سمجھتا۔ انہوں نے تو بے نظیر کو عوامی دباؤ کے تحت اقتدار دینا قبول کر لیا لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایوانِ اقتدار میں اپنے قدم جما سکیں۔ خود محترمہ بے نظیر بھٹو طویل جدوجہد کے بعد برسرِ اقتدار آئی تھیں۔ ان کے اپنے ہی کھاتے میں نظر بندیوں' جیل کی قید اور جبر تشدد کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان پر کوئی الزام عائد کرنا مشکل تھا۔ تمام دشمن یہ بھی جانتے تھے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو عوام میں اس قدر مقبول اور عوام میں پسندیدہ لیڈر ہیں کہ اگر ان کے خلاف برسرِ اقتدار آتے ہی الزام تراشی شروع کی گئی تو وہ نہ صرف مسترد کر دی جائے گی بلکہ عوام کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوں گے لیکن جناب آصف زرداری ایک آسان ٹارگٹ تھے۔ انہوں نے اپنی کوئی سیاسی حیثیت نہیں بنائی تھی۔ ایک انصاف پسند انسان کی طرح وہ اپنی معزز بیوی کے سیاسی ورثہ پر کوئی حق جتانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک مہذب' معزز' متمدن اور جدید معاشرے کے فرد کی حیثیت میں وہ اپنی لائق' مشہور اور عظیم لیڈر بیوی کیلئے کسی قسم کے سیاسی مسائل پیدا نہ کریں' وہ سیاست سے دُور رہے۔ انہوں نے اپنی عظیم بیگم کو گھریلو زندگی میں مسرور اور مطمئن رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی بیگم ہر قسم کے خارجی دباؤ میں تھیں۔ فوجی آمریت ان کے خلاف تھی' مفادات میں بندھے ہوئے عوام دشمن ان کے خلاف تھے۔ پارٹی کے اندر ان کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں لیکن ان تمام مصائب و مشکلات میں انہوں نے اپنی عظیم بیگم کو جذباتی طور پر سہارا دیئے رکھا۔ وہ خود سیاست میں ملوث نہیں ہوئے اور ان دنوں مجھے ان کے قریب رہنے کا موقع ملا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ ان میں کسی قسم کی سیاسی منصب پسندی کی خواہش نہیں پائی جاتی۔ وہ اپنے اس کردار سے مطمئن تھے وہ چاہتے تھے کہ ان کی عظیم بیگم اپنا سیاسی کردار ادا کریں اور ایک شوہر کی حیثیت میں وہ ان کے غیر سیاسی مددگار بن کر اخلاقی' جذباتی اور گھریلو طور پر سکون پہنچاتے رہیں لیکن عوام دشمنوں کو ان کا اس طرح گوشہ نشین رہنا پسند نہیں آیا چونکہ وہ وزیرِ اعظم کے شوہر تھے۔ انہوں نے کوئی سیاسی حیثیت قبول نہیں کی تھی اور وہ اپنے آپ پر لگائے گئے الزامات کے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے لہٰذا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہیں نشانہ بنا لیا گیا۔ مقصد محترمہ بے نظیر بھٹو کو بدنام کرنا تھا لیکن اس کا ذریعہ جناب آصف علی زرداری کو بنا لیا گیا۔ کہیں گھوڑا گر جاتا تو الزام آصف زرداری پر' کہیں بس کا حادثہ ہو جاتا الزام آصف زرداری پر' کہیں پلاٹ بکتا تو الزام آصف زرداری پر' کوئی منصوبہ تیار ہوتا الزام آصف زرداری پر' محترمہ بے نظیر بھٹو کے دور میں جو فیصلہ کیا گیا' جو قرضہ دیا گیا' جو صنعت لگائی گئی' جو ملازمت دی گئی' جو تبادلہ کیا گیا' جو ٹرانسپورٹ چلی' جو نہر کھلی یا بند ہوئی' جو پُل بنا یا ٹوٹا' جو جہاز لیٹ ہوا' ان سب کی ذمہ داری آصف زرداری پر ہے۔ میں ان الزامات کو دیکھتا ہوں اور ہنسا کرتا ہوں کہ کیا آصف زرداری واقعی اتنے EFFICIENT اور باصلاحیت شخص ہیں کہ پاکستان میں ایک پتہ بھی ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہلتا اگر یہ بات CORRUPTION ہے تو بھی EFFICIENCY کی اعلیٰ مثال ہے۔ امریکہ کا بااختیار ترین صدر بھی نہیں پیش

www.bhutto.org

کر سکتا کیونکہ وہ بھی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کی ذاتی نگرانی نہیں کرتا جتنی نگرانیوں کا اعزاز آصف زرداری کو دیا گیا۔ اگر آصف زرداری واقعی اتنے لائق' اتنے محنتی اور اتنے اچھے منتظم ہیں کہ پاکستان میں ہونے والا ہر کام ان کی مرضی' ان کے حکم اور ان کی نگرانی میں ہوتا ہے تو میرا خیال ہے کہ اتنے لائق و فائق آدمی کو' بدعنوانیوں کے الزامات دے کر ذلیل کرنے کے بجائے سارے امور ان کے سپرد کر دینا چاہئیں۔ ایک شخص جس کے پاس نہ تو کوئی انتظامی اختیار ہے' نہ کوئی قانونی اختیار ہے اور نہ اس کی کوئی قانونی و آئینی حیثیت ہے اس کے باوجود وہ کتنا طاقتور ہے کہ پاکستان کی پوری انتظامیہ کو گرفت میں لے کر بیٹھ گیا۔ یہ کام تو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق بھی نہ کر سکے تھے۔ ان کے گورنر بھی ان کے سامنے اکڑ جایا کرتے تھے۔

آصف زرداری اگر اتنا اچھا منتظم' اتنا اچھا ایڈمنسٹریٹر اور اتنا ذہین انسان ہے کہ بغیر کسی قانونی و آئینی اختیار کے پوری انتظامیہ کو چلا لیتا ہے تو پھر ایسے شخص کی خوشامد کرنا چاہئے کہ وہ ہمارے ملک کی انتظامیہ چلائے لیکن میں آصف زرداری کو جانتا ہوں' وہ لائق ضرور ہیں' پڑھے لکھے ضرور ہیں' انتظامی امور چلانے کی سمجھ بوجھ بھی رکھتے ہیں لیکن وہ اتنے قابل نہیں ہیں کہ ایک جمہوری دور میں آمرانہ اختیارات کا استعمال کر سکیں لیکن ان کی مخالفت کرنے والوں نے ان کو ان سارے اعزازات سے نواز دیا۔ آپ بھی سمجھتے ہوں گے عوام بھی سمجھتے ہیں اور دنیا بھی جانتی ہے کہ آصف زرداری کو ہدف بنانے کا مقصد محترمہ بے نظیر بھٹو کو صرف بدنام کرنا تھا۔ آصف زرداری تو کسی قسم کا سیاسی دعویٰ کرتے ہیں اور نہ کرتے تھے تو پھر ان سے کسی کو کیا تکلیف تھی؟ تکلیف تو محترمہ بے نظیر بھٹو سے تھی کیونکہ انہیں فوری طور پر ہدف نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اس لئے ان کے شوہر کو ہدف بنا لیا گیا۔

اور اب آصف زرداری کی گرفتاری کے بعد یہ ثابت ہو چکا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو جذباتی اور سیاسی طور پر ختم کرنے کی اسکیم پر عملدرآمد شروع کر دیا گیا ہے۔ پاکستان کے مظلوم عوام پر ایک مرتبہ پھر جبر و تشدد کے ذریعے لوٹ مار کا نظام مسلط کرنے کی سعی ہو رہی ہے۔ عوام بھی اپنے حقوق کی جدوجہد تیز کرتے جا رہے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو سے بے نظیر بھٹو تک اس جدوجہد نے بڑا کٹھن اور دشوار گزار سفر طے کیا ہے' یہ سفر جاری ہے۔

بھٹو سے بھٹو تک یہ سفر جاری ہے
بے نظیر کی قیادت میں
آصف زرداری کی رفاقت میں
عوام کی پُرعزم شراکت میں
جدوجہد جاری ہے
سفر جاری ہے۔

www.bhutto.org

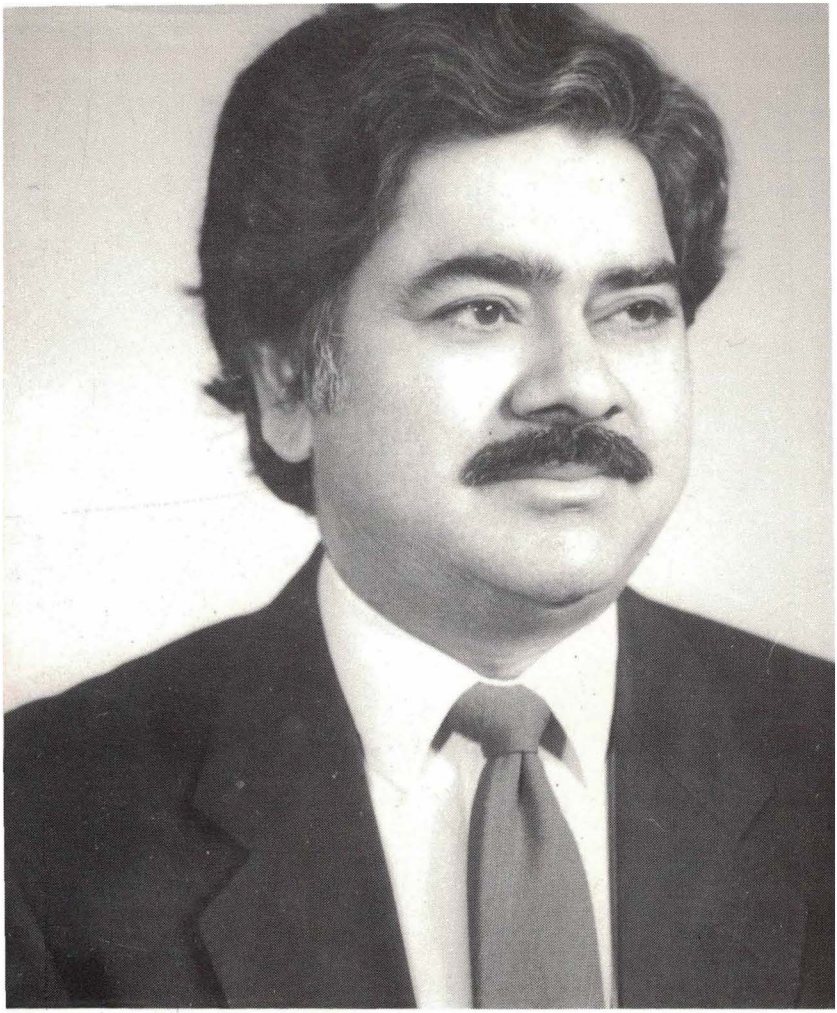

کچھ مصنف کے بارے میں

پیدائش: 7 جولائی 1943ء (الہ آباد۔ یوپی) ساری تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ بی ایس سی، ایم اے، ایل ایل بی، ایڈووکیٹ سپریم کورٹ ہائی کورٹ۔

زمانہ طالب علمی ہی سے سیاست میں۔ اور 62 سے لے کر 85 تک متعدد بار شہر بدری اور قید و بند۔ جنگ، نوائے وقت، امن، عبرت مسلم میں 400 سے زائد کالم شائع ہو چکے ہیں۔ کالموں کا مجموعہ "نوشتۂ دیوار" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ان دنوں پیپلز ڈیموکریٹک الائنس سندھ کے سیکرٹری جنرل پیپلز پارٹی سندھ کے سیکرٹری اطلاعات اور قومی کونسل برائے شہری آزادی کے صدر ہیں۔

www.bhutto.org